۱۶ سولہ سنگار

سُدرشن

پبلشرز

لاجپت رائے اینڈ سنز۔ تاجران کتب

دہلی

سنہ ۱۹۳۸ء

~~قیمت ایک روپیہ چار آنے~~

بار سوئم

دیباچہ

دُنیا ایک کہانی ہے۔ جسے خدا نے کہا ہے، کہانی ایک دُنیا ہے۔ جسے آدمی نے بنایا ہے، اور دُنیا کی کہانی اور کہانی کی دُنیا دونوں رنگین اور شیریں ہیں۔ اور انسان کا دل دونوں کی طرف دوڑتا ہے۔ اور دونوں سے بچھڑتے وقت اُس کی آنکھیں رنج و قلق کے آنسو بہاتی ہیں۔

دُنیا کب بنی اور کب ختم ہو گی؟ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا! کہانی کب شروع ہوئی اور کب اِس کا خاتمہ ہو گا؟ یہ بھی کوئی نہیں بتا سکتا! جب سے دُنیا ہے، تب سے کہانی ہے۔ جب تک دُنیا رہے گی۔ تب تک کہانی رہے گی۔

دُنیا خدا کی کہانی ہے، اس کے کردار شیطان بھی ہیں۔ کہانی آدمی کی دُنیا ہے، اس کی مخلوق دیوتا بھی ہے خدا اپنی کہانی کے کرداروں کو بُرائی بھلائی کی آزادی دیتا ہے اور اُن کرداروں کو دیکھ کر فسانہ نویس کی دُنیا بنتی ہے۔ افسانہ نویس اپنی دُنیا کے بندوں کو قول و فعل کی آزادی دیتا ہے۔ اور اُنہیں دیکھ کر خدا کی دُنیا عبرت کے سبق سیکھتی ہے اور اپنے لئے زندگی کی راہیں تجویز کرتی ہے۔

جب خدا دُنیا بناتا ہے۔ تو اس خواہش سے بناتا ہے۔ کہ اُس کے

بندے محبّت، امن وامان اور پاکیزگی کی شاہراہوں پر چلیں گے۔ اور چار دن کی زندگی میں اپنے دلوں کو، اور دلوں کی تمناؤں کو آوارہ نہ ہونے دیں گے۔ مگر خدا کے بعض بندے اپنے خدا کی خواہش کو بھول جاتے ہیں اور اپنے لئے دُوسرے رستے تلاش کر لیتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود خدا کی خواہش غالب رہتی ہے، اور دُنیا میں نیکی کی روشنی کم نہیں ہوتی +

افسانہ نویس جب کہانی لکھنے بیٹھتا ہے۔ تو وہ بھی اِس ارادے کے ساتھ بیٹھتا ہے، کہ اُس کی کہانی میں اندھیرا نہ ہو گا۔ مگر اُس کے بعض کردار بھی اُس کی مرضی کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ اور اپنے لئے وہ رستہ تجویز کر لیتے ہیں، جو روشنی سے شروع ہو کر اندھیرے میں گم ہو جاتا ہے لیکن گُناہ کی یورش کے باوجود افسانہ نویس کا اِرادہ غالب آتا ہے۔ اور اُس کی کہانی میں رُوح کی روشنی فتحیاب ہوتی ہے +

دُنیا میں خراب آدمی ہیں، لیکن دُنیا کا مقصد خرابی نہیں۔ اِسی طرح کہانی کے بعض کردار بد ہو سکتے ہیں۔ لیکن کہانی کا مقصد بدی کو خوبصورت اور دلآویز بنانا نہیں۔ بعض آدمی ارادہ کے کمزور ہیں۔ دُنیا کی بدعنوانیاں دیکھ کر دُنیا سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ اور جنگلوں اور بیابانوں میں جا کر سمجھتے ہیں۔ کہ ہم نے دُنیا کو ترک کر دیا۔ لیکن یہ اُن کا وہم ہے۔ اُن کا جسم، اُن کی ذات، اُن کی رُوح بھی اِس دُنیا کا ایک حصّہ ہے۔ اِس اپنے جسم، اپنی ذات، اپنی رُوح کو کون چھوڑ سکتا ہے۔ بعض آدمی جو مزاج کے خشک ہیں، کہانی کا اندھیرا دیکھ کر کہانی سے بیزار ہو جاتے

ہیں۔ اور کہانیوں کی کتابیں پڑھنا بند کر کے سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے کہانی کو اپنی زندگی سے خارج کر دیا۔ لیکن یہ ان کی کم نگاہی ہے۔ اُن کی اپنی زندگی اور اس زندگی کا ایک ایک واقعہ بجائے خود ایک کہانی ہے۔ آدمی جب تک زندہ ہے۔ تب تک اپنی زندگی سے الگ کیونکر ہو سکتا ہے؟

جب آدمی بچّہ ہوتا ہے، تو بڑوں سے کہانی سُنتا ہے۔ جب بُڈّھا ہوتا ہے تو چھوٹوں کو کہانی سُناتا ہے۔ جب مر جاتا ہے، تو خود کہانی بن جاتا ہے۔

یہ دُنیا بھی کہانی ہے! افسانہ نویس بھی کہانی ہے!! خدا بھی کہانی ہے!!!

مذہب نے کہا "خدا نے افسانہ نویس کو بنایا ہے۔ اگر خدا نہ ہوتا تو افسانہ نویس بھی نہ ہوتا۔" یہ سُن کر افسانہ نویس نے خود پرستی کے عالم میں غرور کی گردن بلند کی، اور کہا "تم کہتے ہو، خدا نے مجھے بنایا ہے۔ مَیں کہتا ہوں، میں نے خدا کو بنایا ہے۔ اگر مَیں نہ ہوتا، تو خدا بھی نہ ہوتا۔

یہ بھی ایک کہانی ہے!

بھوانی پور۔ کلکتہ
۳۰۔ جنوری ۱۹۳۶ء

سُدرشن

یہ دُنیا ایک کہانی ہے!

پرمیشور دُکھ سُکھ چُنتا ہے

دُنیا کی کہانی بُنتا ہے

نر سُنتا ہے سر دُھنتا ہے

ایسی اِس میں دلچسپی ہے، ایسی رنگین بیانی ہے

یہ دُنیا ایک کہانی ہے!

سولہ سنگار کی کہانیاں

۱۶ سولہ سنگار

شاعر کا انتخاب

چاند اور سُورج کے محبُوب مہاراجہ نے اپنے تو عُمر وزیر سے کہا۔ ہمیں دربار کے لئے ایک ایسے شاعر کی ضرورت ہے۔ جو حقیقی معنوں میں شاعر ہو ٭

دُوسرے دن تو عُمر وزیر نے شہر میں منادی کرادی۔ اور تیسرے دن ایک ہزار ایک آدمی وزیر کے محل کے نیچے کھڑے تھے۔ اور کہتے تھے ہم سب شاعر ہیں۔ وزیر نے اکیس دنوں میں اُن سب کی نظمیں سُنیں، اور دیکھا کہ وہ سب کی سب رنگین الفاظ، اور حسین خیالات سے آراستہ تھیں، اور اُن سب میں مصری کی مٹھاس، اور مقناطیس کی کشش تھی۔ اور پُرکیف استعارے تھے، اور دل کو موہ لینے والی

تشبیہیں تھیں ٭

مگر اُن میں سب سے اچھا کون ہے؟ تو عُمر وزیر اس کا فیصلہ نہ کر سکا۔ اُس نے ایک دن غور کیا، دو دن غور کیا، تین دن غور کیا۔ چوتھے دن اُس نے سُنہری روشنائی سے گُل رنگ کاغذ پر ایک ہزار ایک شاعروں کے نام لکھے۔ اور یہ فہرست مہاراج کی خدمت میں پیش کر دی ٭

مہاراج کو حیرت ہوئی "کیا یہ سب شاعر ہیں؟"

تو عُمر وزیر نے ادب سے سر جُھکایا، اور آہستہ سے جواب دیا "میں نے اُن کا کلام سُنا ہے، اور اس کے بعد یہ فہرست مرتّب کی ہے۔ ہمیں ایک شاعر کی ضرورت ہے، اور یہ ایک ہزار ایک شاعر ہیں۔ میں انتخاب نہیں کر سکا ٭

مہاراج نے ایک گھنٹہ غور کیا؟ دو گھنٹے غور کیا۔ تین گھنٹے غور کیا۔ چوتھے گھنٹے حکم دیا "اِن سب کو قید کر دو، اِن سے بدترین قسم کی مشقت لو، اور حکم دے دو۔ کہ آیندہ جو شخص بھی شعر کہے گا، اُسے ہمارے مُلک کا سب سے طاقتور آدمی کوڑے مار مار کر ہلاک کر دے گا" ٭

تو عُمر وزیر نے سب کو قید کر دیا۔ اب ریاست میں ایک بھی شاعر نہ تھا۔ نہ کہیں شعر و شاعری کا ذکر ہوتا تھا۔ ریاست کے لوگ اُن بیگناہوں کی مصیبت کی کہانیاں سُنتے تھے، اور اُن کی حالت پر افسوس کرتے تھے، چھ ماہ بعد مہاراج ایک ہزار ایک شاعروں کے قید خانے میں گئے، اور ان سب کی جامہ تلاشی کا حکم دیا۔ اور ایک ہزار ایک قیدیوں

میں سے ایک سو ایک آدمی ایسے نکلے۔ جنہوں نے قید و بند کی انتہائی سختیوں، اور حکومت کی کڑی نگرانیوں کے باوجود رات کے وقت، جاگ کر نئے چہرہ داروں سے چھُپ چھپ کر شعر کہتے تھے، اور اس امر کی ذرا پرواہ نہ کی تھی۔ کہ اگر مہاراج کو ہمارے اِس جُرم (؟) کی اطّلاع ہو گئی۔ تو اُن کا غُصّہ مشتعل ہو جائیگا۔ اور اِس مُلک کا سب سے طاقتور آدمی ہمیں کوڑے مار مار کر ہلاک کر دے گا ❊

مہاراج نے نَوعُمر وزیر سے کہا۔ تُم نے دیکھا، یہ نو سَو آدمی شاعر نہ تھے۔ عزّ و جاہ کے بھُوکے تھے۔ ان سب کو چھ چھ ماہ کی تنخواہیں دے کر رہا کر دو۔ اور یہ ایک سَو ایک آدمی کسی حد تک شاعر ہیں۔ ان کو ہمارے عشرت محل میں جگہ دو اور اِن کی خدمت کے لئے سلیقہ شعار خدمتگار مقرر کر دو۔ تاکہ انھیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو ❊

نَوعُمر وزیر نے ایسا ہی کیا۔ اب یہ شاعر بہترین لباس پہنتے تھے، پُر ذائقہ اور مقوّی کھانے کھاتے تھے۔ اور دن رات راگ رنگ کے جلسوں میں مصروف رہتے تھے ❊

ریاست کے لوگ اُن کے عیش و طرب کی کہانیاں سُنتے تھے، اور اپنی کم نصیبی پر حسرت کے ٹھنڈے سانس بھرتے تھے ❊

چھ ماہ بعد مہاراج اپنے نَوعُمر وزیر کو ساتھ لے کر ایک سَو ایک شاعروں کے عشرت محل میں گئے۔ اور ان سب کو اپنے حضور میں طلب کر کے بولے "تم نے راحت و آرام اور سرور و انبساط کے اِس

شباب آگیں زمانہ میں کیا کچھ کہا۔ مابدولت سُننا چاہتے ہیں"۔

ایک سو ایک عیش پسندوں میں سے صرف ایک فقیر منش ایسا نکلا۔ جس نے عشرت محل کے رقص وسرود کے جلسوں میں شرکت نہ کی تھی۔ اور اس دَوران میں بھی اپنے خیالات نظم کرتا رہا تھا۔ دُوسرے شراب پیتے تھے اور جھومتے تھے۔ وہ تنہائی میں بیٹھ کر خود ہی اپنے اشعار پڑھتا تھا، اور خود ہی خوش ہوتا تھا۔ جیسے جنگل میں مور خود ہی ناچتا ہے۔ خود ہی اپنا ناچ دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔

چاند اور سُورج کے محبُوب مہاراجہ نے اپنے تُوعمر وزیر سے کہا "یہ ایک سو آدمی بھی شاعر نہ تھے۔ جیلش کے بندے تھے۔ جب یہ قید تھے۔ اُس وقت ان کا دل قید خانہ کی مصیبتوں پر کُڑھتا تھا۔ اُن کی آنکھیں اسیری کی محنتوں اور مشقتّوں پر روتی تھیں۔ اور چونکہ اُس وقت ان کی زندگی میں زندگی کی بہاریں نہ تھیں۔ اس لئے اُن دنوں انھیں اپنی زندگی عزیز نہ تھی۔ لہذا انہوں نے اس وقت شعر کہے۔ اور اُن میں اپنی قسمت کی تاریکی، اور تاریکی کی قسمت کا پُر درد طریقہ سے ماتم کیا۔ لیکن جب دُکھ کے وہ دن بیت گئے، اور جب وُہ سیاہ گھڑیاں ختم ہوگئیں۔ تو اُن کو شعر و شاعری کا خیال بھُول گیا۔ یہ دُکھ کے دنوں کے شاعر ہیں۔ سُکھ کے دنوں کے شاعر نہیں۔ ان کو دھکّے مار مار کر محل سے باہر نکال دو۔

اِس کے بعد مہاراج نے اس فقیر منش، بے پروا آدمی کی طرف اشارا کرکے کہا "یہ حقیقی شاعر ہے جو سُکھ اور دُکھ دونوں کو یکساں سمجھتا ہے۔

یہ زندگی کی چاندنی راتوں میں بھی شعر کہتا ہے۔ یہ موت کے تاریک سایوں میں بھی شعر کہتا ہے۔ شعر کہنا اس کی فطرت ہے۔ یہ اس کے بغیر رہ نہیں سکتا۔ یہ سچّا شاعر ہے۔ یہ ایک ہزار ایک کنکروں میں ہیرا ہے۔ ہم نے اسے آج سے اپنے دربار کا شاعر مقرّر کیا۔ ہم اسے مُنہ مانگی تنخواہ دینگے۔ اِس کا کام صرف یہ ہے۔ کہ ہمیں ہر روز دربار میں آکر صرف ایک شعر سُنا جایا کرے"۔

شاعر نے دربار میں جاکر مہاراج کو ایک دن شعر سُنایا۔ دُوسرے دن شعر سُنایا۔ تیسرے دن شعر سُنایا۔ چوتھے دن استعفےٰ لِکھ کر بھیج دیا۔ کہ مجھ سے یہ پابندی کی شاعری نہیں ہو سکتی۔

تو عُمر وزیر نے کہا "یہ شخص کس قدر بدقسمت ہے!"

مگر مہاراج نے جواب دیا "یہ سچّا شاعر ہے۔ اگر آج تیرا باپ یعنی میرا پہلا وزیر زندہ ہوتا تو اس شخص کے پاؤں پکڑ لیتا۔ یہ شخص دربار میں آئے یا نہ آئے۔ مگر اس کی تنخواہ اس کے گھر باقاعدہ پہنچتی رہے"۔

تو عُمر وزیر مہاراج کی عقل و دانش کا قائل ہو گیا۔

سُورداس

(۱)

سُورداس کون تھا؟ کہاں کا رہنے والا تھا؟ اُس کا اصلی نام کیا تھا؟ یہ کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔ نہ وہ اپنے حالات کسی کو سُناتا تھا۔ اگر کوئی پُوچھتا، تو جواب دیتا۔ بھیّا! پاپی جیو ہوں۔ حسب نسب کیا بتاؤں۔ گنگا میّا کی سرن آگیا ہوں۔ پران نکل جائیں، تو رام کا نام لے کر بہا دینا۔ اِس سے زیادہ وہ اپنے متعلّق کبھی گفتگو نہ کرتا تھا۔ مگر وہ فی الحقیقت ایسا حقیر نہ تھا۔ جیسا اپنے آپ کو ظاہر کرتا تھا۔ اُس کے آنے سے بنارس کی رونق بڑھ گئی۔ اور خاص کر دشا شومیدھ گھاٹ میں تو جان پڑ گئی۔ صُبح سویرے چار بجے اُٹھتا اور طنبورہ لے کر بیٹھ جاتا تھا۔ طنبُورا بجاتا تھا اور ہری بھجن گاتا تھا۔ اُس کی آواز میں ایسی شیرینی، ایسی لوچ، ایسی تاثیر تھی کہ جو سُنتا اپنا آپ بھُول جاتا تھا۔ اُس کے گرد لوگوں کا ہجوم ہو جاتا تھا۔ جب وُہ بے ثباتیِ عالم کے گیت گاتا، اور اُن کی تشریح کرتا تو لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ اسوقت

وہ معمولی اندھا نہ معلوم ہوتا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بلند خیال، پاک سیرت، جہاندیدہ فلاسفر دُنیا کی ناپائیداری پر لیکچر دے رہا ہے، اِس کا ایک ایک لفظ حاضرین کے دلوں میں کُھب جاتا تھا۔ لوگ اُس کی تقریریں کھوئے سے جاتے تھے۔ وہ عطائی نہ تھا۔ پکّا راگی تھا۔ مرد، عورتیں، بچّے سب اُس کے گرویدہ تھے۔ کوئی اسے پیسے دیتا، کوئی پھل، کوئی آٹا، کوئی کپڑا، لیکن وہ زبان سے مانگتا نہ تھا۔ نہ کسی کے روبرو دستِ سوال دراز کرتا تھا۔ بینائی کی دولت سے محروم تھا۔ خودداری کی دولت سے محروم نہ تھا اور کوئی کچھ دے یا نہ دے، اس کا فیصلہ خود لوگوں پر چھوڑ دیتا تھا۔ اور لوگ اُسے اُس کی ضرورت سے بھی کہیں زیادہ دیتے تھے۔ دوپہر ہوتے ہوتے اُس کے سامنے پیسوں کا اور کھانے پینے کی چیزوں کا ڈھیر لگ جاتا تھا۔ جب گھاٹ خالی ہو جاتا اور لوگ چلے جاتے تو وہ اپنے گانے بجانے کی کمائی سمیٹ کر گنتا اور پھر ایسی بلند آواز سے جیسے کوئی کسی کو سُنا رہا ہو۔ کہتا "یہ تو بہت ہے، کیا کرونگا!"

اُسے آج کا خیال تھا، کل کا خیال نہ تھا۔

گنگا گھاٹ کے حریص فقیر۔ اس کے پاس آ کر کہتے، سُورداس! ہم تو بالکل ہی خالی رہ گئے۔ کیا کریں۔ آج تو ہمیں کھانے کو بھی پیسے نہ ملے۔ اب بھوکوں مریں گے۔ کلجگ کا زمانہ ہے۔ جاتریوں کے دل پتھر ہو گئے نہاتے ہیں، چلے جاتے ہیں۔ ہمیں کوئی پُوچھتا ہی نہیں۔

سُورداس اُن کی باتیں سُنتا اور اپنے کھانے کے لئے رکھ کر باقی

سب کچھ ان میں تقسیم کر دیتا تھا۔ ایسے جیسے وہ کوئی لکھ پتی ہو، جیسے اُسے کسی چیز کی پروا نہ ہو۔ اور یہ اُس غریب کا حال تھا، جو خود روٹی کے ایک ٹکڑے کو محتاج تھا۔ جس کے پاس سوائے ایک طنبورہ، ایک لکڑی اور چند بوسیدہ کپڑوں کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ اُس کی ظاہری خستہ حالی دیکھ کر کسی کو شبہ بھی نہ ہو سکتا تھا کہ اُس کا دل بادشاہ ہے۔ باہر کی چار دیواری پر حسرت برستی تھی، اندر سنگ مرمر کا راج محل کھڑا اپنی عظمت پر مُسکراتا تھا۔ یہ محل کس قدر خوبصورت تھا، کس قدر مضبوط۔ جسے دیکھ کر دل کا کنول شگفتہ ہو جائے۔ لیکن اُسے دیکھنے والوں کی تعداد کتنی تھی؟

(۲)

اسی طرح کچھ سال گزر گئے۔ سُور داس اپنی تاریک دُنیا کی تاریک اور کبھی ختم نہ ہونے والی لمبی رات میں مطمئن تھا۔ شاید اُسے دُنیا کی اس سب سے بڑی بدنصیبی کا احساس نہ تھا۔ دُنیوی جاہ و حشمت سے دُور، روشنی کے پُرکیف مناظر سے ہٹ کر حُسن و شباب کی جذبات انگیز تصویروں کی دید سے محروم ہونے کے باوجود اُس کی زندگی ایسے امن و سکون سے کٹتی تھی، جو شاہی محلوں میں بادشاہوں کو بھی میسّر نہیں۔ وہاں ہزاروں خطرے، ہزاروں اندیشے ہونگے۔ یہاں ایک بھی نہ تھا۔ سُور داس دن کو گاتا تھا، جیسے طائر پھولوں کی ڈالیوں پر چہکتا ہے۔ رات کو گھاٹ کی سیڑھیوں پر پاؤں پھیلا کر سو جاتا تھا، جیسے کم عُمر بچہ نیند آنے پر

جہاں ہو، وہیں لیٹ کر سو جاتا ہے۔ اُسے یہ خیال بھی نہیں آتا۔ کہیں صندوق کا تالا کھُلا نہ رہ گیا ہو۔ کہیں گھر میں چور نہ گھُس آئیں۔ یہ راحت و آرام کے ڈاکو بچّوں کی غم ناآشنا دُنیا میں پاؤں بھی نہیں رکھ سکتے۔ انسانی خُون کے یہ پیاسے بھیڑیئے بچّوں کے سامنے آکر پالتو کُتّے بن جاتے ہیں۔ جو دُم ہلاتے ہیں، پاؤں چاٹتے ہیں۔ کاٹتے نہیں۔ یہی حالت سُورداس کی بھی۔ اُس کا مزاج بچّوں کی طرح سادہ تھا، اُس کی ضروریات ہاتھ نہ پھیلاتی تھیں۔ نہ ناکامی کا مُنہ دیکھ کر غمگین ہوتی تھیں اُس کی دُنیا کھانے پینے گانے اور سو جانے تک محدود تھی۔ نہ اِس سے آگے اُمیدوں کی تلاش میں جاتا تھا۔ نہ مایُوس ہوکر خُون کے آنسو روتا تھا۔ صبر و قناعت کی ایسی نادر مثال کسی نے کم دیکھی ہوگی +

رات کا وقت تھا، آسمان کے تارے گنگا کی لہروں پر ناچ رہے تھے۔ سُورداس گھاٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھا تھا اور ایک سادھو سے بات چیت کر رہا تھا +

سادھو۔ سُورداس جی! آج تو بڑا گرم ہے۔ اپنے رام کی مرضی ہے جل ہی میں کھڑے رہیں۔ باہر نہ نکلیں +

سُورداس۔ برکھا ہونے والی ہے۔ آج تارے کیا نکلے ہوں گے۔ بادل گھرا ہوگا۔ جرور برسے گا۔ دم گھُٹ رہا ہے +

سادھو۔ نہیں سُورداس! تارے نکلے ہوئے ہیں۔ جو بھاگوان ہیں وہ گھروں میں چھتّوں پر لیٹے ہونگے۔ نوکر خدمت کرتے ہونگے۔ ایک ہم ہیں کہ یہاں پڑے بے نصیبوں کو رو رہے ہیں +

سُور داس۔ بھگوان کا نام لو۔ اُن کو بچارہ وں پھکر ہیں۔ بتاؤ تمہیں کیا چنتا ہے۔ بڑے بجے ہیں ہو مہاراج! اُس جندگی میں جا کر چار دن نہ رہ سکو۔ میرا کھیال ہے، دو دن میں بھاگ آؤ ۔

سادھو (مسکرا کر) نہیں سُور داس! وہ جندگی بڑی اچھی! یہ جندگی نہیں جندگی کا مجاک ہے۔ دن پُورے کر رہے ہیں ۔

سُور داس۔ تو جاؤ کوئی رانڈ ڈھونڈ کر سادی کر لو۔ جب تمہارے من کی ترِسنا نہیں مٹی تو گیروے کپڑے پہننا بے پھائدہ ہے ۔

سادھو۔ آج ایک سیٹھ آیا تھا۔ سب کو ایک ایک دھوتی دے گیا جب ہم پہنچے تو دھوتیاں ہی کھتم ہو گئیں۔ ہم من مار کر رہ گئے۔ کہا۔ جا سالے! تیری مُراد کبھی پُوری نہ ہو۔ تمہیں بھی ملی ہو گی گئے تھے یا نہیں ؟

سُور داس ۔ مجھے جرورت ہی نہ تھی ۔

سادھو۔ اب جاڑے کم آنے لگے ۔ پہلے تو بھیڑ لگی رہتی تھی۔ نسہ پانی بھی مسکل سے ہوتا ہے ۔

سُور داس۔ پر وہ سادھو ہی کیا جسے نسے کی عادت ہو۔ سادھو تو وہ ہے جو رام کا بھجن کرے ۔

سادھو۔ اب تو سب آریے بن گئے۔ جسے دیکھو نستے نستے کر رہا ہے۔ نہ کسی میں پریم ہے نہ کسی میں سردھا ہے ۔

سُور داس (بات کا رُخ بدلنے کے لئے) بڑی گرمی ہے آج نیند نہ آئیگی ۔

سادھو۔ اگر کچھ دن یہی حال رہا تو، ہم بھوکے مر جائیں گے۔ کوئی مُٹھی بھر چاول بھی نہ دے گا ❖

سُورداس (اپنی لاٹھی کو ٹٹول کر) ہمیں پرمیشر ایسا نہ کریگا بھائی! انسان کی کیا اوقات ہے۔ ہم تو مر جائیں۔ پر کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائیں ہمیں تو مانگتے ہوئے شرم لگتی ہے۔ ایسا عالم ہوتا ہے۔ جیسے کسی نے دل پر مُکا مار دیا ہو۔ بھوکا پڑ رہنا منظور۔ پرنت مانگنا منظور نہیں ❖

سادھو نے چلم پر آگ رکھی اور سُورداس کی طرف نفرت سے دیکھ کر کہا۔ تُم ہیں یہ دم ہو گا سُورداس! اپنے رام سے تو بھوک نہیں سہی جاتی بن مانگے کون آدمی دیتا ہے؟ یہ کہہ کر سادھو چلم پینے لگا ❖

سُورداس۔ بھگوان دیتا ہے اور کون دیتا ہے؟ پر تم بھگوان سے مانگتے ہی نہیں ہو ❖

سادھو نے قدرے چڑھ کر جواب دیا۔ تم بھی تو لوگوں کے سامنے ہی گاتے ہو۔ بھگوان کے سامنے کیوں نہیں گاتے۔ کھانے کو مل جاتا ہے تو چلے ہیں اپدیش کرنے۔ دو دن بھوکے رہو۔ تو ہوش ٹھکانے آ جائیں اور کیا؟

مگر سُورداس اب بھی مطمئن تھا مُسکرا کر بولا۔ ہم تو بھگوان ہی کے سامنے گاتے ہیں۔ سُننے کو کوئی سُن لے۔ اِس سے ہم سے کوئی مطلب نہیں

معاً ایک دوسرے سادھو نے آ کر کہا کیوں سُورداس کیا کر رہے ہو؟

سُورداس اُٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنے طنبورے اور لاٹھی پر ہاتھ پھیر کر

بولا۔ بات چیت کر رہے ہیں مہاراج! آیئے بیٹھئے۔ بڑا گرم۔ سر پہ پُھنکا جاتا ہے +

بُوڑھا۔ نہیں سُور داس! بیٹھنے کا بکت نہیں۔ آج ایک عجیب بات ہوئی۔ گھاٹ پر کسی کا لڑکا رہ گیا ہے۔ تین چار سال کی عُمر ہوگی۔ بہتیرا ڈھونڈا والدین کا پتہ نہیں لگتا۔ بتاؤ، کیا کریں۔ بڑا پیارا بچّہ ہے +

سُور داس (بے چین ہوکر) رو رہا ہوگا +

بُوڑھا۔ روتا تو اس طرح ہے کہ تُم سے کیا کہوں۔ بابو! بابو! کہہ کر چلا رہا ہے۔ اُسے روتے دیکھ کر میرا کلیجہ ہِل جاتا ہے۔ ماں باپ بھی کیسے لاپرواہ ہوتے ہیں۔ نہ ملے۔ تو کیا کریں۔ ساری عُمر روتے رہیں +

سُور داس لاٹھی لے کر کھڑا ہوگیا اور اندھی آنکھوں کی پلکیں جھپک کر اور گردن ہلاکر بولا۔ ڈھونڈ رہے ہونگے شاید ابھی آجائیں +

بُوڑھا۔ لاکھ پُچکارتے ہیں۔ مٹھائیاں دیتے ہیں۔ لیکن ذرا چُپ نہیں ہوتا۔ برابر روتا جاتا ہے۔ بتاؤ کیا کریں +

سُور داس (مسکرا کر) میرے پاس آجائے تو ایک منٹ میں چُپ ہوجائے۔ کیا مجال جو جرا بھی رو جائے +

بُوڑھا۔ واہ سُور داس! تم تو چھپے رستم نکلے۔ تو چلو۔ چل کرلے آؤ +

آگے آگے بُوڑھا چلا۔ پیچھے پیچھے سُور داس۔ ایک منٹ میں دونوں گھاٹ کے دُوسرے سرے پر جا پہنچے جہاں لڑکا پھُوٹ پھُوٹ کر رو رہا تھا۔ سُور داس نے جاتے ہی لاٹھی زمین پر رکھ دی اور ہاتھ پھیلا کر کہا۔

لاؤ تو اسے میرے پاس۔ آ بیٹا! میرے پاس آ۔

یہ کہہ کر اُس نے لڑکے کو اُٹھا لیا اور گلے سے لگا کر اُس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ایسے جیسے ماں اپنے بچے کو پیار کر رہی ہو؟ ایسے جیسے باپ نے اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے کو پا لیا ہو۔ لڑکے نے پہلے تو حیرت سے سُور داس کی طرف دیکھا شاید وہ سوچ رہا تھا کہ یہ کون ہے؟ لیکن دُوسرے ہی لمحہ میں اُس نے اپنا سر اُس کے کندھے پر رکھ دیا اور آہستہ آہستہ سسکنے لگا۔ گھبرائی ہوئی معصومیت کو محبت کے دامن میں پناہ مل گئی۔ وہ کچھ دیر سسکیاں بھرتا رہا۔ پھر چُپ ہو گیا۔ خلوص اور محبت کی مملکت میں اشکباری کی گنجائش کہاں؟

(۳)

دُوسرے دن صُبح کے وقت سُور داس حلوائی کی دُکان پر کھڑا حلوا اور پُوری مانگ رہا تھا۔ لوگ دیکھتے تھے اور حیران ہوتے تھے۔ یہ وہی سُور داس تھا، جس نے کسی کے سامنے کبھی ہاتھ نہ پھیلائے تھے۔ جو کہتا تھا، مر جاؤں گا، کبھی مُنہ سے نہ مانگوں گا۔ آج اُس کی غیرت کہاں چلی گئی تھی۔ آج اُس کی خود داری کو کیا ہو گیا تھا۔ گنگا گھاٹ کے سادھوؤں نے کہا سُور داس! یہ کایا پلٹ کیسی؟ ایک ہی رات میں بدل گئے۔ سُور داس نے اپنی بے نُور اندھی آنکھوں سے اُن کی طرف دیکھا اور ایک عجیب طرز کی حسرت آمیز ہنسی ہنس کر جواب دیا۔ ایک ہی دن کی بات ہے بھیّا! آج سانجھ تک اس کے ماں باپ آ کر لے جائیں گے۔ یہ

کہہ کر اُس نے بچّے کو سینے سے لگا لیا۔ اور اُس کا سر چُوم لیا ۔
لیکن شام ہو گئی اور بچّے کا کوئی وارث نہ آیا۔ دو دن، تین دن گزر گئے۔ پھر بھی کوئی نہ پہنچا۔ دنوں کے ہفتے بن گئے۔ بچّہ جسے سُورداس دیپک کے نام سے بُلاتا تھا اُس سے زیادہ مانُوس ہو گیا۔ کبھی اس کی گردن پر سوار ہو جاتا۔ کبھی گود میں آ کر بیٹھ جاتا۔ کبھی طنبورے کو چھیڑتا۔ کبھی لاٹھی لے کر بھاگ جاتا۔ سُورداس کو اُس کی ان طفلانہ شرارتوں پر بے اختیار پیار آتا تھا۔ کیا مجال جو اس کو ذرا بھی ڈانٹ جائے۔ اب دوپہر کے وقت وہ اپنے گانے بجانے کی کمائی سادھوؤں میں تقسیم نہ کرتا تھا۔ نہ گاتے وقت صبر و قناعت کا اظہار کرتا تھا۔ اب اُسے جتنا ملتا اُتنا ہی کم تھا۔ گویا اب یہ سُورداس وہ سُورداس نہ تھا۔ اس کی آمدنی پہلے سے زیادہ ہو گئی تھی۔ لیکن اُس کے دِل کو پھر بھی قرار نہ تھا۔ جب وہ گاتا۔ لڑکا پاس بیٹھا اپنی موٹی موٹی متحیر آنکھوں سے لوگوں کی طرف تاکا کرتا۔ لوگ پُوچھتے یہ بچّہ کون ہے؟ سُورداس جواب دیتا۔ حضور کسی بھاگوان کا بیٹا ہے۔ سوچتا ہوں اسے تکلیف نہ ہو۔ کیا یاد کرے گا۔ لوگ کہتے۔ سُورداس! اسے زیادہ سر پر نہ چڑھا بگڑ جائیگا۔ سُورداس کسی خیال سے سہم کر آہ سرد بھرتا اور گڑگڑا کر جواب دیتا۔ سرکار! پرمیشر نے چار دن کے لئے مہمان بھیجا ہے۔ میرے پاس ہمیشہ تھوڑا بیٹھا رہے گا۔ شائد آج ہی اس کے ماں باپ آ جائیں اور لے جائیں۔ آپ سے آپ سُدھر جائیگا۔ میں تو یہ سوچتا ہوں، اس کا من مَیلا نہ ہو۔ جب یہ

اُداس ہو کر چُپ چاپ بیٹھ جاتا ہے۔ تو میرے کلیجہ میں ہُوک سا پیدا ہو جاتا ہے۔ جانے کس کا بیٹا ہے؟ وہاں اس کی جانے کیسی کیسی کھوندیں ہوتی ہونگی؟ جانے کیسے کیسے نوکر خدمت کرتے ہونگے؟ یہاں ایک اندھے کے سوائے اس کا کون ہے! مَیں بھی ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگوں۔ تو اس کا دِل مُرجھا جائے۔ اب کیسا چہکتا پھرتا ہے۔ پھر بھی نہ اُٹھائے۔"

لیکن بارہ۱۲ سال گُزر گئے اور دیپک کو لینے کے لئے کوئی نہ آیا۔ سُورداس نے سمجھ لیا۔ یہ میرے ہی سر پڑا۔ اب وُہ رات کو گھاٹ پر نہیں سوتا۔ اُسنے شہر میں ایک چھوٹا سا مکان لے لیا ہے۔ وہاں ضرورت کی سبھی چیزیں ہیں۔ دری ہے۔ پلنگ ہے۔ برتن ہے۔ صندوق ہے۔ ٹائم پیس ہے۔ ایک میز اور کُرسی ہے۔ شیشہ اور کنگھی ہے۔ ایک لیمپ بھی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ دیپک کے لئے ہے۔ سُورداس کے لئے کچھ بھی نہیں وُہ اب بھی وہی سُورداس ہے۔ اُسی طرح بھیک مانگتا ہے۔ اُسی طرح گاتا ہے ہاں لالچی بہت ہو گیا ہے۔ اب اُس کے فرائض بڑھ گیے ہیں۔ پہلے آزاد تھا اب غلام ہے۔ پہلے رات کو بے فکری کی نیند سوتا تھا اب رات کو چونک چونک کر اُٹھ بیٹھتا ہے۔ گھاٹ پر سویرے ہی پہنچ جاتا ہے بڑی محنت سے گاتا ہے۔ بڑی منتوں سے مانگتا ہے۔ جب تک روپیہ سوا روپیہ نہ مل جائے۔ اُٹھنے کا نام نہیں لیتا۔ کبھی اُس کے لئے روپیہ مٹّی کے برابر تھا۔ اب کوڑی کوڑی کو دانتوں سے پکڑتا ہے۔ کیا مجال جو کسی کو ایک پیسہ بھی دے جائے۔ ہاں دیپک کے لئے اُس کی جان بھی

حاضر ہے۔ اُس کے لئے اچھّی سے اچھّی چیزیں خریدتا ہے۔ اور اُسے دے کر خوش ہوتا ہے۔ دیپک نویں جماعت میں پڑھتا ہے۔ سورداس اُسے اپنے ہاتھ سے کھانا بنا کر کھلاتا ہے۔ اور سکول بھیجتا ہے۔ اس کے بعد پھر گھاٹ پر جا بیٹھتا ہے اور مانگتا ہے۔ لیکن تین بجے سے پہلے پہلے گھر پہنچ جاتا ہے، تا کہ دیپک کو سکول سے آتے ہی پینے کے لئے دُودھ مل جائے۔ رات کو وہ لیمپ کے سامنے بیٹھ کر پڑھتا ہے۔ سورداس دری پر لیٹ کر اپنے دل سے باتیں کرتا ہے۔ کبھی کبھی دیپک کو بُلا کر دیکھ بھی لیتا ہے۔ کہ سو تو نہیں گیا۔ سو جائے تو اُٹھا کر بٹھا دیتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ پڑھ! رات کو سوتے وقت بھی اُس کو دیپک ہی کے خیال آتے ہیں۔ جب جاگ اُٹھتا ہے تو سوچتا ہے۔ یہ نوکر ہو جائے تو اس کا بیاہ کر دوں۔ گھاٹ پر ایک سادھنی آتی ہے اُس کے ایک بارہ تیرہ سال کی لڑکی ہے۔ لوگ کہتے ہیں وہ خوبصورت بھی ہے۔ اُس کا گلا بہت سُریلا ہے۔ گاتی ہے تو سماں بندھ جاتا ہے۔ سورداس چاہتا ہے۔ اُس کا دیپک سے بیاہ ہو جائے۔ وہ بھی بہو والا بن جائے۔ اُسے بھی اپنے ہاتھ سے کھانا نہ پکانا پڑے بیٹھا حکم چلایا کروں گا۔ ذرا سی بات بھی خلافِ مرضی ہو جائے تو رُوٹھ جایا کروں گا۔ دو نو منائیں گے جب مانوں گا اور وہاں گھاٹ پر جانا ترک کر دوں گا۔ ورنہ لوگ دیپک کو بُرا بھلا کہیں گے۔ یہ اُمیدیں کیسی رُوح افزا تھیں۔ کیسی مسرت آگیں۔ سورداس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے اندھیرے سنسار میں روشنی

جگمگا رہی ہے جیسے اُس کی آنکھیں کُھل جانے والی ہیں۔ جیسے اُس کی دُنیا بدل جانے والی ہے۔ اب تک بھیک مانگتا تھا۔ اب راج گدی پر بیٹھ جائیگا۔ اِس خیال کے آتے ہی اُس کے دل کا کنول کِھل جاتا تھا۔ اُس کی طبیعت شگفتہ ہو جاتی تھی۔ سادھنی نے بھی یہ رشتہ منظور کر لیا ہے۔ فقیر کی لڑکی کو اس سے اچھّا بَر اور کون ملے گا۔ آج نویں جماعت میں پڑھتا ہے۔ کل دسویں پاس کر کے کہیں نوکر ہو جائیگا۔ اور بابو کہائیگا۔ لڑکی راج کرے گی۔ سادھنی اُس وقت کا تصوّر کرتے ہی خیالات کی جنّت میں پُہنچ جاتی ہے۔ ہمارا حال خواہ کیسا ہی تاریک ہو۔ لیکن مستقبل کو اُمید و مسرّت کی روشنی سے خالی کس نے دیکھا ہے۔ مستقبل کی ویرانی انسان کو خودکشی پر آمادہ کر دیتی ہے ؏

(۴)

لیکن سُورداس ہی دیپک پر فدا ہو۔ یہ بات نہ تھی۔ دیپک بھی سُورداس سے پیار کرتا تھا۔ سکول سے آتا تو دادا کہہ کر اُس کے گلے سے لپٹ جاتا تھا۔ اُسے کھانا پکاتے دیکھ کر اُسے دلی کوفت ہوتی تھی۔ اُس کا گھاٹ پر جانا تو اب اُسے ایسا اکھرتا تھا کہ اگر اُس کے بس میں ہوتا۔ تو ایک دن میں بند کر دیتا۔ اکثر کہا کرتا۔ دادا! مجھے نوکر ہو لینے دو۔ پھر کیا مجال تم گھاٹ پر پاؤں بھی رکھ جاؤ۔ جو کماؤں گا، تمہارے ہاتھ میں دُونگا۔ جیسے چاہو خرچ کرنا۔ میں ذرا دخل نہ دُوں گا۔ سب سیاہ سفید تمہارے ہاتھ میں ہو گا۔ مجھے صرف دو نو وقت کھانے کو مل جائے، مجھے اور کچھ نہ چاہیئے۔ ایک دن سُورداس نے کہا "دیپو! کل کو اگر تمہارا

باپ آجائے تو کیا کرو۔ مَیں جانوں کھوسی سے ساتھ چل دو۔ میرا کھیال بھی نہ کرو۔ جانے پھر کبھی یاد بھی کرو یا نہ کرو۔" دیپک سُورداس کی طرف محبّت کی نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔ دادا! ایسی باتیں نہ کرو۔ ورنہ مَیں رو دُوں گا۔ اب میرے باپ تم ہی ہو اور کوئی نہیں۔ جس محبّت سے، جس پیار سے مجھے تم نے پالا ہے۔ ایسی محبّت سے کوئی باپ اپنے بیٹے کو بھی کیا پالے گا۔ مَیں تمہیں باپ ہی سمجھتا ہوں مجھے کبھی خیال بھی نہیں آتا۔ کہ تم میرے باپ نہیں ہو۔

سُورداس کی بے نُور آنکھوں سے آنسُو بہنے لگے۔ اُس نے اپنی دونوں باہیں پھیلا دیں۔ دیپک کے ہاتھ میں کتاب تھی۔ وہ اُسے زمین پر پھینک کر سُورداس کے گلے سے لپٹ گیا۔ اور روتے روتے بولا۔" دادا! پھر ایسی بات نہ کہنا۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے۔

سُورداس نے دیپک کے مُنہ پہ پیار سے ہاتھ پھیرا اور بے صبری سے پُوچھا۔"اچھا بتا اگر تیرا باپ آجائے تو جائے یا نہ جائے۔ جو وہ بہت امیر ہو۔ بڑا آدمی ہو۔ بڑا اِکبال والا ہو۔ بول کیا کرے۔ مجھ اندھے بھکھیر کا کھیال کرے۔ یا اُس کا؟ سانچ سانچ کہہ"۔

دیپک نے تڑپ سے جواب دیا۔" سچ کہتا ہوں دادا! اگر وُہ لکھ پتی ہو جب بھی نہ جاؤں۔ کسی ریاست کا راجہ ہو جب بھی پروا نہ کروں۔ میرے لئے جو تم نے کیا ہے وہ کوئی کسی کے لئے کم کرے گا۔ اگر تم نہ ہوتے۔ تو مَیں رو رو کر مر جاتا۔ کوئی روٹی کا ٹکڑا بھی نہ دیتا۔ دادا

اِس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں۔ مَیں چاہتا ہوں میرا باپ اب مجھے لینے نہ آئے۔ مَیں یہ گھر کبھی نہ چھوڑوں گا۔"

سُورداس:- "ارے! یہ گھر؟ اس میں کیا دھرا ہے۔ بیوکوف کہیں کا۔"

دیپک:- "جو اس میں ہے وہ بڑے بڑے محلوں میں نہیں ہے دادا!"

سُورداس کے دل کا کنول کھل گیا۔ خوش ہو کر بولا:- "واہ! اِس میں کیا ہے؟ تمہارے رہنے لائق بھی تو نہیں ہے۔"

دیپک:- "واہ! رہنے لائق کیوں نہیں۔ اس میں تم ہو۔ اس میں تمہاری محبّت ہے۔ اس سے زیادہ مجھے دُنیا میں اور کیا چاہیئے۔ مجھے اگر کوئی سورگ دے جب بھی نہ جاؤں۔ دادا مجھے اِس گھر کی ایک ایک چیز عزیز ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہاں کا ایک چپہ چپہ میرا دوست ہے مجھے اِس کے اینٹ اور پتھر بھی پیارے ہیں۔"

سُورداس کو ایسا معلوم ہُوا جیسے کسی نے آسمان پر چڑھا دیا ہے۔ اِس وقت وُہ اس غریب مانگ کر کھانے والے گنگا کے گھاٹ پر بیٹھ کر طنبورہ بجانے والے اندھے فقیر سے کتنا مختلف، کس قدر اُونچا تھا۔ اُس کے دل میں خوشی کی ترنگیں اُٹھ رہی تھیں۔ اب اُس کی محنتیں بار ور ہونے کو تھیں۔ اب اُس کو اپنی کئی سال کی تپسیا کا پھل ملنے والا تھا۔ آج اندھے کی اندھیری دُنیا میں اُمید کا دِیا روشن تھا۔ اُس نے دیپک کو سینہ سے چمٹا لیا۔ اور خوشی سے رونے لگا +

(۵)

دو سال اور گزر گئے۔ دیپک نے انٹرنس کا امتحان پاس کر لیا! اور کالج میں داخل ہو گیا۔ سُورداس بیحد پریشان تھا۔ کیا کرے کیا نہ کرے۔ اس کی آمدنی تیس پنتیس سے زائد نہ تھی۔ وہ کہتا تھا "بیٹے! کہیں نوکری کر لے۔ اب مجھ سے گھاٹ پر نہیں بیٹھا جاتا۔" دیپک جواب دیتا "دادا! انٹرنس پاس کو کون پُوچھتا ہے۔ کوئی بیس پچیس سے زیادہ کبھی نہ دیگا۔ اس میں گزر اوقات بھی مشکل ہے۔ ایف۔ اے پاس کر لوں تو چالیس پچاس کہیں گئے نہیں کسی طرح دو سال نکل جائیں ساری عُمر کا روگ کٹ جائیگا۔" دلیل میں وزن تھا۔ سُورداس چُپ ہو جاتا۔ لیکن روپیہ کہاں سے آئے؟ وہ اندھا تھا۔ اور گھاٹ پر بیٹھ کر گاتا تھا اور جو کچھ لوگ اُسے روزانہ دیتے تھے وہ روپیہ سوا روپیہ سے زیادہ نہ ہوتا تھا۔ اِدھر دیپک کو شہر کا پانی لگ گیا تھا۔ پہلے سیدھے سادھے کپڑے پہنتا تھا اب کوٹ پتلون پہننے لگا۔ نکٹائی کے بغیر اب اس کا کالج جانا ناممکن تھا۔ بُوٹ پالش اور بالوں کے تیل کا خرچ بھی بڑھ گیا۔ پہلے گھر میں ورزش کر لیتا تھا، اب ٹینس کھیلنے لگا۔ سُورداس سمجھاتا تو مُنہ پھُلا لیتا۔ کہتا "تم تو چاہتے ہو۔ کالج میں نکو بن کر رہوں۔ مجھ سے یہ نہ ہو گا۔ کہیے پڑھنا چھوڑ دُوں۔" سُورداس یہ بھی نہ چاہتا تھا۔ کبھی کبھی اُسے یہ بھی شُبہ ہوتا تھا۔ کہ دیپک کا مزاج بدل رہا ہے۔ اب اُس میں خود غرضی کا مادہ بڑھتا جاتا ہے۔ جیسے دیپک کوئی

اَور ہو گیا ہے۔ یہ خیال اُس کے لئے سوہانِ رُوح تھا۔ لیکن وُہ اِس خیال کو اپنے دل میں زیادہ دیر ٹھہرنے نہ دیتا تھا۔ جیسے ہم اپنے عزیزوں کے خلاف کوئی بات کسی کے مُنہ سے سُننا نہیں چاہتے۔ اپنے حقیقی بہی خواہوں کے مُنہ سے بھی نہیں۔ یہی حالت سُور داس کی تھی۔ وُہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہا تھا۔ اور چاہتا تھا۔ جیسے بھی ہو دیپک ایف اے پاس کرلے۔ لیکن روپیہ؟ یہ سوال بڑا ٹیڑھا تھا۔ تیس چالیس کی آمدنی تھی۔ ساٹھ ستّر کا خرچ تھا۔ سُور داس اِسی غم میں گھُلا جاتا تھا۔ اُسے رات کو نیند بھی نہ آتی تھی۔ آخر رات کے پچھلے گلیوں میں بھی جاکر گانے لگا کہ شاید اسی طرح کچھ بن جائے۔ گانے میں درد تھا۔ عورتیں اپنے گھروں میں بُلا لیتیں۔ اور گیت سُنتیں۔ سُور داس بعد میں اپنا رونا لے بیٹھتا۔ کہتا۔ ماں جی! لڑکا کالج میں پڑھتا ہے۔ مدد کرو۔ عورتیں کہتیں۔ سُورے! تُو اِتنا کماتا ہے۔ وُہ سب کہاں جاتا ہے؟ سُور داس اپنی اندھی آنکھیں اِدھر اُدھر گھُماتا اور جواب دیتا۔ بڑا کھرچ ہے ماں جی! پِسا جاتا ہوں۔ کسی طرح دو برس گُجر جائیں تو سکر کروں۔ عورتیں کہتیں۔ بڑا ظالم لڑکا ہے۔ نوکری کیوں نہیں کرلیتا۔ تُو اِس عمر میں اب کہاں تک محنت کرے گا۔ سُور داس جواب دیتا۔ نوکری کیا کرے کوئی تیس چالیس بھی تو نہ دیگا۔ عورتیں کہتیں۔ بُڈّھے! تیری تو عقل ماری گئی ہے۔ کیا اب تیرا لڑکا ڈپٹی ہو جائیگا۔ سُور داس جواب دیتا۔ بھگوان جو چاہے کرے۔ اس سے یہ بھی دُور نہیں ہے۔ جانے اُس کی کِسمت

میں راج کرنا ہی لکھا ہو۔ ماں جی! آج ایک روپیہ دے دیجئے۔ بڑا پُن ہوگا۔ بڑی جرورت ہے۔ بس ایک روپیہ مل جائے۔ اس کے بدلے پرمیسر آپ کو سَو دیگا۔ ماں جی! عورتوں کو رحم آجاتا۔ آنہ دو آنے دے دیتیں +

اِدھر یہ کمزور، بوڑھا، اندھا اِس طرح مردانہ وار زندگی کی لڑائی لڑتا تھا۔ اُدھر دیپک نے دُنیائے حُسن و عشق کی راہ لی۔ اُس کے درجہ میں ایک بیوہ کی حسین لڑکی رُوپ کنور پڑھتی تھی۔ اُس سے محبّت ہوگئی۔ ہر وقت ایک ساتھ رہنے لگے۔ جماعت میں بھی ساتھ ساتھ بیٹھتے تھے۔ اکٹھے سیر کو جاتے اور اپنے مستقبل کی باتیں کر کر کے خوش ہوتے۔ دُوسرے طُلبا یہ دیکھتے تھے اور ہنستے تھے۔ بعض ایسے بھی تھے۔ جن کو ڈاہ ہوتی تھی۔ کہتے۔ اندھے کا بیٹا کیا خوش نصیب ہے کالج کی سب سے حسین لڑکی لے گیا۔ ہم مُنہ دیکھتے ہی رہ گئے۔ بعض کہتے تھے۔ یہ لڑکی بیوقوف ہے جو اس کے پھندوں میں آگئی۔ چار دن میں پچھتانے لگے گی۔ جانے کون ہے، کس کا بیٹا ہے۔ ممکن ہے کسی بھنگی یا چمار ہی کا بیٹا ہو۔ لیکن نشۂ محبّت کے ان متوالوں کو کسی کی پروا نہ تھی۔ ان کی محبّت روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ آخر جب ایف۔ اے کا نتیجہ نکلا۔ اور دونوں پاس ہوگئے تو ہجر و ملال کا رُوئے سیاہ دکھائی دیا۔ جب تک پڑھتے تھے۔ تب تک بے فکر تھے۔ لیکن نتیجہ نکلتے ہی اُن کی شادیوں کا مسئلہ پیش ہوگیا۔ رُوپ کنور اپنی ذات کے ایک فارغ البال وکیل سے منسوب تھی۔ اُن کے

والدین نے لکھا اب ہم نہیں انتظار کر سکتے۔ جلد تاریخ مقرر کرو۔ اُدھر سادھنی نے سُورداس سے کہا۔ اب تو ایف۔ اے کا امتحان بھی پاس کر لیا۔ اب بیاہ میں دیر نہ کرو۔ لڑکی جوان ہو گئی ہے۔ دیپک اور رُوپ کنور دونوں گھبرا گئے۔ کیا کریں۔ کاش امتحان میں فیل ہو جاتے۔ تو ایک سال کی اور مُہلت مل جاتی۔ لیکن وائے نصیب! اُن کی قسمت میں امتحان کی یہ ناکامی بھی نہ تھی۔ لڑکے فیل ہو کر روتے ہیں یہ پاس ہو کر رو رہے تھے ؛

ایک دن دیپک نے رُوپ کنور سے کہا " دادا نہیں مانتا۔ کہتا ہے میں سادھنی سے قول ہار چکا ہوں۔ اب انکار کیونکر کر دوں۔ لڑکی تمہارے نام پر بیٹھی ہے۔ وہ کیا کہے گی ؟"

رُوپ کنور نے دیپک کی طرف درد بھری نگاہوں سے دیکھا اور گردن جُھکا لی ؛

دیپک نے ڈرتے ڈرتے پُوچھا " تُمہاری ماں کیا کہتی ہے ؟"

رُوپ کنور نے سر ہلا کر آہستہ سے جواب دیا " وہ بھی نہیں مانتی۔ کہتی ہے۔ جانے کس کا بیٹا ہے۔ تمہیں اندھے کنوئیں میں کیسے جھونک دوں "؛

دیپک کے سینہ میں تیر سا چُبھ گیا ؛

تھوڑی دیر دونوں چُپ چاپ اپنے دل میں کچھ سوچتے رہے۔ اس کے بعد دیپک نے ایک لمبی آہ کھینچی۔ اور کہا " رُوپ! اگر

مجھے معلوم ہوتا۔ کہ اِس محبّت کا یہ انجام ہو گا۔ تو تم سے کبھی پیار نہ کرتا۔ ہنس ہنس کر ملے تھے۔ رو رو کر جُدا ہو نگے"؟

رُوپ کنور نے ناگن کی مانند سر اُٹھایا اور بولی "ہمیں جُدا کون کر سکتا ہے۔ کوئی نہیں۔ مجھے ماں کی ذرا بھی پروا نہیں"۔

دیپک (بے بسی سے) جُدا تو ہونا ہی پڑے گا" رُوپ کنور!"

دونوں پھر چُپ ہو گئے۔ شام کا وقت تھا۔ دریا کا پانی، اُس کے کنارے کے درخت، چڑیوں کا شور، دن کی روشنی، سب آہستہ آہستہ تاریکی میں غائب ہو رہے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے اُن کی اُمیدوں کے شجر، زندگی کی روشنی، تمنّاؤں کا شور، نا اُمیدی کے اندھیرے میں غرق ہو رہا تھا۔ معاً رُوپ کنور نے دیپک کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور منّت آمیز لہجہ میں کہا "چلو کہیں بھاگ چلیں ایسے دیس میں جہاں ہمارا اپنا کوئی بھی نہ ہو۔ مخالفت اپنے ہی کرتے ہیں بیگانے نہیں کرتے"۔

دیپک نے رُوپ کنور کا ملائم ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور آہستہ سے کہا "بدنام ہو جائیں گے"۔

رُوپ کنور "گوشۂ عافیت تو مل جائیگا"۔

دیپک "دادا کیا کرے گا"؟

رُوپ کنور "کرنا کیا ہے۔ گھاٹ پر بیٹھ کر بھجن گائیگا۔ تم بھولے ہو۔ سمجھتے ہو۔ اُسے بھی تمہارا اُتنا ہی خیال ہے جتنا تمہیں اُس کا ہے"؟

دیپک "اور تمہاری ماں؟"
رُوپ کنور۔ (اپنے ہاتھ سے ساڑھی کو سر پر ٹھیک کر کے) "وہ بھی چار دن روئے گی، پھر صبر کر کے بیٹھ جائے گی۔ سمجھ لے گی۔ لڑکی نے اپنے من کی کر لی۔ اور کیا؟"

یہ کہہ کر رُوپ کنور نے شرما کر گردن جھکا لی۔ اِس شرمائی ہوئی نگاہ نے دیپک کے دل میں آگ لگا دی۔ کیا کرے، کیا نہ کرے۔ اُس کا دل دونوں طرف دوڑتا تھا۔ اُسے دادا کا بھی خیال تھا، رُوپ کنور کا بھی۔ وہ دونوں کو چاہتا تھا۔ لیکن دونوں ایک دُوسرے سے کتنے الگ تھے۔ دونوں کے مابین جیسے ہزاروں کوسوں کا فاصلہ تھا۔ دیپک سوچنے لگا۔

آخر وہی ہُوا جو ایسے مواقع پر ہُوا کرتا ہے۔ حُسن و شباب کی محبت نے فرض کا گلا گھونٹ دیا۔ دُوسرے دن دونوں غائب تھے۔

(۶)

سُورداس کی دُنیا ویران ہوگئی۔ چاروں طرف دوڑتا پھرتا تھا اور دیپک کو ڈھونڈتا تھا۔ کالج کے پروفیسروں کے پاس گیا۔ طالبعلموں سے پُوچھا۔ دیپک کے دوستوں سے دریافت کیا۔ لیکن دیپک کا کسی کو بھی پتہ نہ تھا۔ کیا کیا اُمیدیں تھیں؟ سب پر پانی پھر گیا۔ کیا کیا امنگیں تھیں، سب مٹی میں مل گئیں۔ لوگ کہتے تھے۔ سُورداس! اب بیٹھ کر ہری کا بھجن کر۔ چلا گیا ہے، چلا جانے دے۔ سُورداس جواب دیتا۔ کیا کروں، جی نہیں مانتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے ابھی آ کر گلے

لپٹ جائیگا۔ گنگا گھاٹ کے سادھو کہتے۔ سُورداس! تُو تو باولا ہو گیا ہے
کبھی غیر کا لڑکا بھی اپنا ہُوا ہے۔ غیر سدا غیر ہے۔ اُس کا خیال چھوڑ دے۔
اب وہ کبھی نہ لَوٹے گا۔ ایک پُجاری نے کہا جب تک پڑھتا تھا، اُسے
تیری ضرورت تھی۔ اب پڑھ لکھ گیا ہے۔ اب اُسے تیری کیا ضرورت ہے؟
سُورداس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اپنی لاٹھی کے سرے پر ہاتھ
رکھ کر بولا۔"اسے تو کھانے پینے کی بھی سُدھ نہیں۔ کوئی نہ کھلائے تو
دو دو دِن کھانا ہی نہ کھائے۔ بڑا بھولا ہے۔ بڑا بے پرواہ ہے"۔ ایک اَور
سادھو نے کہا۔"یہ سب مایا ہے۔ سُورداس، ذرا سوچے تو دل کی آنکھیں
کُھل جائیں" لیکن سُورداس کے دل پر جو گُزر رہی تھی، اُسے کون جانتا
تھا۔ شام کو گھر جاتا، تو سوچتا۔ شاید آگیا ہو۔ لیکن وہاں کوئی نہ ملتا۔ رات
کو ذرا دروازہ ہلتا۔ اور سُورداس اُٹھ کر بیٹھ جاتا، شاید وہی ہو لیکن
وہ کہاں تھا؟ اندھے کی قسمت اندھے کی آنکھوں سے بھی زیادہ تاریک تھی!

اسی طرح تین سال گُزر گئے۔ دیپک اور رُوپ کنور کا کوئی سُراغ نہ
ملا۔ رُوپ کنور کی ماں بیٹی کے غم میں رو رو کر مر گئی۔ سُورداس جیتا تھا،
لیکن مُردوں سے بدتر۔ پہلے جسم بھرا ہُوا تھا۔ اب ہڈیاں نکل آئی تھیں۔
زندہ تھا مگر اب اُسے کسی نے ہنستے نہیں دیکھا۔ نہ کبھی گاتا ہے۔ کسی سے
بات کرتا ہے تو آنکھوں سے آنسو آجاتے ہیں۔ گھاٹ پر چُپ چاپ
بیٹھا رہتا ہے۔ کوئی دے جائے۔ لے لیتا ہے۔ نہ دے۔ خاموش رہتا
ہے۔ اور دوپہر کو اُٹھ کر گھر چلا جاتا ہے۔ سادھوؤں نے بہتیرا سمجھایا کہ

مکان چھوڑ دے لیکن سُور داس نے مکان نہ چھوڑا۔ اسے اب بھی اُمید تھی۔ دیپک آجائیگا۔ ہر رات اُس کے پلنگ پر بستر بچھاتا۔ ہر ہفتے اُس کی چادر بدل دیتا۔ روز لیمپ کی چمنی صاف کرتا۔ روز کتابوں کا گرد جھاڑتا۔ اِس اندھی بہری، مایوس نہ ہونے والی محبّت کو دیکھ کر لوگوں کے کلیجہ سے ہوک سی اُٹھتی تھی۔ ایسی عقیدت، ایسی مستقل مزاجی، ایسی محویت سے کسی بھگت نے اپنے دیوتا کو بھی نہ رجھایا ہوگا۔

آخر ایک دن سُور داس کے سوئے ہوئے نصیب جاگے۔

رات کا وقت تھا۔ سُور داس دیپک کے پلنگ کی چادر بدل رہا تھا۔ اور گزرے ہوئے دِنوں کو یاد کر رہا تھا۔ معاً کسی نے دروازہ پر دستک دی۔ سُور داس چونک پڑا۔ یہ ہوا کا جھونکا نہ تھا۔ نہ کوئی جانور تھا۔ ضرور کوئی آیا ہے۔ سُور داس نے دوڑ کر دروازہ کھولا اور بے صبری سے بولا۔ "کون دیپک؟"

"نہیں دیپک نہیں۔ دیپک کی کھبر ہے"۔

سُور داس کی رگ رگ میں مسرّت کی لہر دوڑ گئی۔ سادھو کو گھسیٹ کر اندر لے گیا۔ اور اُسے پلنگ پر بٹھا کر خوشی سے ہانپتے ہوئے بولا۔ "جلدی بتاؤ کیا کھبر ہے؟"

یہ کہہ کر اُس نے جھٹ پٹ لیمپ جلا دیا۔

سادھو۔ "میں نے تمہارا دیپک دیکھا ہے"۔

سُور داس کے چہرے پر رونق آ گئی۔ جلدی جلدی آنکھیں جھپک کر

بولا "کہیں دیکھا ہے باباجی"؟

سادھو "لاہور میں"۔

سُورداس "وہی ہے۔ کہیں تمہیں بھُلتی تو نہیں لگی"؟

سادھو "بھُلتی کیسے لگے۔ سُورے! مَیں اُسے ہجاروں میں پہچان لُوں۔ وُہ رانڈ بھی اُس کے ساتھ ہی تھی۔ دونوں بجار میں جا رہے تھے۔ مَیں نے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ کہ وہی ہے۔ اب تو ساب بن گیا ہے۔ بالکل ساب معلوم ہوتا ہے۔ سُورے جرا چلم تو دے"۔ سُورداس نے چلم پر آگ رکھ دی۔ سادھو دم لگانے لگا۔

سُورداس "تم نے بُلایا نہیں"؟

سادھو "بُلایا کیوں نہیں۔ جھٹ آگے بڑھ کر کہا۔ بابُو ساب کچھ نان مل جائے۔ اُس نے میری طرف مُسکرا کر دیکھا اور کہا۔ بابا! کچھ کام کیوں نہیں کرتے؟ وُہ رانڈ بولی۔ مُفت کھانے کی عادت پڑ گئی ہے لیکن اُس نے ایک پیسہ مجھے ہی دیا۔ اُس رانڈ کا اکھتیار ہوتا تو کبھی نہ دیتی۔ بولو چلوگے۔ مَیں اُس کا مکان بھی دیکھ آیا۔ گوالمنڈی میں رہتا ہے"۔

سُورداس کو سادھو کے مُنہ سے رانڈ کا لفظ سُن کر زہر چڑھ گیا۔ لیکن اُس نے غصہ ظاہر نہیں کیا۔ بولا "جرور چلوں گا۔ تم بھی چلوگے نا۔ تمہارا کرایہ مَیں دُوں گا۔ آج مجھے بڑی کھوسی ہے۔ آج مجھے اپنے دیپک کی کھبر ملی ہے۔ اُسے سرم لگتی ہوگی۔ ورنہ آپ آ کر لے جاتا۔ مَیں

جاتے ہی چھما کر دُونگا۔ تو بڑا کھوس ہو گا۔ بولو کب چلو گے۔ آج ہی کیوں نہیں چلتے۔ اُسے پا کر میں جی جاؤں گا"۔

سادھو"۔ آج نہیں۔ پرسوں چلیں گے۔ مَیں تمہیں اُس کے دروازے پر پُہنچا کر چلا آؤں گا۔ یہ پہلے کہے دیتا ہوں"۔

سُور داس۔ (اُداس ہو کر) "چلے آنا۔ مگر پرسوں تو بہت دُور ہے۔ اب مجھ سے صبر نہ ہو گا۔ کل چلو۔ یہ کہہ کر سُور داس نے سادھو کے پاؤں پکڑ لئے۔ اب وہ انکار نہ کر سکا۔ بولا کل ہی سہی۔ روپیوں کا انتجام کر لو"۔

سُور داس "۔ روپیوں کا پھکر نہ کرو۔ تم اب اس بکت کہاں جاؤ گے؟ یہیں پڑ رہو۔ کیوں؟"

سادھو"۔ نہیں سُورے! گھاٹ پر جاؤں گا۔ سیدھا اُدھر ہی آ رہا ہوں۔ اِس بکت جانے دو"۔

سادھو چلا گیا۔ سُور داس بیٹھ کر سوچنے لگا۔ دیپک کیا کہے گا؟ دیکھتے ہی گلے سے لپٹ جائیگا۔ اور چھما مانگے گا۔ مَیں پہلے کھپھا ہونگا۔ پھر مان جاؤں گا۔ اُس کی بہو لائک معلوم ہوتی ہے۔ چلو اچھا ہُوا۔ سادھنی کی لڑکی پھر بھی بھکارنی ہی تھی۔ یہ پڑھی لکھی ہے میرا جرور کھیال کرے گی۔ اِستریوں کا دل نرم ہوتا ہے"۔

سُور داس نے تنبورا اُٹھایا اور گانے لگا۔ آج اُس کی آواز کیسی شیریں، کیسی لوچ دار تھی۔ آج اُس کی طبیعت اُمڈی پڑتی تھی۔ آج

بُجھے ہوئے دل کو اُمید کی رُوشنی نظر آئی تھی۔ جب صُبح ہوئی تو اُس نے مٹّی کے ایک برتن سے تین سال کے جمع کئے ہوئے روپے نکالے اور انٹی میں باندھ کر گھاٹ کی طرف روانہ ہُوا۔ لیکن آج اُس کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے ۔

چوتھے دن رات کے وقت لاہور میں گوالمنڈی کے اک دو منزلہ مکان کے سامنے ایک ٹمٹم آ کر رُکی۔ اور اس میں سے وہ سادھو اور سُور داس اُترے۔ سادھو سُور داس کو مکان کے دروازہ پر لے گیا۔ اور دُوسرے دن ملنے کا وعدہ کر کے چلا گیا ۔

سُور داس نے چند لمحے توقّف کیا اور پھر آہستہ سے دروازے پر دستک دی ۔

"کون ہے"؟

سُور داس کا دل دھڑکنے لگا۔۔۔۔۔۔ یہ وہی تھا۔ وہی آواز تھی۔ وہی لب و لہجہ۔ وہی تلفظ۔ وہی شیرینی جس کے لئے سُور داس تین سال سے بے چین و مضطرب تھا۔ جس کے سامنے وہ اپنی زندگی کو بھی حقیر سمجھتا تھا۔ خوشی کا یہ عالم تھا کہ زبان سے لفظ نہ نکلتا تھا۔ "کون ہے"؟ دیپک نے پھر پُوچھا اور اُس کے ساتھ ہی قمیض پہنے ننگے سر آ کر دروازہ میں کھڑا ہو گیا۔ سُور داس نے دیپک کے پاؤں کی چاپ پہچان لی۔ اور دونوں ہاتھ پھیلا کر جواب دیا۔ "میں ہُوں سُور داس"۔

دیپک نے ایک لمحہ کے لئے سُور داس کے نحیف و نزار جسم کی

طرف دیکھا۔ اور اُس کے بعد دادا! دادا!! کہہ کر اُس کے گلے سے لپٹ گیا ؂

تھوڑی دیر بعد دونوں کمرہ میں بیٹھے تھے۔ اور باتیں کر رہے تھے۔ سُورداس نے کہا "دیکھا میں نے تجھے آپکڑا۔ اب کہاں بھاگے گا؟

دیپک "شاید آپ کو یقین نہ آئے۔ کئی مرتبہ تیار ہُوا، کہ چل کر آپ کو یہاں لے آؤں۔ لیکن شرم رستہ روک لیتی تھی" ؂

سُورداس "ایک خط ہی لکھ دیا ہوتا" ؂

دیپک "رُوپ کنور کہتی تھی۔ میری ماں کو پتہ لگ گیا تو بڑی مُشکل پڑے گی"

سُورداس "وُہ تو کبھی کی مر چکی۔ تمہیں معلوم ہے یا نہیں" ؂

دیپک "جی ہاں! معلوم ہو گیا تھا۔ آپ تو آدھے بھی نہیں رہے۔ آپ مُنہ سے نہ بولتے۔ تو شاید مَیں پہچان بھی نہ سکتا۔ وہ شکل ہی نہیں رہی" ؂

سُورداس "تم بھی تو بہت کم زور ہو گئے۔ کچھ دُودھ پیتے ہو یا نہیں؟"

دیپک "روز پیتا ہوں دادا! مجھے تو سب کہتے ہیں۔ تم بہت موٹے ہو گئے ہو" ؂

سُورداس "چل جھُوٹا کہیں کا! جو کاشی میں تھی۔ وُہ بات کہاں؟ کیا تنخواہ ملتی ہے؟

دیپک "ساٹھ ملتے ہیں۔ وُہ بھی سکول میں پڑھاتی ہے۔ ساٹھ اُسے

ملتے ہیں۔ سوا سو ہو جاتا ہے بڑے مزے میں ہیں"۔
سُورداس ؔ "بڈھے کا تو خیال ہی نہ تھا۔ اب کھوپڑی پر آ کر سوار ہو گیا۔
تیری بہو بُرا تو نہ منائے گی!
دیپک " وہ مجھ سے زیادہ خوش ہو رہی ہے! کہتی ہے شکر ہے کوئی
بڑا گھر میں آیا"۔
لیکن خوشی کا حال رات کو کھلا۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ سُورداس
کی نیند کھُل گئی۔ دیپک اور رُوپ کنور ساتھ کے کمرہ میں آہستہ آہستہ
باتیں کر رہے تھے۔ اندھوں کے کان بہت تیز ہوتے ہیں۔ سورداس نے
ایک ایک لفظ سُن لیا۔ رُوپ کنور کہہ رہی تھی " عجب مصیبت میں
پھنسے۔ کیا کریں؟
دیپک بولا " میں نے اسی لئے کبھی چھٹی نہ لکھی تھی کہ ڈر تھا چلا آئیگا
رُوپ کنور " کہہ دو۔ وہیں چلا جائے۔ ہم پانچ روپیہ ہر مہینے بھیج دیا
کریں گے"۔
دیپک " اندھا کبھی نہ مانے گا"۔
رُوپ کنور " میں بٹھا کر پراٹھے کھلاؤں۔ یہ مجھ سے بھی نہ ہو گا"۔
دیپک " یار دوست پوچھیں گے یہ کون ہے۔ تو کیا کہوں گا"۔
رُوپ کنور ہنس پڑی " کہہ دینا۔ میرے والد شریف ہیں اور کیا!"
دیپک " ساٹھ ستر سال کا ہو گیا۔ موت بھی نہیں آتی۔ ابھی دس سال
سے پہلے نہ مرے گا"۔

سُورداس کو ایسا معلوم ہُوا جیسے اُس کی چارپائی اُس کے نیچے سے نکلی جاتی ہے۔ جیسے اُس کے دل پر کسی نے ہزاروں من کا پتھر رکھ دیا ہے۔ وہی لڑکا جسے اُس نے ایسے لاڈ چاؤ سے پالا تھا جس کے لئے اُس نے رات دن ایک کر دیا تھا۔ جس کو پڑھانے کے لئے اُس نے اپنی خودداری کو فروخت کر دیا تھا۔ آج اُس کی موت کے لئے دُعائیں مانگ رہا تھا۔ جس کو اُس نے پندرہ سال کھلایا تھا۔ وہ اُسے ایک دن بھی نہ کھلا سکا ؛

سُورداس نے دبے پاؤں اُٹھ کر اپنی لاٹھی لی۔ اور نہایت آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ جگہ نئی تھی۔ رستہ معلوم نہ تھا۔ قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا تھا۔ قدم قدم پر گرتا تھا۔ لیکن چلا جاتا تھا۔ کہاں؟ کس کے پاس؟ یہ وہ خود بھی نہ جانتا تھا۔ نہ اس کی طرف اُس کا خیال تھا۔ وُہ صرف یہ چاہتا تھا کہ دیپک کے گھر سے دُور نکل جائے ؛

تھوڑی دیر بعد بڑے زور سے بجلی کڑکی اور اس کے ساتھ ہی مُوسلادھار برکھا ہونے لگی۔ لیکن سُورداس اب بھی اُسی طرح گرتا، پڑتا، ٹھوکریں کھاتا بھاگا چلا جارہا تھا۔ جیسے کوئی گرفتار کرنے کے لئے اس کا تعاقب کر رہا ہو۔ ساری رات بارش ہوتی رہی۔ ساری رات سُورداس اِدھر اُدھر بھاگتا رہا ؛

دُوسرے دن پولیس کو سڑک پر ایک اندھے فقیر کی لاش ملی ؛

دُلہن کی ڈائری

۳۔ ستمبر ۱۹۲۱ء

پرماتما کا لاکھ لاکھ شکر ہے، جو اِس قدر عُمدہ گھر ملا۔ گھر کا ہے کو ہے، اچھّا خاصہ محل ہے۔ کسی شے کی کمی نہیں، سبھی کچھ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میری قسمت کھل گئی ہے۔ مجھے سورگ مل گیا ہے۔ میں جو کچھ چاہتی تھی۔ بیاہ سے پہلے میں نے پرماتما سے ہاتھ باندھ کر جس جس چیز کے لئے دُعا کی تھی۔ مجھے اُس سے بھی زیادہ مل گیا۔ گھر سے وداع ہوتے وقت جو پریشانی، جو فکر، جو اضطراب تھا اب نام کو بھی نہیں۔ میری ساس بہت ہنس مُکھ ہیں۔ ہمیشہ چہرہ شگفتہ رہتا ہے۔ مجھے دیکھ کر بیحد خوش ہوئیں اور بولیں۔ یہ تو بڑی بہو سے بھی خوبصورت ہے۔ دیکھ کر بھوک مٹتی ہے۔ دن میں کئی کئی مرتبہ آ کر دریافت کرتی ہیں۔ کوئی تکلیف تو نہیں۔ جس چیز کی ضرورت ہو مانگ لینا۔ شرم نہ کرنا۔ یہ تیرا گھر ہے۔ کھانا کھانے کے وقت سامنے آ بیٹھتی ہیں۔ اور بہت

اصرار سے کھلاتی ہیں۔ دوپہر کو باجہ لا کر سامنے رکھ دیتی ہیں۔ اور کہتی ہیں۔ بجا۔ لاکھ انکار کرتی ہوں۔ لیکن کون سُنتا ہے؟ ہار کر بجانا پڑتا ہے۔ اُس وقت اُن کا چہرہ خوشی سے منور ہو جاتا ہے۔ اتنی محبّت، اتنی عزت اپنے گھر میں بھی نہ تھی۔ سُسر جی بھولے ناتھ ہیں۔ ساس جو چاہیں، کریں۔ کیا مجال جو کسی بات میں دخل دے جائیں؟ دونوں وقت کھانا کھانے آتے ہیں۔ اور پھر مردانہ میں چلے جاتے ہیں۔ البتّہ اِس قدر دونوں وقت پُوچھ لیتے ہیں۔ چھوٹی بہو اُداس تو نہیں ہو گئی۔ ساس جی مُسکرا کر جواب دیتی ہیں تم اپنا حقّہ پیو۔ تمہاری چھوٹی بہو کے لئے میں کافی ہوں۔ جٹھیانی جی بہت خوش مزاج ہیں۔ چند ہی دن میں مجھ سے شیرہ شکّر کی طرح گھُل مِل گئی ہیں۔ سارے سارے دن پاس بیٹھی رہتی ہیں رات کو بھی دس بجے سے پہلے پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ جیٹھ جی بمبئی میں کہیں مُلازم ہیں۔ پانسو کے قریب تنخواہ پاتے ہیں۔

باقی رہ گئے وُہ۔ ان کے متعلق کیا لکھوں۔ نہایت خوش مذاق آدمی ہیں۔ بات بات میں ہنستے ہیں اور ہنساتے ہیں۔ ایسا ہنس مُکھ، ایسا شریف مزاج، ایسا بذلہ سنج آدمی میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اُن کے چہرے پر ہر وقت مُسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے۔ جیسے مُسکراتی ہوئی تصویر ہو جو کبھی غمگین نہیں ہوتی۔ مصوّر نے ایک بار مُسکراتے ہوئے بنا دیا۔ اب سدا مُسکرا رہی ہے۔ یہی حالت اُن کی ہے۔ اپنی بھابی سے بہت پیار ہے۔ آتے ہیں تو دروازے ہی سے بھابی، بھابی چلّانا شروع

کر دیتے ہیں۔ اُس کی ایک ایک بات کی تعریف کرتے ہیں کہتے ہیں ایسی بھابی شہر بھر میں کسی کی نہ ہوگی۔ بھابی بھی اُن کو بہت چاہتی ہیں۔ اُن کی ذرا ذرا سی بات کا خیال رکھتی ہیں۔ اُن کی یہ پاکیزہ محبّت دیکھ کر مَیں کسی دوسری دُنیا میں پہنچ جاتی ہوں۔ یہ بھابی دیور کی محبت نہیں۔ ماں بیٹے کا پیار ہے۔ یہ دُنیوی رشتہ نہیں۔ بہن بھائی کا تعلق ہے۔ کیسا پاکیزہ! کیسا اُونچے درجہ کا! کیسا من کو موہ لینے والا!!!

۲۷۔ ستمبر ۱۹۲۱ء

آج مجھے سُسرال میں آئے ہوئے پُورا ایک مہینہ گزر گیا۔ اس عرصہ میں ایک مرتبہ بھی محسُوس نہیں ہُوا۔ کہ مَیں کسی غیر جگہ میں ہوں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اپنے گھر میں بیٹھی ہوں۔ البتہ اتنا فرق ہے کہ میری قدر و قیمت پہلے سے بڑھ گئی ہے۔ اب میری بھی اپنی، الگ ہستی ہے۔ اس کے علاوہ میری دُنیا میں ایک نئے وجود کا اضافہ ہُوا ہے۔ اور یہ وجود چند ہی دنوں میں میری ہستی کا ایک جزو بن گیا ہے۔ ـــــــ وہ مجھے کتنا چاہتے ہیں۔ مجھے دیکھ کر اُن کی کیا حالت ہوتی ہے؟ مجھے دیکھ کر شرارت سے کس طرح مُسکراتے ہیں؟ گھر کا کوئی آدمی آجائے۔ تو کس طرح بھولے بھالے بن کر دُوسری طرف دیکھنے لگتے ہیں؟ یہ باتیں ایسی نہیں کہ ان پر غور کروں اور سینہ میں مسرّت کی ولولہ انگیز گُدگُدی نہ ہونے لگے۔ الگ جا بیٹھوں جب بھی اُدھر سے گزرنے کا بہانہ بنالیتے

ہیں۔ اور ظاہر یہ کرتے ہیں کہ اُن کا میری طرف دھیان ہی نہیں ہے حالانکہ اُن کی واحد آرزو یہ ہوتی ہے کہ کسی صورت آنکھیں چار ہو جائیں۔ خود میری یہ حالت ہے، کہ چاہتی ہوں، پاس ہی بیٹھے رہیں اور باتیں کرتے رہیں۔ میں تو یہ بھی نہیں چاہتی، کہ وہ دفتر بھی جائیں۔ اُن کی غیر حاضری میں دل اُداس سا ہو جاتا ہے۔ جب اُن کے آنے کا وقت ہوتا ہے تو نگاہیں بار بار دروازے کی طرف اُٹھنے لگتی ہیں۔ جانتی ہوں گھر کے لوگ آنکھیوں سے دیکھ رہے ہیں ضرور دل میں ہنستے ہونگے۔ شاید سوچتے ہوں، کیسی بے حیا ہے، ذرا خیال نہیں کرتی۔ لیکن کیا کروں دل نہیں مانتا۔ کبھی کبھی ایسا شبہ ہوتا ہے، گویا ان کو برسوں سے جانتی ہوں۔ گویا ہم دونوں ہمیشہ ایک ساتھ رہے ہیں۔ کبھی ایک دن کے لئے بھی علیحدہ نہیں ہوئے۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے "پرکاش! تم نے مجھ پر جادو تو نہیں کر دیا۔ جی چاہتا ہے۔ دن رات تمہارے پاس ہی بیٹھا رہوں۔ جی چاہتا ہے ہر وقت تمہیں ہی دیکھتا رہوں" میرا چہرہ شرم سے سُرخ ہو گیا۔ کیا جواب دیتی، سر جھکا کر چپکی ہو رہی۔ پھر آہستہ سے میرا ہاتھ پکڑ کر بولے۔ تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے، صاف صاف کہہ دو۔ میں نے سر اُٹھا کر جواب دیا "مجھے ذرا بھی تکلیف نہیں" اس وقت میری آنکھیں اُن کی آنکھوں سے مل گئیں۔ کیسے شرارتی ہیں! اتنی سی بات پر مسکرانے لگے۔ میں شرما گئی۔ اور ہاتھ چھڑا کر ایک طرف ہٹ گئی ٭

مگر انہوں نے اپنا ہاتھ پھر آگے بڑھا دیا۔ اور بولے "میم صاحبہ شیک ہینڈ کرو"۔

مَیں نے ان کا ہاتھ پرے جھٹک دیا اور مُنہ پھیر لیا +

اس پر نہایت سنجیدگی سے، جیسے لیکچر دے رہے ہوں، بلند آواز میں بولے "صاحبان! آپ اِس امر کے گواہ ہیں۔ کہ ہماری میم صاحبہ نے اِس جگہ، روزِ روشن میں ہماری توہین کی ہے۔ اور ہمارا نہایت ہی نازک ہاتھ دُکھا دیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ اگر عورتوں کی آزادی پر بندشیں عائد نہ کی گئیں تو ہندوستان کے معزّز شوہروں کو سخت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا"۔

مَیں نے ہنستے ہنستے اُن کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا "آپ کیا غضب کرتے ہیں؟ کوئی سُن لیگا تو کیا کہیگا؟"

اِتنے میں باہر کسی کے پاؤں کی چاپ سُنائی دی۔ مَیں نے گھونگھٹ مُنہ پر کھینچ لیا۔ اور دروازہ کی طرف پیٹھ کرکے کھڑی ہوگئی۔ یہ اُن کی بھابی تھیں۔ کھانس کر کمرہ میں آگئیں۔ اور مُسکرا کر بولیں "کیوں کنھیا! کیا ہو رہا تھا؟ اور تیرا چہرہ سُرخ کیوں ہو رہا ہے؟"

میرا خیال تھا وہ شرم سے سر نہ اُٹھا سکیں گے۔ اُن سے کوئی جواب نہ بن پڑے گا۔ مگر میرا خیال غلط نکلا اُنہوں نے تڑسے جواب دیا "اِس عورت نے تھپڑ مارا ہے"۔

بھابی ہنس پڑیں مگر میرا تو ہنسی کے مارے بُرا حال تھا۔ لوٹی جاتی

تھی۔ میں نے دوپٹہ کا آنچل مُنہ میں ٹھونس لیا۔ مگر ہنسی رُکتی نہ تھی۔ انہوں نے میری طرف اشارہ کرکے بھابی سے پُوچھا" کیوں بھابی! اِس غریب کو کچھ کھانے کو بھی ملتا ہے یا نہیں؟ میرا خیال ہے نہیں ملتا۔ جبھی تو کپڑے کھاتی رہتی ہے۔ دیکھ لو آدھا دوپٹہ کھا چکی ہے"۔

بھابی" اب تُو سامنے بیٹھ کر کھلایا کر"۔

وُہ" افسوس! ہماری میم صاحبہ کی کوئی پروا نہیں کرتا"۔

بھابی" اِس کام کے لئے اکیلا تُو کافی ہے"۔

وُہ" نہ بھابی مجھ سے یہ کام نہ ہوسکے گا۔ کون کام بھی کرے تھپڑ بھی کھائے"۔

بھابی" تو اِس کے سوائے اور کسی قابل ہے ہی نہیں۔ یہ کام بھی نہ کریگا تو اور کیا کرے گا؟"

وُہ" اِس عورت سے باجا سیکھا کروں گا۔ کیوں پروفیسر صاحب! آپ کو ہمیں شاگرد بنانے میں کسی قسم کا اعتراض تو نہیں ہے؟"

مَیں ہنستی بھی تھی اور حیران بھی تھی۔ کہ کیسے آدمی ہیں۔ ذرا نہیں شرماتے۔ بھابی نے کہا" تو گانا کیا خاک سیکھے گا۔ تیرے نصیبوں میں یہ شئے نہیں"۔

وُہ" واہ نصیبوں میں کیوں نہیں؟ کیا یہ ہماری بیوی نہیں ہے؟ جب چاہیں باجہ بجنے لگے، جب چاہیں ہمارا کمرہ شیریں نغموں سے گونجنے لگے۔ اب تم جانو۔ ہم ٹھہرے بڑے آدمی۔ ہمیں خود اِس

ہمدردی کی ضرورت ہی کیا ہے؟ یہ بیٹھ کر گائے گی ہم آرام کرسی پر لیٹ کر سنیں گے۔ کیوں بھابی!"

اِس فقرہ میں کیسی محبّت تھی، کیسی یگانگت۔ میرے جسم میں مسرّت کی بجلی سی دَوڑ گئی۔ ایسا معلوم ہُوا جیسے دُنیا کی تمام خوشیاں میرے ہی لئے ہیں۔ جیسے میرے چاروں طرف محبّت کے پھُول کِھلے ہوئے ہیں ؛

۱۳۔ نومبر ۱۹۲۱ء

وائے نصیب! کیا سمجھا تھا، کیا ہو گیا؟ اِس سے تو مر جانا ہی اچھّا۔ لیکن مجھے موت بھی نہیں آتی۔ جو اِس مصیبت کی زندگی سے نجات ملے۔ جب دیکھو بھابی! جہاں دیکھو بھابی! آخر صبر کی بھی کوئی حد ہے۔ جی چاہتا ہے گھر کو آگ لگا کر کہیں نکل جاؤں۔ سُکھ نہ ہو گا۔ کر چھاتی پر کوئی مونگ دلنے والا بھی تو نہ ہو گا۔ مانگ کر کھا لوں گی۔ کسی سکول میں لڑکیاں پڑھا کر گزارہ کر لوں گی۔ لیکن اِس گھر میں نہ رہوں گی۔ میں بھی کیسی سادہ لوح ہوں۔ بھابی بھابی کہتے زبان سُوکھتی تھی۔ یہ خیال ہی نہ تھا کہ در پردہ میری سُوت بنی ہوئی ہے۔ اُس دن کیسی محنت اور محبّت سے کھانا تیار کیا تھا۔ دو گھنٹے انتظار میں بیٹھی رہی۔ کھانے بیٹھے تو پُوچھا کیسا بنا؟ میری تعریف تو کیا کرنا تھی؟ بھابی کا پکھان لے بیٹھے۔ بولے۔ کھانا تو بھابی بناتی ہے۔ اس کے پکے ہوئے کھانے میں جو لذّت، جو حلاوت ہے، وہ مجھے اور کہیں نہیں ملتی۔ مجھے زہر چڑھ گیا ہے۔ جی چاہتا تھا،

سر دیوار کے ساتھ دے ماروں۔ تعریف کے دو کلمے کہہ دیتے، تو اُن کا کیا بگڑ جاتا؟ میرا حوصلہ بڑھ جاتا۔ مَیں بھی سمجھتی، میری محنت کی داد دینے والا کوئی ہے۔ لیکن نہیں مجھے جلاتے ہیں۔ مجھے جلانے میں انہیں مزہ ملتا ہے۔ کبھی بھابی کی چیز کی بھی مذمت کر دیں۔ پھر دیکھیں کیسا آڑے ہاتھوں لیتی ہے۔ بولنے نہ دے۔ مُنہ بند کر دے۔ بات کرنے کی روادار نہ ہو۔ ایک مَیں ہوں، کہ جو کہتے ہیں سر جُھکا کر سُن لیتی ہوں۔ جبھی تو روز بروز شیر ہوتے ہیں ؛

پرسوں بھابی نے کہا، پرکاش لڑکے کے لئے فراک سی دے۔ پہلے تو دل خیال آیا۔ کہ کہہ دوں کہ مجھے فرصت نہیں۔ خود ہی نہ سی لو۔ لیکن پھر سوچا۔ چلو سی دو۔ بیکار بیٹھے رہنے سے میرے ہاتھ بڑھ تو نہ جائیں گے۔ دو تین گھنٹے تک مشین چلاتی رہی جب تیار ہُوا تو اعتراض شروع کر دیئے۔ یہ کاٹ غلط ہے، یہ سلائی موٹی ہے۔ لیس ٹھیک نہیں لگی اور یہ پھل تھا میری تین گھنٹے کی محنت کا۔ کوئی پُوچھے کیا سلائی ٹیڑھے کر سلایا تھا؟ جو اس قدر باریک باتیں دیکھنے چلی تھی۔ ان سے کہا تو انہوں نے بھی بھابی کی حمایت کی۔ بولے۔ ٹھیک کہتی ہے۔ خود بہت اچھا سیتی ہے۔ اُس کے ہاتھ کے سلے ہوئے کپڑے دیکھو تو دنگ رہ جاؤ۔ کوئی قابل درزی بھی ایسی سلائی کر سکتا ہوگا۔ مجھے اس میں شبہ ہے۔ جبھی اُسے تمہارا سلا ہُوا فراک پسند نہیں آیا۔ اب کوئی کام بتائے تو صاف کہہ دُوں گی۔ زہے تمہارے ہاتھوں میں مہندی نہیں لگی ہے خود

کرلو۔ کام بھی کروں، پھر تمہاری جلی کٹی بھی سُنوں، اِتنی رواداری مجھ میں نہیں ہے!

کل رات سینما دیکھنے گئے۔ دو مقامات ایسے آئے، جہاں مضمون ذرا صاف نہ تھا۔ میری جو بدبختی آئی۔ تو اُن سے پُوچھ بیٹھی۔ بس ان کو موقع مل گیا۔ لگے بھابی کی تعریف کرنے۔ بھابی کبھی نہیں پُوچھتی۔ سارا مضمون خود بخود سمجھ لیتی ہے۔ نہایت ذہین ہے۔ سینما کی باریک سے باریک باتوں کو بھی ایسا سمجھتی ہے کہ تم سے کیا کہوں۔ وُہ تو کسی سینما کمپنی کی ڈائرکٹر بن سکتی ہے۔ یہ کاش! شاید تم اسے مبالغہ سمجھو لیکن یہ امر حقیقت ہے کہ بھابی کا مذاق ادبی بھی بہت بلند اور پاکیزہ ہے۔ یہ سُننا تھا۔ کہ میرے بدن میں آگ سی لگ گئی۔ لیکن کیا کر سکتی تھی؟ باقی وقت جب تک بیٹھی رہی رویا کی۔ لیکن وہ مزے سے تصویریں دیکھتے رہے بھابی ایک آنسو بھی گرا دے تو ساری رات نیند نہ آئے۔ دس مرتبہ اُٹھ کر دیکھیں سو گئی ہے یا نہیں۔ ایک میں ہوں کہ رو رو کر اندھی بھی ہو جاؤں جب بھی اُمید نہیں کہ اُٹھ کر جھوٹوں دو میٹھے لفظ ہی کہہ دیں۔ انہیں باتوں نے تو میری زندگی کی خوشیاں برباد کر دی ہیں۔ شاید وہ سمجھتے ہونگے میں بالکل اندھیرے میں ہوں۔ لیکن ان کا خیال غلط ہے۔ میری نگاہوں نے سب کچھ بھانپ لیا ہے۔ مُنہ سے نہ بولوں یہ اور بات ہے مگر سمجھتی سب کچھ ہوں۔

ہائے افسوس! میرا گھر میری آنکھوں کے سامنے جل رہا ہے۔

اور میں کچھ کر نہیں سکتی۔ انسانی بے بسی کی ایسی مثال کسی نے کم دیکھی ہوگی +

۲۴۔ نومبر ۱۹۲۱ء

میرا شُبہ درست نکلا +

اب میرے لئے دُنیا میں باقی کچھ بھی نہیں رہ گیا ہے۔ میں کامل طور پر تباہ ہو گئی۔ میں نے غریب سے غریب اور کنگال سے کنگال عورتیں دیکھی ہیں۔ مگر مجھ سے وہ بھی خوش نصیب ہیں۔ اُن کے پاس زیور نہیں ہیں۔ بیش قیمت کپڑے نہیں ہیں۔ لیکن اُن کے پاس دل کا قرار اور امن کی نیند تو ہے۔ میرے پاس وہ بھی نہیں۔ وہ پیٹ بھرنے کے لئے شب و روز محنت و مزدوری کرتی ہیں اس کے باوجود بعض دفعہ انہیں فاقہ کشی کرنا پڑتی ہے۔ بعض ایسی بھی ہیں جن کے شوہر قمار بازی کی قبیح عادت میں گرفتار ہیں۔ بعض کو شراب کا چسکا ہے لیکن انہیں کم از کم اِس قدر تسلّی ہے کہ شوہر ہمارے اور محض ہمارے ہیں۔ ان پر کسی دوسری عورت کا حق نہیں۔ وُہ کسی دوسری عورت کی خاطر ہم سے لڑنے کو تیار نہ ہوں گے۔ لیکن میری زندگی اِس مسترت سے بھی محروم، میرا دل اِس لذت سے بھی نا آشنا ہے۔ ہائے افسوس! میرے پاس سب کچھ ہے، لیکن میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے +

وُہ اب بھی بدستورِ سابق بات بات میں بھابی کا ذکر کرتے ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے دل میں بس گئی ہے۔ اُس کے سوائے وہاں

اور کسی کے لئے گنجائش ہی نہیں ہے۔ میں ان کے دل میں اسی طرح رہتی ہوں جیسے چند دن کے لئے کوئی مہمان آجائے صاحب خانہ اُسے ٹھہرا لیتا ہے، اُس کی خاطر تواضع بھی کرتا ہے۔ اُس کے ساتھ ہنستا کھیلتا بھی ہے۔ لیکن دل میں ہمیشہ کڑھتا رہتا ہے کہ اب یہ چلا کیوں نہیں جاتا؟ آخر کب تک پڑا رہے گا؟ منہ سے کہے یا نہ کہے۔ چہرہ صاف کہہ دیتا ہے کہ اب یہ خوش نہیں ہے۔ لیکن صاحب خانہ کی بیوی بعض وقت صاف صاف کہہ دیتی ہے۔ میں بھی اسی طرح کا بے بُلایا مہمان ہوں۔ جسے کھانا کپڑا سبھی دیتے ہیں عزّت سے کوئی بھی نہیں دیکھتا۔ مائکے چلی جاؤں نہ آنکھوں سے دیکھوں گی۔ نہ دل میں جلن ہو گی۔ گھر والے تو پہلے ہی بُلا رہے ہیں۔ لیکن ایک سہیلی نے رائے دی۔ یہ حماقت نہ کر بیٹھنا۔ نہیں تو بعد میں روئے گی۔ بات معقول ہے۔ میں نے روانگی کا ارادہ ترک کر دیا۔

اب بھابی بھی سمجھ گئی ہے کہ مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ وہ پہلے کا سا ارتباط نہیں رہا۔ اب مجھ سے کھنچی کھنچی رہتی ہے۔ ایسے جیسے میں نے اُن کو کوئی بہت بڑا نقصان پہنچایا ہو۔ میری طرف جب کبھی دیکھتی ہے قہر کی نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ ماں جی بھی ناخوش رہتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے بھابی نے ان کے بھی کان بھر دیئے۔ ورنہ میں نے انہیں شکایت کا کبھی موقعہ نہیں دیا۔ شاید اگر میں ایک مرتبہ ان کے سامنے جا کر دردِ دل کا اظہار کر دوں تو ان کا طرزِ عمل تبدیل ہو جائے۔ لیکن کیوں؟ وہ مجھ سے کیوں نہ پوچھیں کہ تجھے کیا تکلیف ہے؟ یقیناً میری پیش قدمی میری

کمزوری سمجھی جائیگی۔ مَیں انہیں دکھا دوں گی کہ مَیں تم میں سے کسی کی بھی پروا نہیں کرتی۔ تم مجھ سے ایک گز دُور بھاگو۔ مَیں تم سے۔ مَیں تم سے چار گز دُور بھاگوں گی ⁂

چار دن سے بیمار پڑے ہیں۔ روز ڈاکٹر آتا ہے۔ لیکن افاقہ نہیں ہُوا۔ پرماتما کرے جلد تندرست ہو جائیں۔ میری دُنیا اُنہیں کے دم قدم سے ہے۔ چارپائی پر پڑے دیکھتی ہوں تو کلیجہ کانپ جاتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے مدت سے بیمار رہیں۔ ماں جی دن میں ایک دو مرتبہ آ کر دیکھ جاتی ہیں۔ لیکن بھابی کبھی نہیں آئی۔ کیسی سنگ دل ہے۔ ایک ہی مکان میں رہتے ہیں پھر بھی یہ بے پروائی!

خیر مضائقہ نہیں ⁂

۲۷۔ نومبر ۱۹۲۱ء

کل بُخار اور بھی تیز ہو گیا۔ سارا دن بیہوش پڑے رہے۔ ایک مرتبہ بھی آنکھ نہ کھولی۔ مَیں پاس بیٹھی روتی رہی۔ ماں جی قریباً سارا دن میرے ہی کمرہ میں بیٹھی رہیں۔ اور مجھے تسلی دیتی رہیں۔ لیکن میرے دل میں جانے کیا ہو رہا تھا! ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے کوئی جانور میرے کلیجہ کو پنجوں سے کرید رہا ہے۔ جیسے میرا دل اتھاہ تاریکی میں ڈوبا جا رہا ہے۔ جیسے دُنیا میں میرے لئے یاس کے سوائے اور کچھ باقی نہیں رہ گیا ⁂

اُن کے زرد کمزور چہرہ کی طرف دیکھ کر ڈر لگتا تھا۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے تھے۔ بار بار سوچتی تھی۔ کیا ہونے والا ہے؟ کبھی کبھی ایک ایسا ہولناک اور سیاہ تصوّر آ کر رُوبرو کھڑا ہو جاتا تھا کہ آنکھوں تلے اندھیرا چھا جاتا تھا اور درو دیوار گھومتے نظر آتے تھے۔ ماں جی نے مجھے اندوہگین دیکھا تو اُن کی ساری خفگی آنِ واحد میں دُور ہو گئی۔ دیر تک مجھے گود میں لئے بیٹھی رہیں اور پیار کرتی رہیں۔ گویا میں چھوٹی سی لڑکی تھی جو ماں کی گود میں بیٹھی اُس کی محبّت سے کھیل رہی ہو۔ یہ محبّت کتنی پاکیزہ تھی کتنی دل کی گہرائیوں سے نکلتی تھی۔ اسے لکھنا آسان نہیں۔ اسے کوئی مصوّر بھی بیان نہیں کر سکتا۔ اسے صرف محسُوس کیا جا سکتا ہے۔ مجھے بعض اوقات ایسا محسُوس ہوتا تھا، کہ یہ میری ساس نہیں ہے، ماں ہے۔ ایسی ساس کو خفگی کا موقعہ دینا میری حماقت تھی۔ کاش پہلے ہوش آ جاتا تو اتنے دن نہ جلتی، نہ جلاتی۔ لیکن بھابی نے کمرہ میں پاؤں بھی نہ رکھا۔ البتہ لڑکے کو ایک دو مرتبہ کمرہ میں بھیجا کہ دیکھ آ کیا حال ہے؟ ایسی سنگدلی بھی کس کام کی؟ وُہ اِسے اتنا چاہتے ہیں۔ ان بی بی کو پرواہ ہی نہیں ہے۔ شاید ڈرتی ہو۔ کہ کمرہ میں چلی گئی۔ تو کہیں خود بیمار نہ ہو جائے۔

جب شام ہوئی تو اسے بیمار دیور کا خیال آیا لڑکے کو گود میں لئے ہوئے آ کر اُن کے پلنگ کے پاس کھڑی ہو گئی اور بولی اللہ کیوں پر کاش: ماں جی کہتی ہیں۔ آج سارا دن ہوش نہیں آیا۔ اب کیا حال ہے؟ کچھ بخار ہلکا ہُوا یا نہیں؟

مجھے ایسا معلوم ہُوا۔ جیسے پیٹ سے آگ کا ایک شعلہ اُٹھ کر مُنہ کی طرف آ رہا ہے۔ لیکن اُسے دبا کر کہا ؛ ابھی تک تو ہلکا نہیں ہُوا۔ ہو جائیگا "

بھابی نے اُن کے چہرے کی طرف دیکھا اور گھبرا گئی۔ بولی " اتنا کمزور ہو گیا ہے ؟ مجھے یہ خیال نہ تھا "

نہیں۔ (ڈھائی سے) بیمار ہو کر کمزور نہ ہونگے تو کیا موٹے ہو جائیں گے۔ بخار اُتر جائے یہی غنیمت ہے۔ بیٹھ جاؤ۔ کھڑی کب تک رہو گی ؟"

بھابی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے لڑکے کو کرسی پر بٹھا دیا اور خود پلنگ پر جُھک کر اُن کو بغور دیکھنے لگی۔ معاً اُنہوں نے کروٹ بدلی اور بیہوشی کے عالم میں کہا " بھابی !

بھابی نے ان کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا " کیوں کنھیا ! میں تیرے پاس کھڑی ہوں "

انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ بھابی کی طرف دیکھا اور کراہ کر بولے " سر پھٹا جاتا ہے۔ بھابی ! بڑی تکلیف ہے "

یہ کہہ کر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں

بھابی " پرکاش سے کہوں، تیرا سر دبا دے ؟"

وہ۔ (پھر آنکھیں کھول کر) تیرے ہاتھ نہیں کیا ؟ جو تُو پرکاش سے کہے گی۔ وہ بیچاری تو دن رات میرے پاس بیٹھی رہتی ہے۔ تجھ سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا تو جا اپنے کمرہ میں بیٹھ ! ماں جی کہاں ہیں ؟"

بھابی اُن کے پلنگ پر بیٹھ گئی اور چُپ چاپ سر دابنے لگی - شاید کوئی اسے مبالغہ سمجھے - لیکن یہ مبالغہ نہیں ہے - بھابی جتنے زور سے ان کا سر دابتی تھی اُس سے دُگنے بلکہ سہ گُنے زور سے میرا کلیجہ دبا جا رہا تھا - سینہ میں آگ سی لگی ہوئی تھی - جی چاہتا تھا خودکشی کر کے مر جاؤں - کس قدر افسوسناک امر ہے - جس کے لئے ہم دن کا آرام اور رات کی نیند حرام کر دیں وہ بیگانوں کے سامنے ہماری یُوں توہین کرے - اور اغیار پر اپنا حق جتائے!

اتنے میں انھوں نے بھابی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولے - "اب میرا بخار بہت جلد اُتر جائیگا بھابی! اگر تُو نے میرا بائیکاٹ نہ کیا ہوتا - تو میں اب تک کبھی کا تندرست ہو چکا ہوتا چلی تھی ہیکڑی جتانے - آخر جھک مار کر ہار ماننی پڑی یا نہیں؟

میرے تن بدن میں اور بھی آگ لگ گئی؟

بھابی نے ایک مرتبہ میری طرف دیکھا اور پھر ان کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا" ہاں بابا! سو دفعہ ہار مانی - تم یہ بخار اُتارو +

اب مجھ سے برداشت نہ ہو سکا - اُٹھ کر باہر چلی گئی اور رونے لگی - لیکن میرے آنسو دیکھنے والا کون تھا؟

۵ - دسمبر ۱۹۲۱ء

میرے آنسو دیکھنے والا میرا پرماتما تھا - اُس نے میری بے بسی اور تنہائی کو دیکھا - اُس نے میرے چاروں طرف چھائی ہوئی تاریکی کو

دیکھا۔ اور میری زندگی کی کالی رات میں اُمید و مسرت کی صبح کا اُجالا بھیج کر مجھے جلا لیا۔

۲۷ - نومبر کی رات تھی۔ مَیں مرنے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ مرنے کے لئے یا زہر کی ضرورت ہے، یا ریل گاڑی کی پٹڑی پر سر رکھنے کی یا پستول کی یا پھانسی کے رسّے کی۔ میرے پاس کچھ بھی نہ تھا میرے سامنے صرف ایک ہی رستہ کُھلا تھا۔ نہایت آسان۔ نہایت سیدھا سادا۔ چھت پر سے کُود پڑوں اور روز روز کی جاں کاہ مصیبتوں کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر لوں۔ مَیں چھت کے کنارے کھڑی تھی۔ ذرا آگے بڑھتی، تو موت سے ہمکنار ہو جاتی۔ ذرا پیچھے ہٹ جاتی تو زندہ بچ رہتی۔ موت اور زندگی کو اِس قدر قریب مَیں نے کبھی نہ پایا تھا۔ صرف ایک قدم کا فاصلہ تھا۔ آگے موت تھی، پیچھے زندگی۔ لیکن میرے لئے موت میں زندگی کا سکون تھا، زندگی میں موت کی جلن۔ مَیں نے دل کڑا کر کے آگے قدم اُٹھایا۔ اور نیچے کی طرف جھانک کر دیکھا وہاں موت کا سکون اور اندھیرا تھا۔ میرا دل کانپ گیا۔ موت کا جو پُرتنویر اور بے خود بنا دینے والا تصوّر مَیں نے ذہن میں قائم کیا تھا۔ وہ اِس اتھاہ اندھیرے میں نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ شاعرانہ حقیقت کا سایہ تاریکی میں نظر نہ آیا۔ میرے پاؤں رُک گئے۔ موت بھی دُنیا کی دیگر چیزوں کی طرح دُور سے خوبصورت دکھائی دیتی ہے۔ لیکن جب اُس کے قریب پہنچتے ہیں تو اِس کا حُسن ڈر اور سہم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

مَیں وہیں مَوت اور زندگی کے عین درمیان بیٹھ گئی - اور صُورتِ حالی پر غور کرنے لگی - اب کیا کروں ؟ زندگی ناقابلِ برداشت تھی - مَوت ناقابلِ عبور - کدھر جاؤں ، اُمید کی زندگی اور زندگی کی اُمید کو کہاں تلاش کروں ؟ میرے لئے اِس وسیع دُنیا میں کہیں بھی جگہ نہ تھی - معاً مَوت نے پھر اپنے بازو پھیلائے اور مُسکرائی - پھر مرنے کو آمادہ ہو گئی - نامُرادوں کے لئے مَوت کے سوائے دُوسرا ہمدرد کون ہے ؟

یکایک خیال آیا چل کر بھابی سے دو دو باتیں کروں - اُس کو ایسی جلی کٹی سُناؤں ، کہ تلملا اُٹھے - کیا یاد کرے گی ؟ کرکسی نے کھری کھری سُنائی تھیں - ساری عاشقی معشُوقی بھُول جائے گی - اتنا سا مُنہ نکل آئیگا !

مَیں نیچے اُتر آئی اور بھابی کے کمرہ کی طرف چلی اِس وقت اگر وُہ سامنے آجاتی ، تو میری شعلہ بار آنکھیں اسے غصّہ کی آگ میں جلا کر بھسم کر دیتیں - لیکن ——

مَیں نے دیکھا وہ آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی - میرا کلیجہ سن سے ہو گیا - ایسا معلوم ہُوا جیسے کوئی ہیبت ناک راز بے نقاب ہونے کو ہے - مَیں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلی - دیکھوں یہ کہاں جاتی ہے ؟ کس کے پاس ؟ کس غرض سے ؟ ضرور کوئی خاص بات ہے ، کوئی چھُپی ہوئی غرض - کوئی گُناہ آلود مقصد - جس کے لئے ایسا وقت موزون سمجھا گیا ہے - مَیں اِنہیں خیالات میں محو اس کے پیچھے چلی جاتی تھی - کہ وہ ہمارے گھر کے پاس ہی جو مندر ہے - اُس کے اندر چلی گئی

اور دیوی کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوگئی۔ میں باہر چُھپی ہوئی اسکی پرارتھنا کا ایک ایک لفظ سُن رہی تھی۔ اُس نے لرزتی ہوئی آواز اور رونی ہوئی آنکھوں سے کہا۔ دیوی ماتا! میرے بیٹے کو شفا دے وہ میرا دیور ہے، لیکن میں نے اُسے سدا بیٹا سمجھا ہے۔ اُس کی نادان بیوی کا خیال کر۔ اس کی عمر کچی ہے۔ اس کی آنکھوں کی بے رونقی، دل کی بے قراری دیکھ اور اُس کا سہاگ بنائے رکھ۔ میں نے اسے بچپن سے کھلایا ہے، میرے حال پر رحم کر۔ اور اُسے لمبی عُمر دے۔ دیوی ماتا! میں مر جاؤں، مگر وہ زندہ رہے۔ یہی میری پرارتھنا ہے ٭

میری آنکھوں کے سامنے سے پردہ اُٹھ گیا۔ اب حقیقت میرے سامنے بے نقاب کھڑی تھی۔ کس قدر جان بخش، کتنی رُوح پرور۔ کیسی پُر تنویر۔ اُس کی مُسکراہٹ نے میرے من کے کواڑ کھول دیئے! بھابی اندر دیوی کے سامنے اُوندھے مُنہ گر کر رو رہی تھی۔ میں باہر تاریکی میں اپنے گھٹنوں کے بل کھڑی افسوس، ندامت اور خوشی کے ملے جُلے آنسو بہا رہی تھی۔ جو رُوحانی حظ ان آنسوؤں میں تھا، وہ بڑی سے بڑی خوشی میں بھی نہیں ٭

دُوسرے دن میں اور بھابی اُن کے پاس بیٹھی ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔ آج وہ مجھے عورت نہ معلوم ہوتی تھی۔ دیوی معلوم ہوتی تھی۔ جو دُنیا کی رہنمائی کے لئے سورگ سے اُتر آئی ہو۔ اب میں نے اُس کی رُوح دیکھ لی تھی۔ اب میں نے اُس کا دل پڑھ لیا تھا۔ اب میں نے اُس کا

پیار پا لیا تھا۔ اب وہ بدگمانی نام کو نہ رہی تھی۔ انہوں نے بھابی کی طرف دیکھا اور کہا "آج تم پھر اس کمرہ میں چلی آئیں۔ کیا تمہیں پرکاش کا ڈر نہیں؟"
بھابی "ڈر تو ہے لیکن تمہاری محبت نہیں مانتی"!
وہ "کیا مزے سے میری چارپائی پر بیٹھی ہے۔ کوئی دیکھ لے تو کیا کہے۔
کیوں پرکاش!
میں "کہنا کیا ہے جو ماں بیٹے کی آنکھیں بھی نہ پہچانے اُس کا من کھوٹا ہوگا"
وہ "اس کو کمرہ سے نکال دُوں تو کیسا رہے؟"
میں "مگر یہ تو میرے دل میں بیٹھ گئیں۔ وہاں سے کون نکالے گا؟"
انہوں نے میری طرف پُرمعنی انداز سے دیکھا اور کہا ارے! دل میں اسے بٹھا لیا تو مجھے کہاں بٹھاؤ گی؟"
میں "تمہارے لئے اِس دیوی کا دل کم نہیں ہے جو آرام تمہیں وہاں مل سکتا ہے اور کہیں نہ ملے گا"!
بھابی نے میری طرف محبت کی نگاہوں سے دیکھا اور پھر اُن کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔
میں سورگ میں پہنچ گئی۔

چین نگر کے چار بیکار

(۱)

کچھ زمانہ گزرا۔ شمالی ہندوستان میں دو پہاڑیوں کے درمیان ایک گلزار قطعہ آباد تھا۔ جس کا نام چین نگر تھا۔ اس کی آبادی پانچ چھ ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ یہاں کے لوگ بالکل سادہ لوح تھے۔ ہر ایک آدمی اپنا اپنا کام خود اپنے ہاتھ سے کرتا تھا اور کسی کو کسی سے کوئی شکایت نہ تھی۔ وہاں کے لوگ دن بھر محنت مشقت کرتے تھے۔ اِس لئے وہاں بیماریاں نہ تھیں۔ دوائیں نہ تھیں۔ شفا خانے نہ تھے۔ وہاں کے لوگ باہمی پیار و محبت سے رہتے تھے۔ اِس لئے وہاں عدالتیں نہ تھیں۔ وکیل نہ تھے۔ جیل خانے نہ تھے۔ وہاں کے لوگ اپنی کمائی پر صابر اور شاکر تھے۔ اِس لئے وہاں چوریاں نہ ہوتی تھیں۔ نہ وہاں پولیس تھی۔ نہ تلواریں۔ بندوقیں اور توپیں تھیں۔ وہاں کے لوگ پرہیزگار تھے۔ اِس لئے وہاں نہ فاحشہ عورتیں تھیں نہ شراب تھی۔ نہ قتل و خون کے مقدمے تھے۔ یہاں کے لوگ انتہا درجہ کے مہمان نواز تھے۔ اِس لئے وہاں نہ سرائیں تھیں نہ

دھرم سالے تھے۔ نہ ہوٹل تھے۔ غرضیکہ وہاں کے لوگ سیدھے سادے تھے۔ اور محنت و مشقّت کے موٹے قانون کے سوائے دُوسرا کوئی قانون وہاں رائج نہ تھا۔ وہ قانون یہ تھا کہ جو محنت کرے۔ کھائے۔ جو بیکار رہے۔ بھُوکا مرے۔ سب کام کرتے تھے۔ صرف چار آدمی ایسے تھے۔ جن کو کام کرنے سے عار تھا۔ وُہ بھُوکے مرتے تھے اور لوگوں کی خیرات پر بے شرموں کی زندگی بسر کرتے تھے۔ آخر ایک دن لوگوں نے انہیں گاؤں سے باہر نکال دیا۔ اب وہاں سب کام کرنے والے تھے۔ بیکار کوئی بھی نہ تھا؛

لیکن شیطان کو غیر مہذّب بیوقوفوں کی یہ چھوٹی سی دُنیا پسند نہ آئی اور اُس نے عزم کر لیا۔ کہ میں اسے مہذّب بناؤں گا اور یہاں کے رہنے والوں پر اقبال اور ترقّی کے دروازے کھول دُونگا؛

(۲)

دُوسرے دن شیطان کے حکم سے ایک خوبصورت اور متموّل سوداگر چین نگر میں داخل ہُوا اور سارے گاؤں میں گھُومنے کے بعد بولا: "افسوس! تم لوگ بالکل بدتہذیب اور گنوار ہو۔ پتہ نہیں۔ اِس حال میں تم جیتے کیونکر ہو؟"

لوگوں نے یہ فتویٰ (؟) سُنا اور حیران ہو کر سوداگر کا مُنہ تکنے لگے؛

سوداگر نے کہا "میں نے تمام دُنیا کا سفر کیا ہے اور میں نے نہایت عجیب و غریب اشیاء دیکھی ہیں۔ لیکن ایسا مُفلس اور تباہ حال گاؤں میں نے اور کہیں نہیں دیکھا"؛

لوگوں نے یہ سُنا اور کہا "افسوس! ہمیں یہ معلوم بھی نہ تھا کیا ہم

اب مہذب نہیں بن سکتے"؟

سوداگر بولا "مجھے چار آدمی دیدو۔ اور میں تمہارے گاؤں کے ایک ایک آدمی کو مہذب بنا دوں گا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ آدمی بیکار رہیں"۔

چمپن نگر میں ایک بھی بیکار نہ تھا۔ لوگ مایوس ہو گئے۔ اور بولے۔ "افسوس ہمیں معلوم نہ تھا کبھی ہم کو بیکاروں کی بھی ضرورت پڑ جائے گی ورنہ ہم اُنہیں گاؤں سے کبھی نہ نکالتے۔ لیکن سوداگر نے ہمّت نہ ہاری اور اپنی ملازمت کے لئے اُنہی میں سے چار آدمیوں کو منتخب کر لیا۔ اس نے انہیں کھانے کو پُرلطف کھانے دیئے۔ پہننے کو بیش قیمت اور خوبصورت کپڑے دیئے اور کہا "جاؤ جا کر گاؤں میں سیر کرو۔ تمہارا یہی کام ہے" اور وہ بیکار رہ کر سارا دن گھومنے پھرنے میں ضائع کرنے لگے۔ مگر چند ہی دنوں کے بعد اُن کی طبیعت اُچاٹ ہو گئی۔ اور انہوں نے سوداگر سے کہا "ہمیں کچھ کام دے۔ ہم بیکار نہیں رہ سکتے"۔

سوداگر نے مُسکرا کر اُن کی طرف دیکھا اور آہستہ سے راز داری کے لہجہ میں کہا "تم بڑے آدمی ہو۔ بڑے آدمی کام نہیں کیا کرتے۔ کام کرنا مزدوروں اور قلیوں کا کام ہے۔ بڑے آدمی چھوٹے آدمیوں سے کام کرایا کرتے ہیں"۔

چاروں بیکار یہ سُن کر کہ اب وہ بڑے آدمی بن گئے ہیں۔ خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ اور بولے "تم کتنے نیک ہو۔ تم نے ہمیں بڑا آدمی بنا دیا ہے۔ اب ہمیں در حقیقت کام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ہم اپنا کام دوسرں

سے کرا لیا کریں گے لیکن ہمارے پاس اُن کو دینے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ ہم کھیتی کرتے ہیں نہ ہمارے پاس اناج ہے"۔

سوداگر ایک مرتبہ پھر اپنے دلفریب انداز میں مُسکرایا اور بولا "تم بڑے آدمی ہو۔ بڑے آدمیوں کا کام تو لوگ مُفت میں بھی کر دیتے ہیں۔ لیکن میں تمہارے لئے دُنیا کی بڑی سے بڑی رقم خرچ کرنے کو تیار ہوں۔ اِس گاؤں کے لوگوں کو بُلا کر اُن سے کہو کہ وہ ہمارے لئے پانچ عالیشان محل تعمیر کر دیں۔ ہم اُنہیں مالا مال کر دیں گے"۔

(۳)

دُوسرے دن سے چین نگر کے لوگوں نے کھیتی کا کام ترک کر دیا اور چار بیکاروں اور اُن کے مالک سوداگر کے لئے محل بنانے میں مصروف ہو گئے۔ اتنے بڑے محل اس سے پہلے وہاں کسی نے دیکھے بھی نہ تھے۔ اُن کو دیکھ کر طبیعت شگفتہ ہو جاتی تھی۔ مگر اُن کی فصل ماری گئی۔ سوداگر نے لوگوں کو روپیہ دیا۔ لیکن روپیہ سے کسی کا پیٹ نہ بھرتا تھا۔ لوگ زار زار روتے تھے اور کہتے تھے۔ اب کیا ہو گا؟

سوداگر نے ایک بیکار سے کہا "کچھ آدمیوں کو نوکر رکھ لے اُن کو باہر بھیج کر سستے داموں اناج خریدا اور یہاں منگوا کر مہنگے داموں فروخت کر دے۔ جو بچے۔ اُسے اپنے لئے رکھ لے"۔

بیکار نے ایسا ہی کیا اور یہ پہلا موقعہ تھا۔ جب چین نگر کے لوگوں نے باہر سے آیا ہُوا اناج کھایا اور کہا "یہ سوداگر کتنا نیک ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا۔

تو ہم اور ہمارے بال بچے بھوکے مر جاتے"۔

اب اُن کو باہر کی چیزیں اچھی معلوم ہونے لگیں اور اناج منگوانے والے بیکار نے نئی دیگر اشیا منگوانی شروع کر دیں۔ کچھ ہی مہینوں میں وہ امیر بن گیا اور اُس نے کئی دکانیں کھول کر اُن پر اپنے کارندے بٹھا دیئے وہ خود اپنے ہاتھ سے کوئی کام نہ کرتا تھا۔ اُس کے سب کام دوسرے لوگ کرتے تھے۔

دوسرے سال جب فصل کھڑی تھی۔ تو ایک رات کچھ ہرن آئے اور فصل کا کچھ حصہ خراب کر گئے۔ سوداگر نے گاؤں کے لوگوں کو گاؤں کے چوک میں جمع کیا اور کہا "اس طرح تو یہ جانور تمہاری تمام فصل خراب کر ڈالیں گے۔ اگر تم کہو۔ تو میرا آدمی ایسا انتظام کر سکتا ہے کہ آئندہ یہ ہرن تمہارے کھیتوں کے پاس نہ پھٹک سکیں"۔

چین نگر کے لوگوں نے کہا "دیکھو! یہ شخص کتنا رحم دل ہے اگر یہ نہ ہوتا۔ تو ہمارے کھیتوں کو ہرن اور دوسرے جانور چر جاتے"۔

دوسرے دن دوسرے بیکار نے گاؤں کے کچھ آدمیوں کو لاٹھیاں دے کر کھیتوں کی حفاظت کے لئے کھڑا کر دیا۔ جب فصل کٹ گئی۔ تو اپنے آدمیوں سے کہا۔ نصف اناج میرے پاس اُٹھا لاؤ۔ نصف اُن کے لئے رہنے دو۔ نوکروں نے تعمیل کی۔ بیکار نے تین حصے اپنے لئے رکھ لئے۔ ایک حصہ نوکروں کو بانٹ دیا۔

یہ پہلا موقعہ تھا۔ جب چین نگر کے لوگوں نے دوسروں کی حفاظت کا

آرام محسوس کیا اور یہ سوچنے کی بھی ضرورت نہ سمجھی کہ ہرن کیا کھا جاتے اور اور اب ہم نے کتنا دیا ٭

(۴)

لیکن لوگوں کو جو اناج ملا وہ ان کی ضرورت سے کم تھا۔ چین نگر میں چوریاں ہونے لگیں۔ کھیتوں کے نام نہاد محافظ نے لوگوں سے کہا ''اگر تم کہو۔ تو میں اپنے آدمیوں کو تمہارے مکانوں پر پہرہ دینے کا حکم دیدوں۔ پھر کیا مجال۔ جو تمہارا ایک سیر بھی اناج چوری چلا جائے'' ٭

گاؤں والوں نے کہا ''بڑی خوشی سے'' ٭

پس مکانوں اور دکانوں پر پہرے دار کھڑے ہو گئے۔ چوری بند ہو گئی۔ مگر حفاظت کرنے کے اخراجات جو لوگوں کو برداشت کرنے پڑے۔ وہ چوری کے نقصان سے کئی گنا زیادہ تھے ٭

اس طرح دوسرے بیکار کا کاروبار بھی دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ چند ہی مہینوں میں اُس نے بھی اپنے کئی محل کھڑے کر لئے۔ مگر وہ خود اپنے ہاتھ سے کوئی کام نہ کرتا تھا۔ اُس کے سب کام دوسرے لوگ کرتے تھے ٭

کبھی وہ دن تھا۔ جب چین نگر میں سب غریب تھے۔ لیکن کھانے پینے کی کسی کو پروا نہ تھی۔ اب کاروبار ترقی پر تھا۔ لیکن لوگ بھوکے مر رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے۔ وہ پیار، وہ محبت وہ خلوص نہ معلوم کہاں چلا گیا؟ اب لوگوں کو ایک دوسرے سے ذرا بھی ہمدردی نہ تھی۔ بات بات میں سر پھٹول ہوتا تھا۔ آج یہ زخمی ہو گیا۔ کل وہ مارا گیا۔

چین نگر میں بے چینی کا دَور دَورہ تھا۔ سوداگر نے یہ حالِ زبون دیکھا اور لوگوں سے کہا: "اگر تم نے اِن شکایتوں کا سدِّ باب نہ کیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ تمہارا قدیم اور خوبصورت شہر برباد ہو جائیگا۔ کیا تم کوئی ایسا معقول انتظام نہیں کر سکتے۔ کہ ایسی مُہلک وارداتیں ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں"۔

لوگوں نے سوداگر کی طرف دیکھ کر سر جُھکا لیا اور دھیرے سے کہا۔ "آپ دانا ہیں۔ کچھ آپ ہی بندوبست کر دیں۔ ورنہ ہم سچ مچ برباد ہو جائیں گے"۔

سوداگر نے جواب دیا "اچھا! ہم سوچیں گے"؟

دُوسرے دن ایک مہاجن اور ایک کسان میں جھگڑا ہو گیا مہاجن کہتا تھا۔ اس کے ذمّہ میرا بیس سیر اناج نکلتا ہے۔ کسان کہتا۔ یہ جھوٹا ہے۔ مَیں نے اس سے صرف دس سیر اناج لیا تھا۔ دونوں لڑتے تھے۔ جھگڑتے تھے۔ اور ایک دُوسرے کو گالیاں دیتے تھے۔ ایک دُکاندار نے یہ دیکھا اور جا کر سوداگر کو اطّلاع دیدی۔ سوداگر نے اُسی وقت ایک آدمی بھیج کر دونوں کو اپنے پاس بُلایا اور تیسرے بیکار سے کہا "اِن کے جھگڑے کا تصفیہ کر دو"۔

بیکار نے دونوں کی بات چیت سُنی اور پھر کسان سے کہا: "تُو نے اس سے بیس سیر اناج بھی لیا ہے اور اسے گالیاں بھی دی ہیں اِس لئے میرا فیصلہ یہ ہے کہ تُو پچیس سیر اناج دے"۔

مہاجن نے خوش ہو کر کہا "کیسا عُمدہ فیصلہ ہے۔ میں سیر نہ دیتا تھا۔

اب پچیس سیر دینا پڑا۔ اس کی یہی سزا تھی"۔
کسان نے مجبوراً پچیس سیر اناج منگوا کر سامنے رکھ دیا۔
اب بیکار مہاجن سے مخاطب ہوا اور بولا "تیرے پاس کیا ثبوت ہے کہ تو نے اس شخص کو بیس سیر اناج دیا تھا۔ وہ کہتا ہے۔ میں نے دس سیر لیا تھا"۔
مہاجن چپ چاپ کھڑا زمین کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔
بیکار نے کہا "تو صرف دس سیر اناج کا حق دار ہے؟ اس سے زیادہ تجھے ایک دانہ بھی نہیں مل سکتا۔ لیکن تو نے اُسے گالیاں دی ہیں۔ اور شہر کے لوگ اس کی شہادت دینے کو تیار ہیں۔ گالیاں دینے کا تجھے کوئی حق نہ تھا۔ کیا تیرے پاس اس کا کوئی جواب ہے؟"
مہاجن چپ چاپ کھڑا زمین کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔
بیکار نے کہا "میرا فیصلہ یہ ہے کہ تجھے پانچ سیر اناج دیا جائے باقی پانچ سیر جرمانہ کے طور پر کاٹ لیا جائے"۔
مہاجن انکار نہ کر سکا۔
کسان نے خوش ہو کر کہا "کیسا عمدہ فیصلہ ہے دس سیر نہ لیتا تھا اب پانچ سیر لینا پڑا۔ اس کی یہی سزا ہے"۔
لوگوں نے اس فیصلہ کے یہ حالات سنے تو کہا "ہم کیسے خوش نصیب

ہیں۔ اگر یہ شخص نہ ہوتا تو ہم لڑ لڑ کر مر جاتے" ⁂

اِس طرح تیسرے بیکار کا کاروبار بھی چل نکلا۔ اور اس کے پاس بھی کئی عالیشان اور فلک بوس محل ہو گئے۔ مگر وہ بھی کوئی کام اپنے ہاتھ سے نہ کرتا تھا۔ اُس کے سب کام گاؤں کے دُوسرے لوگ کرتے تھے ⁂

(۵)

لیکن ابھی چوتھا بیکار غریب تھا ⁂

سوداگر نے اُس کے لئے کمائی کا ذریعہ پیدا کرنے کی بہت کوشش کی۔ سوچ سوچ کر اُس کے سر میں درد ہونے لگا اور اس کی کن پٹیاں پھٹنے لگیں۔ لیکن اُسے اس تاریکی میں کوئی رستہ نہ سُوجھا آخر ہار کر وُہ اپنے مُربّی و آقا شیطان کے پاس گیا اور تین سال کی کارگزاری سُنا کر بولا۔ گاؤں کی تین چوتھائی آبادی پر ہمارا قبضہ ہو چکا ہے لیکن ابھی ہمارا چوتھا بیکار خالی بیٹھا ہے۔ اگر اُس کے لئے کوئی موزوں کام نکل آئے۔ تو یقیناً چین نگر کا ایک ایک آدمی ہماری مُٹھی میں ہو گا" ⁂

شیطان نے اپنے نائب کی پیٹھ پر آہستہ سے تھپکی دی اور اپنی گول گول اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا "جاؤ جا کر وہاں لوہے کی ایک چکّی لگا دو۔ باقی میں خود سمجھ لونگا" ⁂

چند دن کے بعد چین نگر کے باہر ایک وسیع میدان میں لوہے کی چکّی لگ گئی۔ اور رات کے وقت شیطان نے آ کر اپنی شیطانی طاقت اُس میں داخل کر دی۔ دُوسرے دن چکّی نے گیہوں اور باجرہ اور مکّی اور چنے پیسنا

شروع کر دیا اور یہ آٹا اتنا مہین اور اتنا نفیس تھا کہ گاؤں کے گنوار لوگ دیکھ کر حیران رہ گئے ——— انہوں نے ایسا آٹا آج تک کبھی نہ کھایا تھا۔ ایک ہی دن میں چین نگر کی سینکڑوں پتھر کی چکیاں بیکار ہو گئیں اور ایک ہی دن میں چین نگر کی سینکڑوں غریب عورتیں اور بن باپ کے بچے بھوکے مرنے لگے۔ لیکن اور لوگ خوش تھے اور اپنی خوش بختی پر پھولے نہ سماتے تھے۔ چوتھا بیکار سامنے تخت پوش پر بیٹھ کر حقہ پیتا رہتا تھا۔ اور رات کے وقت اتنا کما کر اُٹھتا تھا۔ جتنا قصبہ کا کوئی کام کرنے والا نہ کماتا تھا۔ اُس نے سوداگر کے مشورہ سے کئی اور کلیں لگائیں اور گاؤں کے کئی اور مزدوروں کو بھی دانے دانے کا محتاج کر دیا +

اس طرح شیطان کی مہربانی سے چوتھا بیکار بھی چند ہی دنوں میں دولتمند ہو گیا۔ لیکن وہ بھی اپنا کوئی کام اپنے ہاتھ سے نہ کرتا تھا۔ اُس کا سب کام گاؤں کے دُوسرے لوگ کرتے تھے +

چین نگر آج بھی اُن پہاڑیوں کے درمیان اسی طرح آباد ہے اب وہاں دیکھنے کے قابل کئی عمارتیں بن گئی ہیں۔ وہاں عدالتیں ہیں، وہاں شفاخانے ہیں، وہاں سرائیں اور دھرم سالے ہیں بڑے بڑے کارخانے ہیں! اُونچے اُونچے محل ہیں اگر کوئی مسافر اُدھر جا نکلتا ہے تو اس شہر کی عظمت دیکھ کر اُسکی طبیعت خوش ہو جاتی ہے اس کے دل کا کنول کھل جاتا ہے لیکن اب وہاں کا قانون تبدیل ہو گیا ہے پہلے سب کام کرنے والے کھاتے تھے۔ صرف چار بھوکے مرتے تھے اب چار بیکار عیش کرتے ہیں۔ باقی سب کام کرنے والے بھوکے مرتے ہیں +

دو ڈاکٹر[2]

(۱)

اُن میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔

دونوں ڈاکٹر تھے، دونوں ایک ہی محلّہ میں رہتے تھے، دونوں ایک ہی کالج میں پڑھے تھے۔ دونوں نے ایک ساتھ امتحان پاس کیا تھا۔ اب دونوں ایک ہی بازار میں پریکٹس کرتے تھے۔ دونوں کی دُکانیں ایک دُوسرے کے آمنے سامنے تھیں۔

لیکن پھر بھی اُن میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ایک کا نام فقیر چند تھا، دُوسرے کا امیر چند، ایک پُرانی لکیر کا فقیر تھا۔ دُوسرا پُورے طور پر آزاد خیال۔ ایک مذہب کے نام پر جان قربان کرتا تھا۔ دُوسرا اس پر کھلّی اُڑاتا تھا۔ ایک پُوجا پاٹ کا سختی کے ساتھ پابند تھا۔ یہاں تک کہ پُوجا پاٹ کئے بغیر مُنہ میں پانی ڈالنا بھی پاپ سمجھتا تھا۔ دُوسرا کہتا تھا کہ دُنیا میں اس فعل عبث (۹) کی ضرورت ہی کیا ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ ایک دُوسرے کے دوست تھے۔ ایک دُوسرے کو چاہتے تھے۔ ایک دُوسرے کے دُکھ سُکھ

میں شریک ہوتے تھے۔ یہ دیکھ کر لوگوں کو تعجب ہوتا تھا۔ ایک دُوسرے سے اِتنے دُور، مگر پھر بھی ایک دُوسرے کے کس قدر قریب ؟ اُن میں پیشہ کی رقابت نام کو نہ تھی۔ آگ اور پانی کا ایسا میل دُنیا میں کسی نے کم دیکھا ہوگا۔

ایک دن فقیر چند نے امیر چند سے کہا "ایک بات کہوں۔ مانوگے ؟"

امیر چند نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے سگرٹ سُلگایا اور فقیر چند کی طرف دیکھ کر کہا "معلوم ہوتا ہے۔ کوئی خاص بات ہے۔ کہئے کیا حکم ہے ؟"

فقیر چند "مانوگے پہلے اقرار کرو !"

امیر چند "اگر ماننے کے لائق ہوگا تو ضرور مانوں گا "

فقیر چند "اس کی شرط نہیں پہلے اقرار کرو۔ کہ مانوگے "

امیر چند نے سگرٹ کی راکھ زمین پر گرا کر کہا "سادہ کاغذ پر دستخط کرانا چاہتے ہو ؟"

فقیر چند (مُسکرا کر) "اب یہی سمجھ لو۔ اگر مجھ پر اعتماد ہے تو کرو۔ نہیں ہے تو نہ کرو۔ بولو کیا کہتے ہو ؟"

امیر چند۔ "ممکن ہے تم دو چار ہزار کا پرونوٹ لکھ لو۔ بعد میں میں ہزار کہوں کہ صاحب ! سادہ کاغذ پر دستخط کر دئے تھے۔ لیکن کون مانے گا۔ سب یہی کہیں گے کہ بکتا ہے۔ اُس وقت روپیہ لے لیا۔ اب مانگا۔ تو بہانے بنانے لگا "

فقیر چند (کندھے سے پکڑ کر کرسی پر بٹھاتے ہوئے) "بھئی ! آج تو اس طرح چھٹکارا نہ ہوگا۔ تمہیں اقرار کرنا ہی ہوگا۔ ورنہ یاد رکھو کھانا پینا چھوڑ دوں گا۔ پھر مناتے پھروگے !"

امیر چند:۔ (سنجیدگی سے) "تم آدمی ہو یا کوتوال؟"
فقیر چند:۔ "تم کوتوال ہی سمجھ لو۔ لیکن اقرار کرنا ہوگا۔ لو اب میرا وقت ضائع نہ کرو۔ کہو جو کہوں گا مانو گے"۔
امیر چند (مجبوری سے) "بہت اچھا بھئی! اقرار کیا۔ بولو کیا بکتے ہو"؟
فقیر چند:۔ "بکتا یہ ہوں کہ تم نے آج تک کبھی پُوجا نہیں کی۔ نہ کبھی مندر میں گئے ہو۔ لیکن کل جنم اشٹمی کا دن ہے۔ کل صبح تمہیں پُوجا کرنا ہوگی۔ بولو کرو گے"؟
امیر چند:۔ "اب میری مرضی کا سوال ہی نہیں رہ گیا۔ تم نے قول لے لیا۔ مجھے ماننا ہوگا۔ لیکن اس سے تمہیں کیا مل جائیگا؟ یہ میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا"۔
فقیر چند:۔ "میرا جی خوش ہوگا۔ میرا پرماتما خوش ہوگا۔ کہ کم از کم ایک مرتبہ تو تم نے پرماتما کا نام لے لیا۔ میرے لئے اتنا ہی بہت ہے"۔
امیر چند نے فقیر چند کی طرف محبت آمیز نگاہوں سے دیکھا اور مُسکرا کر کہا:۔
"میرا ارادہ تو نہ تھا کہ سورگ میں جاتا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ تم مجھے گھسیٹ کر بھی لے جاؤ گے۔ اب تم سے انکار کر دوں۔ تو بُرا سا مُنہ بنا لو گے۔ دو دن کھانا ہی نہ کھاؤ گے۔ شاید بھابی سے بولنا بھی چھوڑ دو۔ تمہارا کیا بگڑے گا۔ گردن ہماری ناپی ہو جائے گی۔ نہ بابا! یہ مشکل ہے۔ پُوجا کریں گے"۔

یہ کہہ کر وہ سگرٹ کا دُھواں اُڑانے لگے۔ فقیر چند نے کہا "آج تم نے میرا جی خوش کر دیا" امیر چند نے رومال کو کوٹ کی آستین میں رکھتے ہوئے جواب دیا "مگر یہ پُوجا کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ یہ تو بتا دو بعد میں کہو گے پُوجا غلط ہو گئی"۔

یہ کہہ کر اُنھوں نے پیٹھ کرُسی سے لگالی اور فقیر چند کی طرف دیکھنے لگے۔

فقیر چند "نہا دھو کر تنہائی میں بیٹھ جاؤ اور مالا پھیرو اس کے ساتھ ہی پرماتما کا نام لیتے جاؤ۔ اور کیا؟ شروع میں اتنا ہی بہت ہے"۔

امیر چند "بس اسی سے پرماتما خوش ہو جائیگا؟ بڑا آسان طریقہ ہے بھائی!

فقیر چند (مسکرا کر) "تم نے کیا سمجھا تھا؟ گلے میں رسا ڈالنا پڑتا ہے (ٹھوڑی دیر بعد) تمہارے پاس مالا ہے یا نہیں؟"

امیر چند "ہمارے جیسے بے ایمانوں کے پاس ایسی چیزیں کہاں؟ مالا بھیج دو گے، پھیر لیں گے، نہ بھیجو گے، نہ پھیریں گے۔ اب اگر ہم نے کل مالا نہ پھیری، تو سارا قصور تمہارا ہوگا۔ ہم پرماتما سے صاف کہہ دیں گے کہ اسے پکڑو، اس نے مالا کیوں نہ بھیجی۔ ہم تو بھگت بننے کا فیصلہ کر چکے تھے!"

(۲)

دُوسرے دن امیر چند نے صبح اُٹھ کر اشنان کیا اور مالا لے کر الگ کمرے میں چلے گئے۔ بیوی سے، ماں سے، اور نوکر سے کہا "ہم رام نام کا جاپ کریں گے۔ کوئی بُلانے آئے تو صاف کہہ دو، اِس وقت نہیں مل سکتے،

پھر آؤ۔ ایک گھنٹہ سے پہلے نہ نکلوں گا ؛

یہ حکم دے کر امیر چند نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اور آسن پر بیٹھ کر مالا پھیرنے لگے اور رام نام کا جاپ کرنے لگے۔ اُن کی بیوی ساوتری باہر ایک سٹول پر بیٹھ گئی اور بچے کا سویٹر بُننے لگی ؛

معاً ماگھی بھنگی گھبرایا ہُوا آیا اور سلام کر کے فاصلہ پر کھڑا ہو گیا۔ گھبراہٹ اتنی تھی کہ غریب کے مُنہ سے بات بھی نہ نکلتی تھی۔ ہانپ رہا تھا ؛

ساوتری نے سلائی سے تاگے کو گرہ دیتے ہوئے ایک مرتبہ اُس کی طرف دیکھا۔ اور پھر سویٹر بُنتے ہوئے کہا " کیوں ماگھی! گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟"

ماگھی نے دونوں ہاتھوں سے پھر سلام کیا اور کہا " ماں جی! چھوٹو کو جانے کیا ہو گیا ہے؟ رات کو بھلا چنگا سویا تھا، صبح اُٹھ کر دیکھتا تو بیہوش پڑا ہے۔ پہلے گرم تیل کی مالش کرتے رہے، کہ شاید ہوش میں آ جائے۔ مگر آنکھیں ہی نہیں کھولتا۔ اب یہاں آیا ہوں (اِدھر اُدھر دیکھ کر) ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں؟"

ساوتری نے اُسی طرح سر جھکائے ہوئے کمرے کی طرف اشارہ کیا اور سویٹر بُنتے ہوئے بولی " ذرا آہستہ بول۔ مالا پھیر رہے ہیں کب سے بیہوش ہے" ؛

ماگھی گڑگڑا کر بولا " ماں جی! ہم کیا جانیں۔ صُبح چار بجے اُٹھ کر جھاڑو دینے جایا کرتا تھا۔ آج دیر تک سوتا رہا۔ تو میں نے اُس کی ماں سے کہا۔ اُسے اُٹھا! کب تک سوتا رہے گا۔ اُٹھ کر دیکھا، تو بیہوش پڑا تھا!

یہ کہہ کر ماگھی نے بے صبری سے کمرے کی طرف دیکھا۔ مگر اُس کا دروازہ بدستور بند تھا +

ساوتری نے سر اُٹھا کر پُوچھا " رات کو شراب تو نہیں پی گیا ؟ تمہارے ہاتھ میں پیسہ آ جائے تو شراب پینے دَوڑتے ہو" +

یہ کہہ کر پھر سویٹر بُننے لگی +

ماگھی (ہاتھ باندھ کر) " نہیں ماں جی! چھوٹو میں یہ عیب نہیں۔ اُس نے کبھی شراب نہیں پی۔ مَیں قسم کھا سکتا ہوں " +

ساوتری " چل جھوٹا! قسم کھا سکتا ہے۔ بیٹے کے لئے کون جھوٹ نہ بولے گا۔ بڑا دیوتا آیا ہے " +

ماگھی " گھبرا کر) ہاں جی! جھوٹا ہی سہی۔ اب تو ڈاکدر صاحب کا بھروسہ ہے چل کر دیکھ لیں۔ تو تسلّی ہو۔ چھوٹو کی ماں اور بہنیں تو مری جا رہی ہیں (کچھ دیر کے بعد) یہ مالا کب تک ختم ہو جائیگی ماں جی! آپ جرا کہدیں تو پہلے دیکھ آئیں۔ ورنہ کچھ اور کھرابی نہ ہو جائے +

ساوتری نے سویٹر بُننا بند کر دیا۔ اور سلائیوں کو سنبھالتے ہوئے ماگھی کی طرف دیکھ کر بولی +

" ارے کس کی شامت آئی ہے۔ جو اُن کو اِسوقت بُلا جائے۔ حکم ہے خواہ کوئی آئے۔ کہد و۔ اِس وقت نہیں مل سکتے۔ ایک گھنٹے سے پہلے باہر نہ نکلیں گے۔ کسی اَور کو لے جاؤ " +

ماگھی (پھر گڑ گڑا کر) پرمیشر دُونا اقبال کرے ماں جی! مَیں تو بڑی آس

لے کر آیا تھا۔ اور کس کے پاس جاؤں۔ آپ کا نوکر ہوں۔ آپ کے پاس آیا ہوں"۔

ساوتری "تو بیٹھو۔ مالا پھیر کر نکلتے ہیں۔ تو لے جانا۔ وہاں کونسا تجھے دفتر جانا ہے"۔

ماگھی (کمرے کی طرف دیکھ کر) "کیوں ماں جی! ڈاکدر صاحب پہلے تو کبھی مالا نہ پھیرتے تھے۔ آج ہی شروع کی ہے"۔

ساوتری۔ اگر معلوم ہوتا۔ کہ تو آئیگا۔ تو آج بھی شروع نہ کرتے۔

ماگھی۔ (ہاتھ باندھ کر) "نہیں ماں جی! میرا یہ مُنہ کہاں؟ پر یہ کھیال ہے کہ کوئی اور تکلیپھ نہ ہو جائے ورنہ آپ حکم دیں تو سارا دن دروازے پر بیٹھا رہوں۔ پرمیسر اکبال دُونا کرے۔ آپ ہی کا کھدمتگار ہوں"۔

یہ کہہ کر اُس نے پھر دروازہ کی طرف دیکھا۔

ساوتری "ذرا بیٹھ! ابھی آتے ہیں"۔

یہ کہہ کر ساوتری اندر چلی گئی۔ ماگھی دھوپ میں بیٹھ گیا۔ اور انتظار کرنے لگا۔ اُس کی نگاہیں دروازے پر لگی تھیں۔ مگر دروازہ کسی بدنصیب کے نصیب کی طرح کھُلتا نہ تھا۔ ماگھی سوچتا تھا۔ امیر لوگ مالا پھیرتے ہیں۔ جب بھی غریبوں ہی کو تکلیف ہوتی ہے۔ اگر کوئی امیر ہوتا۔ تو مالا چھوڑ کر فوراً اُٹھ کھڑے ہوتے۔ ذرا حیل وحجت نہ کرتے۔ ہم غریب ہیں۔ ہماری کون سُنتا ہے۔

اتنے میں بھنگن نے آکر کہا "عجیب بے پروا ہے۔ وہاں بیٹا مر رہا

ہے۔ تُو یہاں بیٹھا دھوپ تاپ رہا ہے"۔
ماگھی نے اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور سر پر ہاتھ مار کر کہا۔ "ہماری کسمت ہی بُری ہے۔ آج تک ڈاکدر صاحب نے مالا نہ پھیری تھی۔ آج ہی چھوٹو بیمار ہُوا۔ آج ہی یہ مالا پھیرنے بیٹھ گئے۔ کھتم ہو تو چلیں۔ گھنٹہ بھر بیٹھنا ہو گا۔ اب کیا حال ہے؟"
بھنگن بھی اپنے بھنگی کے ساتھ بیٹھ گئی اور بلند آواز سے بولی "وُہی حال ہے نہ ہلتا جلتا ہے نہ بولتا ہے۔ تم ڈاکٹر صاحب کو بُلا کیوں نہیں لیتے"؟
ماگھی "بڑے کھپا ہونگے"؟
بھنگن۔ وہاں بچے کی جان پر بن رہی ہے۔ تمہیں کھپگی کی پڑی ہے۔ چلو دیدو آواز اُٹھ کر۔ اور کیا۔ مَیں بُلاؤں؟
ماگھی "اور جو کہدیں جاؤ۔ مَیں نہیں جاتا۔ تو پھر کیا کرینگے۔ اتنا سونچ لو!
بھنگن "یہ تمہارا وہم ہے۔ ڈاکدر صاحب ایسے آدمی نہیں"؟
ماگھی "پہلے اُن دوسرے ڈاکدر صاحب کے ہاں گیا تھا۔ وُہ پُوجا کرنے جا رہے تھے۔ اُنہوں نے ساپھ کہدیا۔ مَیں پُوجا کئے بگیر مکان سے باہر نہ جاؤں گا۔ لاکھ منت کی۔ مگر اُنہوں نے ایک نہ سُنی"؟
بھنگن "اُن میں اور اِن میں بہت پھرک ہے۔ ماگھی کی آنکھوں میں آنسُو آ گئے۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ کہتے تھے تمہارا بیٹا مرے یا جئے مجھے پروا نہیں۔ میرے لئے پہلے پُوجا ہے بعد میں کچھ اُور"؟
بھنگن "تم ایسے کسائی کے پاس گئے ہی کیوں تھے"؟

ماگھی:۔ "میں نے سوچا تھا۔ یہ آدمی پُوجا پاٹھ کرتا ہے جرور مہربانی کرے گا"۔

بھگن:۔ "میں نے تو یہ دیکھا ہے کہ جو بہت پُوجا پاٹھ کرتے ہیں۔ وہ آدمی کو آدمی ہی نہیں سمجھتے۔ جانور سمجھتے ہیں۔ اتنا بھی کھیال نہ کیا کہ اس کے سامنے ایسی بات نہ کہوں۔ اس کے دل کو لگ جائے گی"۔

ماگھی (آہ سرد بھر کر) "گریب کو سب کچھ سُننا پڑتا ہے"۔

بھگن:۔ "مگر کیا گریب اُس کے بندے نہیں۔ پُوجا تو پھر بھی ہو سکتی تھی کیا پرمیشر کہیں بھاگا جاتا تھا۔ پہلے دیکھ آتا۔ پھر مجے سے بیٹھ کر سارا دن پُوجا کرتا۔ کون روکتا تھا؟

ماگھی (دروازے کی طرف دیکھ کر) "ابھی تک مالا پھر رہی ہے!"

ماگھی جانتا تھا۔ اِس وقت بُلانا ٹھیک نہیں بڑے خفا ہونگے۔ عجب نہیں مار کر نکال دیں۔ لیکن اُس کا بیٹا بے ہوش پڑا تھا۔ اُس کے دل کو لگی تھی۔ اُس سے بیٹھا نہ جاتا تھا۔ ایک ایک لمحہ ایک ایک سال کے برابر تھا۔ چند منٹ دل و دماغ میں لڑائی ہوتی رہی۔ اس کے بعد اُٹھ کر وہ دروازے کے قریب چلا گیا۔ اور ڈرتے ڈرتے مگر بلند اور مؤدبانہ انداز سے بولا "ڈاکدر صاحب!"

ڈاکدر صاحب نے مُنہ سے جواب نہ دیا۔ صرف کھانس کر رہ گئے۔ اس کا مطلب صاف تھا کہ اس وقت نہ بُلاؤ۔

مگر ماگھی کو اتنی تمیز کہاں؟ کہ اس اشارے کو سمجھتا دروازے کے اور قریب کھسک کر بولا "ڈاکدر صاحب!!"

ڈاکٹر صاحب کی آنکھیں غصّہ سے سُرخ ہو گئیں سوچنے لگے۔ اب کیا مجھے اتنا بھی حق نہیں۔ کہ جب چاہوں، تنہائی میں ایک گھنٹہ بیٹھ کر مالا پھیر لوں۔ سب سے کہہ دیا تھا۔ مجھے کوئی نہ بلائے۔ مگر کسی نے ذرا پروا نہیں کی۔ دُوسرے لمحہ میں اُنہوں نے آ کر بڑے زور سے دروازہ کھول دیا۔ اور دہلیز پر کھڑے ہو کر ماگھی کی طرف دیکھنے لگے۔ گویا زبانِ حال سے کہتے تھے بول کیا کہتا ہے؟

اب ماگھی کے مُنہ سے بات بھی نہ نکلتی تھی۔ نہ بھنگن کی زبان میں طاقت تھی۔ دونوں خاموش کھڑے کانپتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے خفگی کے لہجہ میں کہا "کیا ہے؟ کیا تم سے کسی نے کہا نہ تھا کہ مالا پھیر رہے ہیں!"

ماگھی نے بھنگن کی طرف ایک مرتبہ دیکھا اور پھر سر جُھکا لیا۔ بھنگن نے آگے بڑھ کر کہا "ڈاکدر صاحب ہم آپ کی کھدمت کرتے ہیں۔ آپ کے پاس نہ آئیں تو اور کہاں جائیں۔ چھوٹو بے ہوش پڑا ہے"

ڈاکٹر صاحب خاموش رہے"

ماگھی گڑگڑا کر بولا "ایک ہی بیٹا ہے سرکار! اگر اُسے کچھ ہو گیا۔ تو آپ کی بھنگن رو رو کر مر جائے گی۔ کئی گھنٹے سے بے ہوش پڑا ہے سرکار! مالش کر کے ہار گئے۔ جرا حرکت نہیں کرتا۔ پتھر کی طرح پڑا ہے!"

ساوتری نہانے کے لئے غسل خانہ میں جا رہی تھی آواز سُن کر تولیہ لئے ہوئے صحن میں چلی آئی۔ اور بولی "بڑا ڈھیٹ ہے تو ماگھی! کیا میں نے تجھ سے کہہ نہیں دیا تھا کہ مالا پھیر رہے ہیں۔ ذرا دیر رُک جا۔ تم لوگوں سے

جس قدر نرمی کی جائے۔ تم اُتنا ہی سر چڑھ جاتے ہو"۔
جواب میں بھنگن کچھ بولنا ہی چاہتی تھی کہ امیر چند نے اُسے اشارے سے منع کر دیا۔ اور ذرا نرم ہو کر بولے "کسی اَور کو لے گئے ہوتے۔ میں مالا پھیر رہا تھا"۔
ماگھی "سرکار، ہم غریبوں کی کون سنتا ہے۔ آپ سے آس تھی۔ آپ کے پاس چلے آئے"۔
اب امیر چند کا غصہ بالکل اُتر چکا تھا۔ اُنہوں نے مسکرا کر کہا "لیکن کیا گھنٹہ آدھ گھنٹہ انتظار نہ کر سکتے تھے؟"
ماگھی نے گڑگڑا کر جواب دیا "بالکل بے ہوش پڑا ہے سرکار! جرا چل کر دیکھ لیں۔ تو جندگی بھر دُعائیں دیتا رہوں گا۔ ساری عمر کی کمائی ہے سرکار! ابھی بیاہ کو مہینہ بھی نہیں ہُوا!"
امیر چند نے مالا رکھ دی۔ اور سُوٹ پہن کر اُن کے ساتھ ہو لیے ہوش میں لانے کی کچھ دوائیں بھی ساتھ لے لیں۔ جب لَوٹے اُس وقت ایک بج چُکا تھا۔ اس وقت تک بھُو کے پیاسے وہیں بیٹھے اُسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرتے رہے۔ اِس وقت وہ ہوش میں تھا اور آہستہ آہستہ باتیں کر رہا تھا بھنگی اور بھنگن کا ر دیاں رو یاں اُن کو دُعائیں دے رہا تھا۔ امیر چند دس گیارہ بجے کھانا کھانے کے عادی تھے ایک بجے تک وہ شاذ ہی کبھی بھُوکے رہے ہونگے۔ مگر آج اُنہیں اس کی پروانہ تھی۔ آج بھُوکے پیاسے ہونے پر بھی وہ مطمئن نظر آتے تھے۔

آج اُنہوں نے غریبوں کی پکار سُنی تھی۔ آج اُنہوں نے بغیر فیس لئے ایک بیکس کی خاطر اپنا بیش قیمت وقت قربان کیا تھا!

(۳)

امیر چند جب کھانا کھا کر دُکان پر پہنچے۔ اُس وقت اُن کی دیوار گھڑی میں سوا دو بج چکے تھے۔ کمپوڈر نے کہا "سب لوگ انتظار کر کرکے چلے گئے"۔

امیر چند نے کوٹ اُتار کر کھونٹی پر لٹکاتے ہوئے جواب دیا "کوئی پروا نہیں"۔

کمپوڈر نے ایک چھٹی اُن کے ہاتھ میں دے کر کہا "سیٹھ منگل داس کا آدمی آیا تھا۔ کہتا تھا۔ جس وقت آئیں۔ فوراً بھیج دو۔ سیٹھ صاحب کی ماں بیمار ہے"۔

امیر چند نے رومال سے منہ صاف کرکے چٹھی لے لی اور اُسے پڑھے بغیر میز پر رکھ دیا۔

کمپوڈر نے کہا "سیٹھ صاحب کا آدمی دو مرتبہ آ کے لَوٹ گیا ہے۔ بڑی تاکید کرتا تھا۔ کہتا تھا۔ فوراً آ جائیں"۔

امیر چند نے کرسی پر بیٹھ کر بے پروائی سے جواب دیا "اچھا!"

اتنے میں ڈاکٹر فقیر چند نے اپنی دُکان میں سے پکار کر پوچھا۔ ابھی ڈاکٹر صاحب آئے یا نہیں؟ آ گئے ہوں تو بھیج دو۔ کمپونڈر نے بلند آواز سے جواب دیا۔ ابھی آ کر بیٹھے ہی ہیں (امیر چند سے) کیا کہوں؟

آپ کو بُلا رہے ہیں!

امیر چند نے سگرٹ سُلگا کر دیا سلائی زمین پر پھینکی اور اُسے پاؤں تلے مسل کر جواب دیا۔ "کہو یہاں آجائیں۔" کمپوڈر نے بلند آواز سے کہا۔ "آپکو بُلا رہے ہیں!

امیر چند نے اپنے آپ سے کہا۔ آج ضرور لڑائی ہوگی۔ یہ شخص کوئی عذر نہ سُنے گا"۔

کمپوڈر نے اُن کی طرف حیرت سے دیکھا۔ مگر کچھ سمجھ نہ سکا۔ دو منٹ بعد فقیر چند نے آکر کہا۔ "آج تو بڑی دیر میں آئے۔ تم ابھی تک مالا پھیر رہے تھے۔ یا کسی کو دیکھنے چلے گئے تھے؟"

امیر چند نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے اپنے دوست کی طرف دیکھا۔ اور ایسے لہجے میں جیسے کوئی شکایت کرتا ہے۔ بولے "بھائی کیا کہوں۔ ان مریضوں کے مارے ناکوں دم ہے۔ دروازہ بند کرکے بیٹھا تھا۔ سب سے کہہ دیا۔ کہ خبردار! ہمیں کوئی نہ بُلائے۔ مگر کون سُنتا ہے۔ ایک شخص آکر دروازہ توڑنے لگا۔ میرا تو جی چاہتا ہے۔ ڈاکٹری چھوڑ کر کوئی اور کام شروع کردوں۔ یہ بھی کوئی کام ہے۔ نہ دن کو چین نہ رات کو آرام۔ کوئی چھ گھنٹے کا نوکر ہے۔ کوئی آٹھ گھنٹے کا۔ یہاں چوبیس گھنٹوں کی غلامی ہے۔ مالا پھیرنے کی بھی فرصت نہیں۔ ایسا کام بتاؤ۔ جس میں کوئی وقت اپنا بھی ہو۔ یہاں تو سارا وقت دُوسروں کا ہے!"

فقیر چند نے سر ہلایا۔ گویا کہہ رہے تھے۔ مجھے پہلے ہی اُمید نہ تھی

پھر کہا یہ کون آیا تھا۔ کوئی امیر ہوگا"۔

امیر چند:۔ "امیر ہوتا تو صاف انکار کر دیتا۔ کہ کسی اَور کو لے جائیے"۔

فقیر چند:۔ "تو کیا کوئی گدا آیا تھا۔ جس کی خاطر مالا دھری رہ گئی؟"

امیر چند:۔ "وہی اپنا بھنگی ماگھو! پہلے تمہارے پاس گیا۔ پھر میرے پاس آیا۔ بڑا گڑگڑا رہا تھا۔ گڑگڑاتا کیا تھا؟ روتا تھا۔ اس کا ایک ہی لڑکا ہے۔ وہ بیمار تھا۔ مجھے رحم آگیا۔ سوچا۔ کوئی امیر ہو۔ تو معمولی بات ہے۔ جسے فیس دے لے جائے۔ مگر اُس کے پاس فیس کہاں؟ جانا پڑا!"

فقیر چند:۔ "میرے پاس بھی آیا تھا۔ میں نے تو صاف کہہ دیا۔ کہ پوجا کر لوں، پھر چلوں گا۔ وہ گڑگڑانے لگا۔ میں نے نوکر سے کہا۔ باہر نکال دو۔ وہ دُم دبا کر بھاگ گیا"۔

امیر چند:۔ "وہاں سے اب آیا ہوں۔ کئی مریض لوٹ گئے"۔

فقیر چند:۔ "میرا جی چاہتا ہے۔ تمہارا کبھی مُنہ نہ دیکھوں تم نے مُجھ سے کل کیا اقرار کیا تھا؟"

امیر چند (اپنے کان پکڑ کر) "بے شک غلطی ہوگئی۔ اب کے اَور معاف کردو"۔

فقیر چند:۔ "تمہاری ساری عمر اسی طرح گزر جائے گی۔ چوبیس گھنٹے اپنا کام کرتے ہو۔ کیا تمہارے پاس دو چار گھڑیاں اُس کے سمرن کے لئے نہیں ہیں؟ مر کر نرک میں جاؤ گے"۔

امیر چند (مسکرا کر) "وہاں تو سینکڑوں بیمار ہونگے۔ میں اکیلا کیا کرونگا۔

ہم تم دونوں ہوں تو کسی نہ کسی طرح کام چلا لیں گے۔ چلو گے نا؟"
فقیر چند (غصہ سے)! "تم ہنستے ہو۔ مجھے زہر چڑھتا ہے اب رات کو مندر میں جھانکی دیکھنے بھی چلو گے یا نہیں؟ اگر نہ گئے۔ تو یاد رکھو مجھ سے تم سے کوئی مطلب نہیں"۔
امیر چند "چلو منظور! کتنے بجے چلو گے؟"
فقیر چند "آٹھ سوا آٹھ بجے۔ اور کیا۔ کہیں غائب نہ ہو جانا"۔
امیر چند "مجال ہے"۔
مگر آٹھ بجے امیر چند دُکان پر نہ تھے۔ کمپوڈر نے کہا "ماگھی آیا تھا۔ اُسی کے ساتھ گئے ہیں"۔
فقیر چند "کچھ کہہ گئے ہیں یا نہیں"۔
کمپوڈر "اگر میں ایک گھنٹہ تک نہ آیا۔ تو دُکان بند کر کے چلے جانا۔ غالباً دیر میں لوٹیں گے۔ وہ چھوٹو پھر بیمار ہو گیا ہے"۔
فقیر چند "ذرا خیال کرو۔ ساری دُنیا مندروں میں بھگوان کے درشن کو جا رہی ہے۔ لالہ صاحب بھنگیوں کے مکانوں کی سیر کر رہے ہیں۔ ہم چاہتے تھے، یہ بھی درشن کر لیں۔ مگر جب قسمت ہی بُری ہو، تو کوئی کیا کر سکتا ہے؟ چلو ہم تو سبکدوش ہو گئے"۔
کمپوڈر "صبح میٹھو منگل داس کا آدمی آیا تھا۔ اور کہہ گیا تھا کہ آئیں تو بھیج دینا۔ جب جانے کو تیار ہوئے تو وہی ماگھی آ گیا۔ اور پاؤں میں گر کر رونے لگا۔ بس سیٹھ صاحب کی طرف نہ گئے۔

بھنگی کے ساتھ چلے گئے!

فقیر چند (حیرت سے) "ارے اتنی حماقت؟ یہی لیل و نہار ہیں... تو پریکٹس چل چکی۔ پھر کہیں گے۔ ہمیں تو کوئی پوچھتا ہی نہیں ہے۔ ارے بابا! جب تم اپنے آپ کو نہیں پوچھتے۔ تو تمہیں اور کون پوچھے گا کیا یہ بھنگی لوگ انہیں کھانا دیدیں گے۔ میرا تو اس شخص سے جی کھٹا ہو گیا۔ جنم اشٹمی کے دن بھی یہ حالت کہ نہ صبح مالا پھیری۔ نہ اس وقت درشن کئے۔ پورا ناستک ہے۔ ایسے شخص کا تو منہ بھی نہ دیکھنا چاہیئے"۔

(۴)

لیکن دوسرے دن ابھی سورج بھی نہ نکلا تھا کہ انہوں نے امیر چند کو جا جگایا۔ امیر چند نے انہیں اپنے پلنگ پر جگہ دیتے ہوئے کہا۔ "یار مجھے بڑا افسوس ہے۔ میں رات تمہارے ساتھ نہ جا سکا۔ وہ بانگی پھر آکر منتیں کرنے لگا۔ میں نے سمجھا۔ دس بارہ منٹ میں لوٹ آؤں گا۔ لیکن وہاں ساڑھے بارہ بج گئے۔ اب کس منہ سے کہوں معاف کر دو"۔

فقیر چند: "میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔ تم سے بات بھی نہ کروں گا۔ جو شخص وعدہ کر کے بھی پورا نہ کرے اُس کا کیا اعتبار!"

امیر چند (مسکرا کر) "بھئی بولنا بند کر دو۔ مگر صبح اُٹھ کر درشن کر جایا کرو۔ چلو ہمارے لئے یہی بہت ہے"۔

فقیر چند (سُنی اَن سُنی کر کے) "جانتے ہو میں اس وقت کیوں آیا ہوں"؟
امیر چند "کوئی نیا قول و قرار کرانے آئے ہو گے۔ تمہیں اور کام ہی کیا ہے"؟
فقیر چند "اب یہ خیال ذہن سے نکال دو۔ میں تمہیں ایک عجیب و غریب خبر سُنانے آیا ہوں"؟
امیر چند نے جسم کے گرد کپڑا لپیٹ لیا۔ اور فقیر چند کی طرف دیکھ کر بولے "سُناؤ"؟
فقیر چند "ایسی عجیب خبر ہے کہ چونک اُٹھو گے۔ میرا خیال ہے۔ شاید باور ہی نہ کرو"؟
امیر چند۔ "تو جتنے لفظ تمہید میں ختم کر چکے ہو۔ اُس سے آدھے لفظوں میں وہ خبر سُنا دو"؟
فقیر چند نے کہا "تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میں پُوجا پاٹھ کا بہت پابند ہوں۔ لیکن میں آٹھ بجے سے پہلے شاذ ہی جاگتا ہوں۔ آج بھگوان جانے کیوں میری آنکھ تین بجے کے قریب کُھل گئی۔ میں نے سوچا۔ آج اسی وقت پُوجا کر لو۔ چنانچہ میں نہا دھو کر پُوجا کے کمرے میں چلا گیا اور پُوجا کرنے لگا۔ اتنے میں مجھے ایسا معلوم ہوا۔ کہ کمرہ کسی خاص قسم کی تیز روشنی سے بھر گیا ہے۔ آنکھ اُٹھا کر دیکھا، تو میرے سامنے میری کرشن کی مورتی نہ تھی۔ خود میری کرشن کھڑے مُسکرا رہے تھے"!
امیر چند (حیرت سے) "مورتی نہ تھی، خود میری کرشن تھے"!

فقیر چند نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ اور کہا "میں نے ایک مرتبہ اُن کی طرف دیکھا، اور پھر اُن کے پاؤں پکڑ لئے۔ اُس وقت میرے دل کی جو حالت تھی۔ اُسے بیان نہیں کر سکتا۔ پھولا نہ سماتا تھا۔ سمجھا برسوں کی محنت پھل لائی۔ بھگوان بھگت کو درشن دینے آ گئے۔ مگر دوسرے لمحہ میں بھگوان نے مجھے اُٹھا کر کھڑا کر دیا اور میری طرف دیکھا، اب اُن کی آنکھوں سے آگ کے شرارے نکل رہے تھے۔ بولے۔ تو ہم سے مذاق کرتا ہے۔ مجھے اپنی رگوں کا خون سرد ہوتا معلوم ہوا۔ میں بولنا چاہتا تھا۔ مگر منہ میں بولنے کی قوت نہ تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اُن کی طرف دیکھا اور گردن جھکا لی۔ اُنہوں نے کہا۔ آج اس شہر میں ہزاروں لوگوں نے میری پوجا کی ہے۔ لیکن پوجا کا سچا طریقہ ایک ہی شخص جانتا ہے۔ اور وہ تیرا دوست امیر چند ہے، جسے تو ناستک سمجھتا ہے۔ مجھے خوش کرنا ہے تو جا کر اُس سے معافی مانگ!

یہ کہہ کر بھگوان نے میری پیٹھ پر پیار سے تھپکی دی۔ دیکھتے دیکھتے مجھ پر غنودگی طاری ہو گئی۔ جب ہوش میں آیا۔ تو وہی کمرہ تھا۔ وہی مورتی، وہی لیمپ، چاروں طرف دیکھا۔ سری کرشن کہیں بھی نہ تھے۔ جانے کہاں سے آئے تھے، کہاں چلے گئے؟"

کچھ دیر دونوں دوست چپ چاپ سر جھکا کر سوچتے رہے۔ اس کے بعد امیر چند نے مسکرا کر کہا "میں سمجھ گیا۔ یہ تم نے خواب دیکھا۔ تین بجے اُٹھے تھے۔ پوجا کرتے کرتے جھپکی آ گئی۔ ورنہ ہماری ایسی قسمت کہاں

کہ سری کرشن ہمیں اپنا بھگت سمجھیں"۔

فقیر چند نے امیر چند کی طرف عقیدت مندانہ انداز سے دیکھا، اور کہا "تم اسے خواب کہتے ہو۔ میں سمجھتا ہوں۔ میری ساری زندگی میں بیداری کے یہی چند لمحے ہیں"۔

یہ کہتے ہوئے اُنہوں نے اپنے دوست کے پاؤں پکڑ لئے۔ اور کہا "پہلے تم میرے پیارے تھے، اب بھگوان کے پیارے ہو"۔

اِس وقت اُن کی آنکھوں میں آنسو لہرا رہے تھے۔

مزدور

(۱)

سارا دن یوپی کاٹن مِلز کمپنی میں مزدوری کرنے کے بعد جب کلّو شام کے سات بجے گھر پہنچا، تو سُکھیا بخار میں اُسی طرح بے سُدھ پڑی تھی۔ جس طرح وہ صبح چھ بجے چھوڑ گیا تھا۔ کلّو تھکا ماندہ آیا تھا۔ گھر آکر اور بھی اُداس ہو گیا۔ آج پندرہ دن سے یہی ہو رہا تھا۔ کاش سُکھیا کو ذرا سا افاقہ ہوتا، تو اُس کا مُرجھایا ہُوا چہرہ شگفتہ ہو جاتا اس کی تکان اُتر جاتی۔ اُس کی آنکھیں چمکنے لگتیں لیکن سُکھیا آج بھی اپنے پھٹے پُرانے کمبلوں میں اِس طرح بیہوش پڑی تھی جیسے اُس میں جان ہی نہ ہو۔ کلّو نے اُس کے بدن پر ہاتھ رکھ کر دیکھا، پنڈا الاؤ کی طرح گرم تھا۔ اُس نے آہ سرد بھری اور سر جُھکا کر زمین پر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد اُس کی بیوہ بہن ردھیا اپنے سوتے ہوئے لڑکے کو لے کر آئی اور اُسے پوال پر لٹا کر بولی "بھیا! آج بھی اِسی طرح پڑی رہی ہیں۔ رام جانے قسمت میں کیا لکھا ہے؟"

یہ کہہ کر ردھیا نے ایک پھٹا ہُوا میلا سا کمبل اُٹھایا اور لڑکے پر ڈال دیا۔

کلّو "تم نے دوا تو پلا دی تھی؟"

ردھیا "دوا کہاں ہے؟ وہ تو رات ہی ختم ہو گئی تھی"۔

کلّو "للّا بچن لال کی دُکان سے لے آتی، تو تمہارے پاؤں نہ دُکھنے لگتے۔ جرا سا تو پھاصلہ ہے"۔

ردھیا اپنے ہاتھ میں پڑے ہوئے چرڑے کے کرتے کی میل کُھرچتے ہوئے دکھائی سے بولی "وہ دیتا ہی نہیں۔ کہتا ہے، پہلے ساڑھے گیارہ آنے لاؤ۔ پھر اور اُدھار دُونگا"۔

کلّو "جرا منت کر دیتی، تو جرور دے دیتا۔ جبان کا بُرا ہے، من کا بُرا نہیں۔ اُس دن جا کر میں نے اُس سے اپنے دُکھ، درد کی دو تین باتیں کی تھیں۔ تو رونے لگ گیا تھا۔ کہتا تھا، پھکر نہ کرو۔ جو جرورت پڑے مجھ سے مانگو۔ پر تم کو کیا؟ اگر کھیال ہو تو بہت کچھ ہو جاتا ہے"۔

ردھیا نے آنکھیں نچا کر جواب دیا "ہم سے تو کھوسامد ہوتی نہیں، تمہارا مہیر یا بیمار ہے تم بیشک جا کر پیروں میں گر پڑو"۔

کلّو کو یہ بات سُن کر آگ سی لگ گئی۔ تڑپ کر بولا، "راما کے لئے گُڑ لینا ہو، تو للتا پرساد کی دُکان پر جا کر گھنٹوں بیٹھی رہو۔ مگر بھیا کے لئے دوا لانا ہو تو تمہاری عجت چلی جاتی ہے۔ اتنا بھی کھیال نہیں کہ سارا

دن کر کھٹنے میں کام کرتا ہے۔ لاؤ جرا کام کرو، بھائی مجوری کرتا ہے بہن رانی نہیں بھرتی ہے۔ پر ٹھیک ہے۔ جو تن لاگے، سو تن جانے۔ بیمار سُکھیا ہے۔ تمہیں کیا؟"

اِس وقت کلّو کے ہاتھ میں ایک ڈبہ تھا، جس میں وہ صُبح کے وقت ستّو ڈال کر مِل کو لے جاتا تھا۔ اُس کے گرد ایک بیحد میلا سا کپڑا بندھا تھا کلّو اُسے کھولنے لگا۔

روھیا بولی "پر میسر سے دُعا کرو۔ راما بیمار ہو جائے تو تمہارا کلیجہ ٹھنڈا ہو"۔

کلّو ڈبہ کونے میں رکھنے جا رہا تھا۔ بہن کی بات سُن کر وُہ وُہیں سے کوٹ آیا اور اُسی طرح ڈبہ ہاتھ میں لئے بولا "دیکھو روھیا! شام کے بکت ایسی باتیں نہ کرو۔ ہمیں گُسّا چڑھ گیا۔ تو جان سے کچھ نکل جائیگا۔ تم سُکھیا کو گیر سمجھتی ہو۔ اُس کی بدکھائی کرتی ہو۔ ہم راما کو گیر نہیں سمجھتے"۔

روھیا "طعنے دینے کو تو بڑے سیر ہو"۔

کلّو "اور تمہاری باتیں کونسی مصری کی ڈلیاں ہیں۔ کہ سُن کر جی کھُس ہو جائے جب دیکھو۔ تیر تلوار کسے رہتی ہو۔ بھابی بیمار پڑی ہے، تمہیں لڑائی سوجھتی ہے۔ جو سُنے گا، تمہیں ہی جھوٹا کہیگا۔ صُبح کا گیا اب آیا ہوں۔ کچھ کھلانے کا پھکر نہیں۔ لڑنے کو تیار ہو گئی"۔

اب روھیا کو اپنی غلطی کا احساس ہُوا، اُس نے سر جھکا لیا اور

سُکھیا کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد بولی "تم سے کہہ دیا ہے، کہ بچّن لال کی دُکان پر جاتے مجھے شرم لگتی ہے۔ جب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہے تو یہی جی چاہتا ہے کہ اُس کا خُون پی جاؤں۔ مجھے اَور جہاں کہو چلی جاؤں، پر اُس کی دُکان پر نہ بھیجو۔ ورنہ دیکھ لینا کسی دن عزّت چلی جائے گی"۔

یہ کہہ کر بڑھیا اپنی کم بختی پر رونے لگی۔ کلّو کو زہر چڑھ گیا۔ اُس کی آنکھوں سے آگ کے شرارے نکلنے لگے۔ اُس کا جی چاہتا تھا، کبھی بچّن لال کا مُنہ نہ دیکھے کبھی اُس سے بات بھی نہ کرے۔ اگر کبھی سامنے سے آجائے تو مُنہ پھیر کر چلا جائے۔ اُسے بھی معلوم ہو۔ ان میں غیرت ہے۔ غریب ہیں بے حیا نہیں ہیں۔ لیکن ——

سُکھیا بیمار تھی۔ اور کلّو کے پاس پیسے نہ تھے، اور گاؤں میں بچّن لال کے سوا دُوسرا کوئی حکیم نہ تھا۔ کلّو کے دل پر جیسے کسی نے کئی من کا پتھر رکھ دیا۔ کیا کرے۔ کیا نہ کرے۔ چاروں طرف نا اُمیدی تھی۔ اُمید کہیں بھی نہ تھی۔ آدھے گھنٹہ بعد وہ اُسی بچّن لال کی دُکان پر بیٹھا اُس کی منتیں کر رہا تھا، کہ کسی طرح دوا مل جائے۔ غیرت جوش میں آکر لڑنے کو تیار ہو گئی تھی۔ لیکن افلاس کے آہنی ہاتھوں نے اُس کا گلا گھونٹ دیا۔ اب اُس میں بولنے کی بھی قوت نہ تھی ؞

(۲)

سُکھیا کو دوا ملی، مگر اس سے کچھ افاقہ نہ ہُوا۔ بلکہ بیماری اَور بھی

خطرناک صورت اختیار کر گئی۔ پہلے پتھر کی طرح چپ چاپ پڑی تھی۔ اب تھوڑی تھوڑی دیر بعد کراہنے لگی۔ کلّو اور رودھیا دونوں دیکھتے تھے اور ٹھنڈی آہیں بھرتے تھے۔ جب سکھیا چپ ہو جاتی۔ یہ غریب بھی لیٹ جاتے۔ جب کراہنے لگتی یہ بھی اُٹھ کر بیٹھ جاتے۔ جھونپڑے میں سوائے بیماری کی افسردگی کے اور کچھ بھی نہ تھا جو رات کے وقت اور بھی بھیانک ہو جاتی ہے۔ اور پھر بیماری کی رات کاٹے نہیں کٹتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے وقت ساکن ہو گیا ہے۔ جیسے رات کبھی ختم ہی نہ ہوگی۔

رات کے دو ڈھائی بجے کا وقت تھا۔ سکھیا کراہ کراہ کر ذرا لیٹ گئی تھی۔ کلّو نے بتی کی مدھم دھوئیں دار روشنی میں اُس کے سیاہ مگر دلکش چہرے کی طرف حسرت آمیز نگاہوں سے دیکھا اور لمبی آہ بھر کر رودھیا سے کہا "رام جانے اسے کتنی تکلیف ہوتی ہوگی۔ ایسے چلاتی ہے جیسے بکرے کو کسائی کاٹتا ہے۔ کیوں رودھیا! کتنے دن ہو گئے۔ پندرہ سے جیادہ دن ہو گئے ہیں کیوں؟"

رودھیا نے آہستہ سے جواب دیا "سولھواں دن ہے بھیا!

کلّو "بڑا جالم بکھار ہے۔ کبھی اُترتا ہی نہیں"۔

رودھیا "بھگوان پر بھروسہ رکھو۔ وہ چاہے تو آج ہی اُتر جائے"۔

کلّو "چہرہ جرا سا نکل آیا ہے۔ مہینوں کی روگن مالم ہوتی ہے"۔

رودھیا۔ اس میں کیا سک ہے پر بکھار اُتر جائے تو ہفتے بھر میں تاکت آ جائے۔ پھر اُسی طرح دوڑتی پھرے گی۔ پھر اُسی طرح

سارے کام کرتی پھرے گی اس میں بڑا پرسارتھ ہے بھائی۔ پرمیسر راجی کر دے''۔

کلّو:"مجھے تو اندیسا ہے، کہ اب اس کا بھار کبھی نہ اُترے گا۔ اترنا ہوتا تو اُتر جاتا (آہ سرد بھر کر) کتنی کمجور ہو گئی ہے۔ مُنہ سے مکھی بھی نہیں اُڑا سکتی"۔

یہ کہتے کہتے کلّو کی آواز بھاری ہو گئی۔ رِدھیا نے پیار سے پھٹکار کر کہا"جی کیوں چھوٹا کرتے ہو؟ دوا دیتے چلو۔ پرمیسر کرپا کرے گا ٹھیک ہو جائے گی!"

کلّو:"بچن لال کہتا ہے دُودھ پلاتے جاؤ۔ یہ نہیں سوچتا ان گریبوں کے ہاں دُودھ کہاں سے آئیگا ستو مل جائے وہ بھی گنیمت ہے"۔

رِدھیا:"کہیں سے کرج ہی لے لو بھیّا۔ تھوڑا تھوڑا کر کے اُتار دیں گے۔ اس کی دسا تو بہت بُری ہے دُودھ نہ ملا تو مر جائے گی"۔

کلّو:"کچھ سوچتی سمجھتی بھی ہو۔ یا باتیں کرنا ہی جانتی ہو اب اور کون کرج دیگا۔ بال بال تو بندھا ہُوا ہے۔ جینا ہو گا جی جائیگی۔ مرنا ہو گا۔ مر جائیگی۔ پر اب کسی سے کرج نہ مانگا جائیگا۔ اور اگر مانگوں بھی۔ تو دیتا کون ہے؟ کہہ دینگے۔ کوئی ایک دن دے، دو دن دے، تمہارا ہر روج یہی حال ہے"۔

رِدھیا:"کرج نہ مانگو گے تو کام کیسے چلے گا (ذرا دیر چپ رہنے کے بعد) تنکھا کب ملے گی اب؟"

کلّو:- کل پنتھ ہے، کل ہی ملے گی۔ پر اُس سے کیا ہوگا۔ اِدھر آئیگی۔ اُدھر اُڑ جائیگی۔ ہم دیکھتے ہی رہ جائیں گے۔ گیارہ روپے چار آنے ملیں گے ہیں سے بیاج کا کرج ہے۔ اس پر بھی لوگ کہتے ہیں دُودھ پلاؤ۔ گنگا کا رستہ سبھی بتاتے ہیں۔ کوئی سالا ایسا نجر نہیں آتا جو گنگا جانے کا کھرچ بھی دیدے"۔

رودھیا:- یہ کھرچ تو بھگوان ہی دے اور کون دے سکتا ہے"۔

کلّو (آہ بھر کر) رودھیا! گریبوں کو بھگوان بھی نہیں دیتا وہ بھی امیروں کو دیتا ہے۔ جن کی بڑی بڑی تنکھا ہیں۔ اُن کو ہر سال ترکی ملتی ہے۔ مگر جو بھوکے مرتے ہیں اُنہیں کوئی پوچھتا بھی نہیں بڑوں سے ایسر بھی ڈرتے ہیں، بھگوان بھی ڈرتا ہے۔ ہم سے کوئی بھی نہیں ڈرتا"۔

رودھیا:- بھیّا! ایسی باتیں نہ کرو۔ پاپ لگتا ہے۔ جیسے کرم کئے ویسا پھل پا رہے ہیں۔ اس میں کسی کا کیا دوس ہے"۔

سُکھیا زور سے کراہنے لگی دونوں بہن بھائی اس کے سرہانے جا بیٹھے۔

رودھیا (پچکار کر) "کیوں بھابی! کیا تکلیپھ ہے"۔

سکھیا۔ (کراہ کر اور آواز کو لمبا کر کے) اُٹھا لے بھگوان! اب نہیں سہا جاتا۔ ہائے! ..... ہائے!!

کلّو:- سکھیا (پیار سے) سُکھیا! ہوش کرو۔ پرماتما کرپا کریں گے"۔

سکھیا (اُسی طرح کراہ کر) "اب کیا کرپا کریں گے اُٹھائیں، یہی کرپا ہے۔ آہ اِس جندگی سے تو موت بھلی۔ ہائے ..... ہائے ..... ایسا

مالم ہوتا ہے..... پیٹ میں کوئی چھریاں چلا رہا ہے۔ ہائے! بڑی تکلیپھ ہے (آخری حرف کو لمبا کر کے) رودھیا!..... بڑی تکلیپھ ہے! ....ہائے!"

کلو "جبان دانتوں تلے دبا لو۔ ہلا کرنے سے کیا بن جائیگا"۔

سُکھیا۔ (کراہتے ہوئے پہلو بدل کر) "چھما کرو بھائی!....... تمہیں کیا پتہ میری کیا دسا ہے ہائے ..... ہائے ......"

رودھیا "تکلیپھ تو نجر آ رہی ہے سامنے! (سکھیا کے منہ پر ہاتھ پھیر کر) پھکر نہ کرو بھابی! اچھی ہو جاؤگی۔ بھگوان کا نام لو۔ بھگوان کے نام سے دُکھ کٹ جاتا ہے"۔

سُکھیا۔ (بے چینی کی حالت میں زبان ہونٹوں پر پھیر کر) "اچھا! لیتی ہوں ہائے......ہائے (تھوڑی دیر چُپ ہو جاتی ہے پھر بولتی ہے) رودھیا! رات کتنی گئی ہوگی..... ہائے..... ہائے..... ہائے..... جرا دو گھونٹ پانی تو پلا دو..... جبان سُوکھ کر لکڑی ہو گئی ہے۔ جرا ٹھنڈا پانی دیدو بہن..... بڑی پیاس لگی ہے... ہائے ہائے!"

رودھیا نے کلو کی طرف دیکھا گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں دریافت کیا۔ پانی دُوں یا نہ دُوں۔ کلو بولا "کیا حرج ہے۔ بچن لال نے کہا تھا۔ پانی بلاسک دو"۔

رودھیا نے اُٹھ کر کٹوری میں پانی بھرا اور سُکھیا کے پاس آ کر بولی۔

"لو پانی پی لو بھابی! مگر جیادا نہ پینا - نکسان کرے گا"۔

یہ کہہ کر اُس نے پانی کی کٹوری زمین پر رکھ دی - اور ہاتھ کا سہارا دے کر رودھیا کو اُٹھایا اور اُس کے سر کے گرد پھٹا ہُوا کمبل لپیٹ دیا۔

رودھیا نے پانی کی کٹوری کو بچّوں کی سی بے تابی سے لیا اور سارا پانی ایک ہی گھونٹ میں ختم کر دیا - سُکھیا بس بس کرتی ہی رہ گئی - لیکن پیاسا مریض پانی کب چھوڑتا ہے!

رودھیا کراہ کراہ کر نڈھال ہو گئی تھی اُسے پانی پی کر جیسے قرار سا مل گیا - چُپ چاپ آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی - کلّو اور سُکھیا ساری رات جاگتے رہے تھے - اُن کو بھی نیند آ گئی - لیکن تھوڑی دیر بعد رودھیا پھر کراہنے لگی - دونوں آنکھیں مَلتے ہوئے پھر اُٹھ کر بیٹھ گئے۔

(۳)

صُبح کے وقت سردی اِتنی تھی کہ ہاتھ پاؤں اکڑے جاتے تھے - جی چاہتا تھا، بستر سے باہر نہ نکلیں - لیکن مزدوروں کی قسمت میں آرام کہاں! کلّو اندھیرے مُنہ اُٹھ بیٹھا - پہلے اُس نے ایک پُرانا کپڑا جلا کر چلم سُلگائی اور کچھ دیر تمباکو پیا - اس کے بعد حوائجِ ضروری سے فارغ ہُوا - پھر ایک موٹا کُرتا، ایک پُرانی ٹوپی اور گھٹنوں تک آدھی میلی دھوتی - جسے کئی جگہ پیوند لگا ہُوا تھا - پہنی اور ایک پانچ چھ سال کی پُرانی لوئی اوڑھ لی - اِس کے بعد اُس نے آہستہ سے تاکہ کہیں سکھیا کی آنکھ نہ کھُل جائے - رودھیا کو جگایا - اور کہا "لو! میں چلتا ہوں کچھ ستو اہے یا نہیں؟

لے آؤ رات روٹی بھی نہیں کھائی جما گُڑ بھی دیدینا۔ کھسک ستوا گلے سے نیچے نہیں اُترتا"۔

رودھیا نے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا "تم گُڑ کو روتے ہو یہاں ستوا بھی ختم ہو گیا۔ چنے کی کچّی دال ہے کہو۔ وہ باندھ دُوں۔ بھگو کر کھا لینا"۔

کلّو کا غمگین چہرہ اور بھی غمگین ہو گیا مری ہوئی آواز میں بولا "چلو وہی باندھ دو"۔

رودھیا نے ایک پُرانے کپڑے میں دال باندھ کر پوٹلی بھائی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا "اب گھر میں اناج کا دانہ بھی نہیں ہے۔ تنخواہ لاؤ گے تو شام کو کچھ بن جائیگا۔ وُہیں بانٹ آئے تو آج بھی چُولھا گرم نہ ہو گا"۔

کلّو نے کچّی دال کی پوٹلی کو ہاتھ میں لے کر نگاہ حسرت سے اُس کی طرف دیکھا اور کہا "رودھیا میں آدمی ہوں، کسائی نہیں ہوں تو اور راما بُھوکے رہو اور میں کھاؤں۔ ایسا بے شرم ابھی نہیں ہُوا ہوں۔ لو پکڑو۔ سُکھیا کو دوا دیتے رہنا۔ اور کیا کہوں؟"

رودھیا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ گردن کو کُھجلاتے ہوئے بولی۔ "نہیں بھیا! رات بھی بھوکے رہے ہو۔ آج بھی کچھ نہ کھاؤ گے تو کام کیسے کرو گے؟ بھیّا! ہمارا گجارہ ہو جائیگا۔ تم دال لے جاؤ"۔

لیکن کلّو نے سُنی اَن سُنی کر کے پوٹلی لوٹا دی اور ننگے پاؤں گھر سے باہر نکل آیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ کئی اور مزدوروں کے ساتھ بل کی طرف جا رہا تھا۔ دُوسرے مزدور ہنستے تھے، گاتے تھے، ایک دُوسرے کے ساتھ مذاق کرتے تھے، کلّو بالکل خاموش تھا۔ نہ بولتا تھا۔ نہ ہنستا تھا۔ چُپ چاپ چلا جاتا تھا۔ جیسے اُس کے مُنہ میں زبان نہ ہو۔ اُس کے ساتھی چاہتے تھے وہ بھی ہنسے، بولے، گیت گائے، آج تنخواہ کا دن ہے۔ شام کو سب کی مُٹھی گرم ہو گی۔ آج سب کو روپے ملیں گے۔ لیکن کلّو کو اُن روپوں کی ذرا خوشی نہ تھی۔ وہ روپے لیگا اور دُوسروں کو بانٹ دیگا۔ اُس کے پاس پیسہ بھی نہ رہے گا۔

مہابیر نے آ کر کلّو کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا "اُداس کیوں ہو بھیا؟ بولتے ہی نہیں کیا بات ہے"۔

گھیسو نے ہمدردی کے انداز سے کہا کیا بولے بھائی! گریب کی مہیریا بیمار ہے۔ کئی دن سے بُکھار آ رہا ہے اب کیا حال ہے کلّو! ابھی اُترا یا نہیں؟

کلّو نے آہِ سرد بھر کر جواب دیا "بھگوان چاہیگا تو اُتر جائیگا"۔

مہابیر "علاج کس کا ہے۔ اُسی بچن لال کا یا کسی اور کا"۔

کلّو "علاج کیا ہے؟ من کی دوڑ ہے۔ ہم مجبور لوگ کیا علاج کریں گے؟ علاج کے لئے روپے چاہئیں اور روپے ہمارے پاس نہیں"۔

گھیسو "آج تو تنخواہ ملے گی"۔

کلّو "تنکھاہ سے جیا دا کرج دینا ہے۔ اُسی بکت آ کر گھیر لیں گے"۔

مہابیر: "کسی کو ایک پیسہ نہ دینا۔ کہنا میری مہریا بیمار ہے۔ اگلی تنخواہ پر دُونگا"۔

کلّو: "لڑنے کو تیار نہ ہو جائیں گے"۔

گھیسو: "ہو جائیں تمہاری بلا سے مہریا کا علاج تو کر سکو گے۔ پہلے بیماری کا علاج پیچھے لینا دینا۔ اگر مرگئی روتے پھرو گے۔ مدا یہ بکت ہاتھ نہ آئیگا"۔ کلو نے پاس سے گزرتے ہوئے ایک تانگے کی طرف دیکھا اور گھیسو سے مخاطب ہو کر بولا: "بڑا کرج ہے بھیا! مرجاؤں گا۔ تم گیت گاتے تھے میرا جی رونے کو چاہتا تھا"۔

مہابیر نے گھیسو کو پرے ہٹایا اور آپ اُس کے پاس آکر بولا: "ایک بات کرو۔ سنہا صاحب کو درکھاس دیدو۔ کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا"۔

گھیسو: "خوب سوچا۔ ولایت جا رہا ہے۔ اس بکت جرور کچھ نہ کچھ دے مرو گے بھیّا۔ درکھاس میں یہ صاپھ صاپھ لکھ دینا کہ پندرہ برس یہاں کام کرتے کرتے گجر گئیں۔ اب سر پر کرج چڑھ گیا ہے تو کہاں جاؤں۔ سرکار مائی باپ ہیں، مدت کریں کیوں عبدل تمہارا کیا کھیال ہے؟"

عبدل اب تک چُپ چاپ چلا جا رہا تھا۔ اُس نے گھیسو کی بات سُن کر کہا: "عرجی کس سے لکھواؤ گے؟"

کلو کو کچھ امید ہو چلی تھی۔ بولا: "کادر بابو سے نہ لکھوالیں۔ بڑا ودیادان ہے۔ انگریجی پھارسی سب کچھ جانتا ہے"۔

مہابیر: "بس بس ٹھیک ہے اُسی سے لکھواؤ۔ سارے دبدرے میں ایسا

آدمی اور کوئی نہیں ہے"۔

گھیسو:- "مہیریا کی بیماری کا جرور بیان کرنا۔ سنہا صاحب پر اس کا بہت اثر ہو گا"۔

عبدل:- "یہ بات تو تم نے میرے منہ سے چھین لی۔ میں بھی یہی کہنے جا رہا تھا۔ کادر بابو کو سمجھا دینا۔ کہ ایسی عرجی لکھے جو دل میں بیٹھ جائے"۔

مہابیر:- "لو اب پھکڑ چھوڑ ایک گیت سنا دو۔ ابھی تو آدھا پہا سلہ بھی کھتم نہیں ہوا"۔

کلّو:- "بھیّا آج ما پھ کر دو۔ جراجی نہیں چاہتا"۔

گھیسو:- "واہ جی کیسے نہیں مانتا۔ اگر رونے سے تمہاری مہیریا کا بکھار اُترتا ہو تو ہم سب رونے کو طیار ہیں۔ مُدا اس سے ہوتا کیا ہے تم رنج ہو کر آپ بھی بیمار ہو جاؤ گے۔ جلد سرُع کرو کوئی اچھا سا گیت"۔

کلّو نے عبدل اور مہابیر کی طرف التجا آمیز نگاہوں سے دیکھا جیسے پولیس کے پنجہ میں پھنس کر مُلزم اپنے یار دوستوں کی طرف دیکھتا ہے کہ شاید کسی کی سفارش کارگر ہو جائے۔ کلّو کی بے بس نگاہیں کہتی تھیں کیا یہ وقت گیت گانے کا ہے؟ لیکن عبدل اور مہابیر دونوں گھیسو کے ہم خیال نکلے۔ کلّو کو مجبوراً گانا پڑا۔ گاتے گاتے اُسے اپنا سارا دُکھ درد بھول گیا۔ اب ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے کوئی فکر کوئی تردّد نہیں۔ جیسے اُسے زندگی کی ساری فارغ البالیاں حاصل ہیں۔ جیسے وہ آزاد پنچھی کے مانند

خوش و خُرّم ہے +

(۴۲)

بارہ بجے کا وقت تھا۔ مزدور دو دو چار چار کی ٹولیاں بنا کر دھوپ میں بیٹھے اپنا ستوا کھاتے تھے۔ جن کے پاس ستوا نہ تھا۔ وہ کچّی دال اور سبز مرچ کھا رہے تھے۔ کلّو کے پاس کچھ بھی نہ تھا نہ دال نہ ستوا۔ لیکن اُسے اس کی پروا نہ تھی۔ وہ قادر بابو سے درخواست لکھوا رہا تھا اُسے اُمید تھی سنہا صاحب اُس کی ضرور سُن لینگے۔ اِس خوشی میں اُسے کھانا پینا بھی نہیں سوجھتا تھا۔ جب ایک بجے انجن چلا اور وہ اپنی مشین پر آیا۔ تو اُس کے چہرے پر اُمید کی روشنی جھلک رہی تھی۔ آج اُس کا دِل کام میں نہ لگتا تھا۔ بار بار دروازوں کی طرف دیکھتا تھا کہ چپڑاسی بُلانے آیا ہے یا نہیں آخر تین بجے کے قریب سنہا صاحب نے اُسے بلا بھیجا۔ کلّو کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ اُمید اُسے اپنے اِس قدر قریب کبھی نظر نہ آئی تھی اُس نے جاتے جاتے مہابیر کی طرف پُر امید نگاہوں سے دیکھا اور مُسکرایا۔ گویا کہا لو دیکھ لو کام بن گیا ہے +

سنہا صاحب کے کمرہ کے باہر پُہنچ کر کلّو نے اپنے منّی سے لت پت پاؤں صاف کئے۔ کانپتے ہوئے ہاتھ سے دروازہ کا پردہ ہٹایا اور اندر چلا گیا +

سنہا صاحب کرسی پر بیٹھے بجلی کے لیمپ کی روشنی میں کاغذوں پر دستخط کر رہے تھے اور اُن کے سگار کا دھواں چکّر کھا کر چھت کی طرف

جارہا تھا +

کلّو نے جھک کر دونوں ہاتھوں سے سلام کیا۔ اور چپ کھڑا ہوگیا +

سنہا صاحب نے سلام کا کوئی جواب نہ دیا۔ اور کاغذات پر دستخط کرتے رہے۔ اتنے میں اکؤنٹنٹ نے آکر ایک کاغذ صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ یہ سنہا صاحب کی چھ مہینے کی تنخواہ اور سفر خرچ کا حساب تھا۔ جو وہ اپنے ساتھ ولایت لے جانا چاہتے تھے۔ صاحب نے کاغذ پر نگاہ ڈالی اور کہا "نو ہزار پانسو تیرہ روپیہ"+

اکؤنٹنٹ "جی حضور!"

صاحب "ہماری سیٹ بک ہوگئی؟"

اکؤنٹنٹ "جی حضور ہوگئی۔ تھامس کُک کا آج ایک تار بھی آگیا ہے"+

سنہا صاحب نے سگار کا ایک کش لگایا اور بل پر دستخط کر دیئے۔ اکؤنٹنٹ سلام کر کے چلا گیا۔ صاحب نے کرسی کے ساتھ پیٹھ لگا کر سگار کا دھواں چھت کی طرف اڑایا اور انگریزوں کی طرح بولے "ویل کلّو کیا بولنے مانگتا؟"

کلّو "ججور میں نے درکھاس دی تھی"+

صاحب "تمہارا اپیلی کیشن ہمارا پاس ہے۔ مگر تم منہ سے بولو۔ کیا مانگتا؟"

کلّو "ججور! میں نے کمپنی کی پندرہ سال کھدمت کی ہے آجکل بڑی تکلیپھ میں ہوں سرکار! مجھ پر بڑا کرج ہوگیا ہے۔ مرا جاتا ہوں۔ کچھ مدت مل جائے تو جی جاؤں۔ ہاں مائی باپ! آپ کی جان کو

دُعائیں دیتا رہوں گا"۔
یہ کہہ کر کلّو نے دونوں ہاتھوں سے پھر سلام کیا۔
صاحب۔ (درخواست کو پڑھتے ہوئے) "تمہارا نوکری پندرہ سال کا ہے۔
اپنا کمائی کیا کرتا رہا ہے۔ تاڑی پیتا رہا ہے۔ جُوا کھیلتا رہا ہے۔
بولو کیا کرتا رہا ہے؟"
کلّو۔ "سرکار! میں نے کبھی جُوا نہیں کھیلا۔ کبھی تاڑی نہیں پی۔ بہت گریب
ہوں سرکار! میری عورت سخت بیمار ہے"۔
صاحب۔ "اوہ! ہمیں اپھسوس ہے، تمہارا عورت بیمار ہے۔ ڈاکٹر کا
دوائی دو۔ ورنہ وہ مر جائیگا۔ سُنا تم نے ڈاکٹر کا دوائی دو۔ دیسی
حکیم بیوکوف ہوتا ہے۔ وہ کچھ نہیں جانتا"۔
کلّو۔ "ہاں سرکار! کچھ مدد مل جائے تو ڈاکٹر کا علاج کروں۔ بڑا گریب
ہوں سرکار! آپ کی جان کو دُعائیں دیتا رہوں گا۔ پندرہ سال
سے ججور کی کھدمت کر رہا ہوں"۔
صاحب۔ "ہم کو افسوس ہے کمپنی کچھ نہیں کر سکتا، اِس سال کمپنی کو کئی
لاکھ کا نقصان رہا ہے۔ بڑا منیجر صاحب کہتا ہے۔ ہم کچھ نہیں
کر سکتا۔ جاؤ اپنا کام کرو...... جاؤ"۔
یہ کہہ کر سنہا صاحب نے ایک موٹا سا فائل اُٹھایا اور اُسے دیکھنے
میں محو ہو گئے۔ کلّو چُپ چاپ باہر نکل آیا۔ اِس درخواست پر کیا کیا
اُمیدیں تھیں۔ سب پر پانی پھر گیا۔ اب اُس کے سامنے پھر وہی نااُمیدی

اور اندھیرا تھا۔ اس کے سامنے مکان ہوا میں تیر رہے تھے۔ زمین آسمان چکر کھا رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ دُنیا اُلٹ جائے گی — وہ ٹوٹے ہوئے دل سے اپنا کام کرنے لگا ⁂

تھوڑی دیر بعد مل کے سارے مزدوروں میں سنسنی سی پھیل گئی۔ معلوم ہُوا۔ کمپنی نے ڈیڑھ سَو مزدوروں کو نوٹس دیدیا ہے۔ اور چپڑاسی نوٹس کے لفافے لے کر آ رہا ہے۔ جس جس نے سُنا اُسی کا رنگ فق ہو گیا۔ ہر ایک ڈرتا تھا کہ کہیں اُس کو جواب نہ مل گیا ہو۔ سارے مزدور دل میں منّتیں مان رہے تھے۔ پرماتما سے پرارتھنا کر رہے تھے۔ کہ اس فہرست میں ہمارا نام نہ ہو۔ سہم اتنی تھی۔ کہ کوئی آگے بڑھ کر اتنا بھی نہ پوچھتا تھا کہ کس کس کو جواب ملا ہے۔ ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ ہر ایک چاہتا تھا۔ کہ یہ خبر جھوٹی ہو۔ آج بچ جائیں تو شکر کریں، کیسے آرام سے بیٹھے تھے۔ یہ پتہ نہ تھا کہ بدنصیبی گھات میں ہے۔ جواب مل گیا تو کیا کریں گے؟ کدھر جائیں گے؟ آجکل بیکاری کے زمانہ میں نوکری کہاں ملے گی؟

معاً ایک چپڑاسی کمرے میں داخل ہُوا۔ سب کی آنکھیں اُس کی طرف اُٹھ گئیں —— یہ وہی تھا اُس کے ہاتھ میں کئی لفافے تھے۔ مگر یہ لفافے نہ تھے غریبوں کی مَوت کے وارنٹ تھے۔ یہ چپڑاسی نہایت ہنس مُکھ تھا، نہ کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔ بات بات میں ہنستا تھا۔ آج اُس کی شکل جمدوت سے بھی بھیانک تھی۔ جس کے پاس رُک کر

لفافہ نکالتا۔ وہ کانپ جاتا۔ جس کے پاس سے گزر جاتا۔ اُس کی جان میں جان آجاتی۔ سمجھتا اِس وقت تو بھگوان نے بچا لیا۔ کلّو اور مہابیر دونوں ساتھ ساتھ کام کرتے تھے۔ چپڑاسی آکر مہابیر کے پاس رُک گیا اور اُس کے نام کا لفافہ تلاش کرنے لگا۔ مہابیر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے مری ہوئی آواز میں پوچھا "میرے نام کا بھی لفافہ ہے؟"

چپڑاسی نے دلی ہمدردی سے کہا "بھیّا! چھری پھر گئی ہے۔ ڈیڑھ سو آدمی کاٹ کے رکھ دیا ڈیڑھ سو! بھگوان جانے یہ لوگ کیا کو بن گئے؟"

مہابیر نے لفافہ لے لیا اور سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا گویا کسی کے مرنے کی خبر سُن لی ہو۔ ابھی چند منٹ پیشتر سان گمان بھی نہ تھا۔ کہ یہ ہو جائیگا۔ چہچہاتا ہُوا پنچھی یکایک شکاری کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ اِدھر کلّو کا دم گھُٹ رہا تھا۔ سوچتا تھا۔ دیکھیں مرتا ہوں، یا بچتا ہوں۔ ایسا خوش نصیب تو نہیں کہ قتل عام ہو اور مَیں بچا رہوں۔ غریبوں کی قسمت میں ایسی خوش نصیبی کہاں؟ لیکن شاید ——

اُسی وقت چپڑاسی نے ایک لفافہ نکال کر کلّو کے سامنے بھی رکھ دیا۔ کلّو پر بجلی سی گر پڑی۔ اُس کے لبوں پر آہ تک نہ تھی۔ نہ آنکھ میں آنسو کا قطرہ تھا۔ لیکن کلیجہ میں ایسا معلوم ہُوا جیسے کسی نے دُور تک چھری اُتار دی ہے۔ معمولی درد ہو تو مریض روتا چلّاتا ہے۔ غیر معمولی درد ہو تو بیہوش ہو جاتا ہے۔ اُس وقت اُس میں چلّانے کی قوت ہی نہیں رہتی۔ اُس وقت

وہ صرف بے معنی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہے۔ اور اُس کے دل سے دُھواں اُٹھتا معلوم ہوتا ہے +

اِس کے بعد تنخواہ تقسیم ہوئی۔ لیکن آج تنخواہ کے وقت وہ چہل پہل نہ تھی جو پہلے ہُوا کرتی تھی۔ سب کے دل بُجھے ہوئے تھے۔ جن کو جواب مِل گیا وہ تو روتے ہی تھے۔ جو بچ گئے تھے اُن کے چہروں پر بھی مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ کون جانے کل کیا ہوگا؟ تخفیف شروع ہوتی ہے تو ایک دن میں تھوڑی ختم ہو جاتی ہے دوسرے دن کے متعلق بھی بڑے زوروں کی افواہیں تھیں +

(۵)

کلّو کے تنخواہ لیتے ہی ایک مزدور نے آکر کہا۔ "کیوں بھیّا! دیتے ہو ایک روپیہ جو تم نے پچھلے مہینے لیا تھا۔ آج بڑی جرورت ہے۔ ہمیں بھی جواب ہو گیا"+

کلّو نے چُپ چاپ ایک روپیہ اُس کے حوالے کر دیا۔ مُنہ سے ایک لفظ تک نہ کہا۔ کسی دُوسرے وقت وہ شاید انکار کر دیتا۔ شاید منت خوشامد کرتا۔ لیکن اس وقت کیسے انکار کرے؟ اُس میں بولنے کی ہمّت ہی نہ تھی +

باقی روپے اُس نے دھوتی کی انٹی میں رکھ لئے اور بے دلی سے مشین پر کھڑا ہو کر کام کرنے لگا۔ ناگاہ ایک دُوسرا مزدور آکر سامنے کھڑا ہو گیا۔ کلّو نے اُسے دیکھا، اور انٹی سے سوا روپیہ نکال کر چُپ چاپ اُس کے

حوالے کر دیا۔ اور باقی روپے سامنے مشین پر ہی رکھ دیئے۔ کہ شاید ابھی کوئی اور قرضخواہ آ جائے۔ مریض نا اُمید ہو کر پرہیز چھوڑ دیتا ہے۔ کلّو بھی اُس وقت نا اُمید ہو چکا تھا۔ اُسے دو اور مزدوروں کا بھی قرض چکانا تھا۔ لیکن وہ نہ آئے۔ اور "چھٹی" ہو گئی۔ کلّو نے بچے ہوئے روپے پھر انٹی میں رکھ لئے اور سر نیچے ڈال کر آہستہ آہستہ مل سے باہر نکلا۔ اور دن "چھٹی" ہوتی تھی تو مزدور اُچھلتے کودتے ہوئے باہر نکلتے تھے۔ آج سب کے سب چپ تھے۔ جیسے کسی مُردے کو جلا کر لوٹ رہے ہوں۔ اُسی طرح دھیرے دھیرے چلتے تھے۔ اُسی طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تھے اور ٹھنڈی آہیں بھر کر گردن جھکا لیتے تھے۔ اُسی طرح ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے تھے ؛

معاً کسی نے کلّو کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ کلّو نے سر اُٹھا کر دیکھا تو اُس کی جان ہی نکل گئی۔ سامنے موت سے بھی بھیانک پٹھان ہاتھ میں ایک لمبی لاٹھی لئے کھڑا تھا۔ اُس نے کلّو کو گریبان سے پکڑ لیا اور کہا۔ برادر! پانچ روپیہ لاؤ۔ ہم آج کچھ نہ سُنے گا"؛

کلّو حیران ہو کر سوچنے لگا۔ دُوں یا نہ دُوں ؟ پہلے سوچا۔ دیدوں۔ جب سب کچھ ہی چلا گیا ہے۔ تو یہ بھی کیوں رہ جائے۔ جو ہوگا دیکھا جائیگا پھر خیال آیا۔ گھر میں بیوی بیمار ہے۔ اور بہن اور بھانجا بھوکے ہیں جب خالی ہاتھ گھر پہنچوں گا وہ کیا کہیں گے۔ اور پھر وہاں بھی تو بنئے کو، حکیم کو اور ساہوکار کو دینا ہے۔ سب رستہ دیکھ رہے ہونگے ایک

ایک روپیہ بھی دُوں تو اُن کا مُنہ بند ہو جائیگا۔ پھر وہ ہفتے تک اُدھار لینے کا ٹکانا بن جائیگا۔ ورنہ ——————

کلّو کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آگیا *

پٹھان نے جواب نہ پاکر کلّو کو زور سے جھنجوڑا اور کہا "خر بچّہ! پانچ روپیہ لاؤ۔ پانچ روپیہ۔ پچھلے مہینے ہم اِدھر کھڑا رہا۔ تم دھوکا دے کر دُوسرے دروازہ سے نکل گیا۔ اب بولو، کلّو کیا بولتا۔ اُس کے مُنہ میں زبان ہی نہ تھی۔ اُس نے دلوں کو چھید دینے والی نگاہوں سے پٹھان کی طرف دیکھا۔ لیکن پٹھان بے دل کا آدمی تھا اُس پر ذرا بھی اثر نہ ہُوا اُس نے اسے ایکمرتبہ پھر جھنجوڑا۔ اور کہا "او خر بچہ! سُنتا نہیں۔ ہم اپنا سُود کا روپیہ مانگتا ہے۔ نکال کے رکھ دے۔ ورنہ خدا کا قسم ہم تجھے قتل کر دے گا"*

اُن کے اردگرد کئی آدمی جمع ہو گئے تھے۔ اُن میں سے ایک نے آگے بڑھ کر کہا "او آغا! کیا بات ہے تُو قتل کیوں کر دے گا۔ اِس کا کپڑا چھوڑ دے"*

آغا "نہیں بابو صاحب! یہ بھاگ جائیگا"*

بابو "نہیں بھاگے گا۔ مُنہ سے بات کرو"*

یہ کہہ کر بابو صاحب نے آغا کے ہاتھ سے کلّو کا گریبان چُھڑا دیا۔ اور کہا "اب بولو۔ کیا بات ہے؟ تمہارا روپیہ نکلتا ہے اِس کی طرف۔ کتنا روپیہ ہے؟

کلّو ہانپتا ہُوا ایک طرف کھڑا ہو گیا *

آغا۔"ہاں بابو صاحب! دس روپیہ نکلتا ہے۔ دو سال سے نکلتا ہے۔ پہلے سُود دیتا تھا اب سُود بھی نہیں دیتا۔ دو مہینا ہو گیا ہے۔ ہم نے پچھلا مہینا کچھ نہیں لیا"۔

بابو۔"تم دس روپے پر کتنا سُود ماہوار لیتا ہے"۔

آغا۔"صرف اڑھائی روپیہ بابو صاحب۔ بیشی نہیں لیتا"۔

بابو۔"یہ بیشی نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ دس روپیہ دے کر تم دو سال میں ساٹھ روپیہ لے چکا ہے۔ اور کیا اس کی جان لوگے چھوڑ دو اسے جانے دو"۔

آغا۔"نہیں بابو ایسا ظلم نہ کرو۔ ہم مر جائیگا۔ ہم غریب آدمی ہے۔ ہمارا دو مہینا کا سُود ہے۔ وہ دیدے ہم اپنا رقم نہیں مانگتا۔ سُود مانگتا ہے"۔

ہجوم میں سے ایک آدمی نے کہا۔"یہ آغا لوگ مہاجنوں کے بھی گُرو نکلے پچیس فیصدی ماہوار سُود توبہ۔ توبہ"۔

دُوسرا بولا"مگر ان سے لوگ لیتے کیوں ہیں۔ یہ زبردستی تو نہیں دیتے۔ سَو مرتبہ مانگتے ہیں۔ تب جا کر ایک مرتبہ دیتے ہیں"۔

تیسرا۔"اجی یہ بیوقوف ہیں حساب ہی نہیں کرتے"۔

چوتھا۔"بیوقوف ہیں۔ تو پھر دیں۔ آغا کبھی نہ چھوڑے گا اُس نے سُود پہلے طے کر لیا ہے کیوں آغا!"

آغا۔(دلیر ہو کر)"ہاں صاحب! پہلے کہہ دیا تھا۔ اس سے پُوچھ لو۔

او بھیا! کہا تھا یا نہیں۔ ہمارا پاس کاغذ لکھا ہوا ہے۔ اس کا انگوٹھا لگا ہے"۔

ایک آدمی نے کہا "انگوٹھے سے کیا ہوتا ہے۔ مقدّمہ عدالت میں جائے۔ تو صاف ڈسمس ہو جائے عدالت کبھی اتنا سُود نہیں دلا سکتی۔ یہ سُود نہیں قہر الٰہی ہے"۔

آغا۔ (جھلّا کر) "قہر الٰہی کیا ہے، ہم کسی کے گھر جا کر نہیں دیتا جسے غرض ہوتا ہے سو بار آ کر ناک رگڑتا ہے۔ تب دیتا ہے"۔

بابو۔ "لیکن آغا! یہ سُود بہت زیادہ ہے تم نے اسے دس دیئے اور ساٹھ لے لئے اب اور کیا مانگتے ہو۔ چھوڑ دو غریب کو"۔

آغا۔ (آنکھیں نکال کر) "کیوں چھوڑے۔ نہیں چھوڑے گا اپنا روپیہ لیگا۔ تم خدا ترس ہے تو اپنے پاس سے دیدو۔ یہ غریب ہے تو ہم بھی غریب ہے"۔

بابو۔ (کلّو سے) کیوں بھیّا! تمہارے پاس ہیں پانچ روپے دیدو اِس وقت۔ کل میرے پاس آنا۔ میں بابو لوگوں سے کہہ کر چندہ کرا دوں گا اور تمہارا پنڈ چھڑا دوں گا"۔

کلّو نے چُپ چاپ پانچ روپے نکال کر دیدیئے۔ آغا مطمئن ہو کر بولا "اب تم اچھا آدمی ہے۔ ہم اپنا رقم کبھی نہ مانگے گا۔ سُود دیتے چلو۔ اچھا سلام"۔

کلّو کو ایسا معلوم ہُوا گویا اُس نے روپے نہیں دیئے، بلکہ اپنے

پران نکال کر دیدیئے ہیں۔ مجمع منتشر ہُوا تو وہ پھر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ دُوسرے مزدور آگے نکل گئے۔ وہ سب سے پیچھے رہ گیا لیکن اُسے اِس کی ذرا بھی پروا نہ تھی اُس کی جیب میں اب صرف چار روپے تھے سوچتا تھا۔ گھر میں جا کر کیا دُونگا۔ بڑھیا جب اپنی جلتی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھے گی۔ تو کیا کرونگا؟ کلّو ویرانے میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ اور اپنی تاریک دُنیا کے تاریک خیالات میں غرق ہوگیا۔ صبح بھی اُس کے پاس کچھ نہ تھا۔ مگر اُمید تو تھی۔ اِس وقت اُمید بھی نہ تھی۔ کلّو تنہائی میں پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگا۔

رات ہوگئی تھی۔ ٹھنڈی ہوا ہڈیوں میں گھُسی جاتی تھی آسمان پر کالے کالے بادل لہرا رہے تھے۔ مگر کلّو کو اس کی ذرا پروا نہ تھی اُسے صرف ایک فکر تھا۔ اب کیا ہوگا؟ گاؤں کا آدھا قرض بھی چکا دے تو اس کے پاس کچھ نہ بچے گا۔

معاً ایک سایہ سا آ کر اُس کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ یہ گھیسو تھا۔ اُس نے اُسے اِس درخت کے نیچے دیکھا تھا۔ جب اتنی دیر ہوگئی اور وہ گھر نہ پہنچا۔ تو وہ اُسے ڈھونڈھنے نکلا۔ کلّو بولا "کون ہے؟"

گھیسو نے جواب دیا! "میاں تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ چلو گھر چلو۔ نوکری چھُوٹ گئی ہے تو کیا ہُوا۔ ہمارا پرماتما تو نہیں مر گیا۔ جو پشو پنچھیوں کو دیتا ہے۔ وہ ہمیں بھی دیگا۔ چنتا بے فضول ہے۔ چلو"

کلّو چُپ چاپ اُس کے ساتھ ہو لیا۔ کچھ دُور جا کر اُس نے پُوچھا۔

"سکھیا کا کیا حال ہے؟"

گھیسو نے سوچا۔ بتاؤں یا نہ بتاؤں۔ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر بولا:- وہ تو چار بجے مر گئی۔ لاش رکھی ہے تم نہیں تھے۔ اس لئے نہیں جلائی"۔

کلو نے جواب نہ دیا۔ اندھیرے اور سردی میں چپ چاپ اُسی طرح چلتا رہا۔ اِس وقت اُسے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے اُس کے سر سے بوجھ اُتر گیا ہے۔

اب اُسے نوکری چھوٹ جانے کا ذرا بھی رنج نہ تھا۔

طرزِ عمل

(۱)

کانپور ٹبا کو کمپنی کے منیجر مسٹر الیف کے سالون نہایت بد مزاج آدمی تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر بگڑتے تھے۔ اور کلرکوں کو گالیاں دینے لگتے تھے۔ ذرا کوئی بلند آواز سے بولا، اور سالون صاحب کی آنکھیں لال ہو گئیں۔ کسی کو دفتر پہنچنے میں پانچ منٹ کی دیر ہوئی اور آپ کی طبیعت بگڑ گئی۔ کسی سے کوئی معمولی سی بھی غلطی ہوئی۔ اور جناب نے اُسے بُلا کر ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دی "دیکھو بابو! تم نے پھر حماقت کی۔ کیا تم اندھے ہو؟ اگر اب کے ایسی غلطی ہوئی تو سر توڑ دونگا۔" وہ غریب ہزار عذر کرے" لاکھ اپنی صفائیاں پیش کرے۔ لیکن صاحب بہادر کچھ سُنتے ہی نہ تھے۔ اگر کوئی زیادہ بولتا تھا تو ہاتھوں سے بھی خبر لینے میں پس و پیش نہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جناب نے ایک معزز کلرک کے منہ پر قلمدان دے مارا سارا چہرہ لہولہان ہو گیا۔ طیش تو بہت آیا لیکن کیا کرتا خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا اگر بولتا۔ تو دس سال کی ملازمت پل میں چلی جاتی۔ یہاں

سوا سو پاتا تھا۔ دوسری جگہ کوئی چالیس بھی نہ دیتا۔ گھر کے لوگ بھوکوں مر جاتے ایک مرتبہ ایک بابو نے لکھنے کے بادامی کاغذ سے اپنا بوٹ صاف کر لیا صاحب بہادر نے پانچ روپیہ جرمانہ کر دیا۔ معافی مانگنے گیا تو کان پکڑ کر باہر نکال دیا۔ روتا ہوا آیا اور اپنی جگہ بیٹھ کر کام کرنے لگا۔ ایک بابو لکشمی نارائن تھے۔ جو صاحب کے منہ لگے ہوئے تھے۔ اس کی بھی ایک وجہ تھی۔ لکشمی نارائن کے ذریعہ صاحب کو دفتر کی ہر ایک خبر مل جاتی تھی کون کس خیال کا ہے؟ کون کیا کہتا ہے؟ یہ سب باتیں صاحب بہادر کو بابو لکشمی نارائن مہیا کر دیا کرتے تھے۔ اس کار خاص کی بدولت صاحب بہادر آپ پر بیحد خوش تھے۔ لیکن دوسرے کلرکوں کا خدا حافظ تھا۔ جس کسی کو صاحب بلا بھیجتے اس کی شامت آ جاتی تھی۔ اس طرح لوگ دبتے جاتے تھے، صاحب بہادر کے حوصلے بڑھتے جاتے تھے۔ کسی میں اتنی مجال ہی نہ تھی کہ دم مار جائے ؟

اسی زمانہ میں اس دفتر میں ایک نئے ٹائپ بابو آئے رام گوپال تواری۔ کم گو آدمی تھے، نہ کسی کے لینے میں، نہ کسی کے دینے میں، مگر اپنے کام میں بہت ہوشیار آدمی تھے۔ اُن کی ٹائپ کی ہوئی چٹھیاں دیکھ کر سالون صاحب خوش ہو جاتے تھے۔ اور اتنا ہی نہیں۔ اُن کی رفتار بھی قابل ستائش تھی۔ جتنے وقت میں دوسرے ٹائپسٹ دس چٹھیاں ٹائپ کرتے۔ اُتنے وقت میں رام گوپال بیس چٹھیاں ٹائپ کرتے تھے اور پھر تھکنا نہ جانتے تھے۔ جتنا کام ملتا اُسے ختم کر کے اُٹھتے۔ جیسے

آدمی نہ ہوں۔ لوہے کی مشین ہوں۔ اُن کا ہاتھ رُکتا ہی نہ تھا۔ اُن کا جی اُوبتا ہی نہ تھا۔ اُن کے ان اوصاف نے صاحب بہادر کے دل میں گھر کر لیا۔ چالیس پر ملازم رکھا تھا۔ چھ ماہ کے اندر اندر اسّی کر دیئے۔ دفتر کے لوگ دنگ رہ گئے۔ جانے اس شخص میں کیا جادو ہے؟ جو ایسے وحشی کو رام کر لیا۔ اس نے تو کبھی کسی سے سیدھے مُنہ بات بھی نہ کی تھی۔ اس سے مُسکرا مُسکرا کر بولتا ہے۔ جیسے غصّہ کرنا جانتا ہی نہیں؎

(۲)

لیکن رام گوپال یہاں خوش نہ تھے۔ اُن کی طبیعت میں خودداری کُوٹ کُوٹ کر بھری تھی وہ سب کچھ برداشت کر سکتے تھے۔ پر بے عزتی نہ برداشت کر سکتے تھے۔ دفتر کے دُوسرے کلرکوں کے ساتھ بدسلوکی ہوتے دیکھ کر اُن کا دل دھڑکنے لگتا تھا۔ اکثر سوچا کرتے۔ میں کب تک بچا رہوں گا۔ فرعون مزاج افسر ہے۔ کسی نہ کسی دن عزت اُتار کے رکھ دے گا۔ اپنی نگاہوں میں گر جاؤں گا۔ ذلیل ہو جاؤں گا۔ کسی کے دُور دُور سے اُٹھا سکونگا صاحب کی شیریں زبانیوں کا کیا بھروسہ؟ ذرا سی بھی غلطی ہو گئی۔ تو گرجنے لگے گا۔ اُس وقت ذرا مروّت نہ کرے گا۔ بلی کے گُدگُدے پنجوں کے ساتھ کھیل رہا ہوں۔ کیا معلوم کس وقت نوکیلے ناخن باہر نکال لے۔ رام گوپال اسی فکر میں گھلے جاتے تھے جیسے لکڑی کو گھُن کھا رہا ہو؎

ایک دن دوپہر کے وقت جب صاحب کھانا کھانے گئے۔ تو لکشمی نارائن نے رام گوپال کے پاس آ کر کہا۔ "آج شہر میں ایک بہت بڑا جلسہ ہونے والا

ہے۔ چلوگے؟ ہزاروں آدمی جمع ہونگے۔ سُنا ہے۔ کئی لیکچرار باہر سے آئے ہیں۔ اُن کے لیکچر بھی ہونگے"۔

رام گوپال نے چٹھی ٹائپ کرتے کرتے پُوچھا "کس کا جلسہ ہے؟"

لکشمی نارائن "یہی کانگریس والوں کا۔ چلوگے نا؟"

رام گوپال "کیا کریں گے جا کر بھیا! یہ چوچلے آزاد لوگوں کو زیب دیتے ہیں۔ ملازمت پیشہ لوگوں کے لیئے ایسی باتیں سُننا بھی داخل جُرم ہے۔ کسی نے صاحب سے جا کر شکایت کی۔ تو کل ہی کیفیت طلب کریں۔ کیا کہوگے اُس وقت؟ اور اُن کے مزاج کا حال تو تم جانتے ہی ہو۔ معمولی معمولی باتوں پر بھڑک اُٹھتے ہیں"۔

لکشمی نارائن "ہم نوکر ہیں۔ غلام نہیں ہیں۔ صاف کہہ دیں ان باتوں کا دفتر سے کوئی علاقہ نہیں۔ اگر دفتر کے کام میں غفلت کریں۔ تو اُن کو اعتراض کرنے کا حق حاصل ہے۔ یہ کیا؟ کہ اب کسی جلسہ میں بھی نہ جاؤ"۔

رام گوپال نے اپنی نگاہ چٹھی سے ہٹا کر لکشمی نارائن کی طرف دیکھا اور مُسکرا کر بولے "اور جو صاحب نے گھُرکی دے کر آستینیں چڑھا لیں تو کیا کروگے؟ بتاؤ"۔

لکشمی نارائن (ذرا تیز ہو کر) "آستینیں کیسے چڑھا لیں گے؟ کوئی قصور بھی ہو"۔

رام گوپال "نوکر کو مالک ہر وقت گھُرکی دے سکتا ہے۔ نوکر کا قصور ہو

یا نہ ہو۔ اس سے کوئی مطلب نہیں ہے"۔

لکشمی نارائن۔ (چڑھ کر) تو نہیں جاؤ گے؟ صاف کیوں نہیں کہتے؟

رام گوپال "ہرگز نہیں جاؤں گا بھیا! اور میرا تو خیال ہے کہ تمہیں بھی نہ جانا چاہیئے۔ جلسہ میں گئے بغیر کھانا ہضم نہ ہو گا۔ ایسا تو کوئی اندیشہ معلوم نہیں ہوتا"۔

لکشمی نارائن "مَیں تو ضرور جاؤں گا۔ تم صاحب کے چہیتے ہو، نہ جاؤ۔ مجھ پر تو اُن کی نظر کرم نہیں ہے۔ مَیں کیوں ڈر دوں؟"

رام گوپال "نوکری کا معاملہ ہے۔ سوچ لو"۔

لکشمی نارائن نے مُسکرا کر کہا "صاحب بھگوان نہیں ہے، جس نے مُنہ چیرا ہے، وہ کھانے کو بھی دے گا"۔

رام گوپال "یہ تمہاری مرضی ہے۔ مگر مَیں نے کتنی آدمی اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ جن کا مُنہ چیر کر بھی بھگوان کھانے کو نہیں دیتا۔ کہیے دکھا دُوں آج ہی ایک دو؟

لکشمی نارائن "تمہارے جیسے بزدل آدمیوں ہی نے صاحب لوگوں کا مزاج بگاڑ رکھا ہے"۔

رام گوپال نے ہنس کر کہا "تُم اِن لوگوں کا مزاج درست کیوں نہیں کر دیتے؟"

لکشمی نارائن "جب تک تمہارے جیسے خوشامد پرست موجود ہیں، تب تک ہماری پیش نہیں جاتی"۔

رام گوپال نے پھر ہنس کر کہا "آپ گالیاں بھی دینے لگے۔ اچھا بھئی! دے لو"۔

یہ کہہ کر انہوں نے پھر چِٹھی ٹائپ کرنا شروع کر دیا۔ لکشمی نارائن منہ لٹکا کر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد ایک دُوسرے بابو عزیز دین نے آکر آہستہ سے پُوچھا "کیوں تواری بابو! یہ بابو لکشمی نارائن کیا کہتے تھے"؟

رام گوپال "کہتے تھے، کانگریس کا جلسہ ہے چلوگے"؟

عزیز "پھر تم نے کیا جواب دیا"؟

رام گوپال "یہی کہ میں نہ جاؤں گا"۔

عزیز "اس کی باتوں میں نہ آجانا کہیں۔ تم اِس دفتر میں ابھی نئے ہو۔ اِس لئے اسے نہیں جانتے۔ آدمی کاہے کو ہے۔ ناگ ہے ناگ۔ کمبخت کے کاٹے کا منتر نہیں ہے"۔

رام گوپال نے زیر لب مُسکرا کر کہا "سب جانتا ہوں بھیّا! بیوقوف نہیں ہوں"۔

عزیز "اِدھر تم کو جلسہ میں لے جائیگا۔ اُدھر کل صاحب سے جاکر کہہ دیگا"۔

رام گوپال "اور جو، ہم اس کا نام لے دیں تو پھر ———— ہوش و حواس اُڑ جائیں گے حضور کے۔ اتنا سا مُنہ نکل آئے"۔

عزیز "ارے بھائی! یہ ایک ہی کایاں ہے۔ تم کو پھنسا دیگا۔ آپ صاف نکل جائیگا۔ ہم اس کی رگ رگ سے واقف ہیں۔ تمہارے ساتھ کاناپُھوسیاں کرتے دیکھا، تو مجھے شُبہ ہُوا۔ کہ شاید لاسا لگا رہا ہے"۔

رام گوپال: "مگر افسوس کہ پنچھی پھنسا نہیں ہے"

عزیز: "جھنجھلا رہا ہو گا۔ بڑا اسفاک ہے"

(۳)

شام کے ساڑھے پانچ بجے رام گوپال دفتر سے اُٹھے اور گھر کو چلے۔ بازار میں پہنچے۔ تو سامنے عورتوں کا جلوس آتا دکھائی دیا۔ اُن کے ہاتھوں میں قومی جھنڈے تھے۔ اور وہ کچھ گا رہی تھیں۔ تواری صاحب ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں جلوس قریب آ گیا۔ وہ چونک پڑے یہ کیا؟ جلوس میں سب سے آگے تربینی تھی۔ اس کا جھنڈا سب سے اونچا تھا۔ گاتے وقت سب سے پہلے تربینی گاتی تھی۔ تب دوسری عورتیں اُس مصرعہ کو دہراتی تھیں۔ اس وقت وہ جوش کی جیتی جاگتی تصویر معلوم ہوتی تھی۔ اُس کا گورا چہرہ تمتما رہا تھا۔ آنکھیں چمک رہی تھیں۔ جیسے جلوس کی رہنمائی کے لئے آسمان سے کوئی دیوی اُتر آئی ہو۔ رام گوپال نے تربینی کا یہ رُوپ گھر میں آج تک نہ دیکھا تھا۔ اِس وقت وہ اُن کی دیکھی پہچانی، اُن کی اپنی بیوی معلوم نہ ہوتی تھی۔ رام گوپال مسحور ہو کر جلوس کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ اُن کو تن بدن کی سُدھ نہ تھی۔ نہ یہ خیال تھا۔ کہ کہاں جا رہے ہیں۔ اُن کو صرف ایک ہی خیال تھا۔ کہ تربینی آنکھوں سے اوجھل نہ ہو۔ وہ اُس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے تھے۔ اور آدمیوں کے اس سیلاب میں بہے جاتے تھے۔ دیویاں گاتی تھیں

آؤ پیارے بھائیو آؤ دیش دھرم پر بل بل جاؤ

ایک ساتھ سب مل کر گاؤ　　پیارا بھارت دیش ہمارا
جھنڈا اونچا رہے ہمارا

کیسی پاکیزہ آواز تھی۔ کیسے دل میں اُتر جانے والے دلکش الفاظ۔ رام گوپال کی نس نس میں بجلی سی دوڑ گئی۔ اُن کو ایسا معلوم ہُوا، گویا مُلک میں نئے دور کا آغاز ہو گیا ہے۔ گویا اب مُلک کا ایک ایک بچہ ان عفت مآب دیویوں کی آواز پر قربان ہونے کو آگے بڑھ رہا ہے۔ گویا اب ہندوستان کے اقبال نے آنکھیں کھول دی ہیں ——— اُن پر بیخودی کا عالم طاری ہو گیا۔ وہ کسی اَور ہی دُنیا میں پہنچ گئے۔ رنگین خوابوں کی اُس جنت میں جہاں انسان نہیں جاتا۔ انسان کا خیال جاتا ہے۔ اس وقت اُن کو سالون صاحب کا خیال ہی نہ رہا۔ اُنہیں یہ بھی فراموش ہو گیا۔ کہ وہ نوکر ہیں۔ اور اُنہیں اس قسم کے جلوسوں میں شریک نہ ہونا چاہیئے۔

تھوڑی دیر بعد جلوس شردھانند پارک میں پہنچ گیا اور جلسہ شروع ہو گیا۔ پارک کھچا کھچ بھرا ہُوا تھا۔ چاروں طرف آدمی ہی آدمی تھے۔ سٹیج پر کوئی کھدر پوش مہاتما کھڑے تقریر کر رہے تھے۔ لیکن شور اتنا تھا۔ کہ اُن کی آواز سوائے اُن کے جو سٹیج کے قریب بیٹھے تھے اور کسی کو سُنائی نہ دیتی تھی۔ پھر بھی لوگ چلنے کا نام نہ لیتے تھے۔ تربینی سٹیج پر بیٹھی تھی۔ رام گوپال ہجوم میں کھڑے تھے۔ دم گھٹتا تھا۔ پسینہ چھوٹتا تھا۔ کھڑا ہونا مُشکل تھا۔ لیکن اُنہیں اس کی ذرا بھی پروا نہ تھی۔ وہ اس وقت ایسے خوش تھے، جیسے بہشت کی حکومت مل گئی ہو۔ اس مسرت آگیں فخر کا احساس اُنہیں

آج سے پیشتر کبھی نہ ہوا تھا۔ اتنے میں لیکچرار نے ہاتھ پھیلا کر اور اپنے حلق کی انتہائی قوت سے چلا کر کہا "بھائیو! اپنی بدیسی ٹوپیاں اُتار دو۔ ہم یہاں اُن کی ہولی جلائیں گے۔" کہنے کی دیر تھی۔ لوگ اپنی بدیسی ٹوپیاں اُتار اُتار کر پھینکنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے سٹیج پر ڈھیر لگ گیا۔ لیکن لیکچرار صاحب مطمئن نہ ہوئے۔ اُنہوں نے لوگوں کی طرف دیکھ کر کہا "ابھی تو نصف بھی نہیں آئیں"۔

اب لوگوں نے دوسروں کی ٹوپیوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ جو اپنے قریب والے کے سر پر انگریزی ٹوپی دیکھتا وہی ہاتھ بڑھا کر اُتار لیتا۔ اور پلیٹ فارم پر پھینک دیتا۔ کسی میں دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ رام گوپال کے ساتھ ایک طالب علم کھڑا تھا۔ اُس کی نگاہ رام گوپال کی ٹوپی کی طرف گئی۔ ابھی چند ہی دن گزرے خریدی تھی۔ اور بالکل نئی تھی۔ حُبِّ وطن کے اظہار کا اس سے اچھا موقعہ اور کب میسر آ سکتا تھا۔ اُس نے فوراً ہاتھ بڑھا کر لجاجت سے کہا "کیوں بھائی صاحب! اجازت ہے پھینک دوں اُتار کے؟"

رام گوپال کی جیسے نیند کھل گئی۔ ہچکچا کر بولے "ابھی حال ہی میں خریدی ہے"۔

طالب علم "بڑی اچھی ہولی جلے گی۔ بھائی صاحب! ہماری ٹوپیوں کی ایسی تقدیر کہاں؟ یہ پنڈت صاحب ہمارے شہر میں روز روز نہیں آتے"۔ یہ کہتے کہتے اُس نے رام گوپال کے سر سے ٹوپی اُتار کر پلیٹ فارم پر پھینک دی۔ لوگوں نے تالیاں بجائیں۔

رام گوپال نے کھسیانے ہوکر کہا "یہ آپ کی سراسر زیادتی ہے"۔
طالب علم "آج کے لئے سب کچھ معاف ہے"۔
رام گوپال "اب ننگے سر کیسے گھر جاؤں گا۔ اتنا سوچ لیا ہوتا"۔
طالب علم "ہاں! یہ تو ضرور غلطی ہوئی۔ لیکن لیجئے میری ٹوپی لگا لیجئے۔ مجھے ننگے سر جانے میں کوئی عار نہیں"۔

یہ کہتے کہتے طالب علم نے جیب سے ایک گاندھی ٹوپی نکال کر رام گوپال کے ہاتھ میں دے دی۔ رام گوپال کا منہ بند ہو گیا۔ اتنے میں پیچھے سے کسی نے ہنس کر کہا "تواری صاحب! مبارک ہو۔ بھئی تم تو چھپے رستم نکلے"۔

رام گوپال نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اُن کا خون خشک ہو گیا۔ یہ بابو لکشمی نارائن تھے"۔

رام گوپال ہجوم سے نکل کر اُن کے پاس چلے گئے۔ اور آہستہ سے بولے "یہ آپ نے دیکھا۔ کالج کے طالب علم کس قدر زیادتیاں کرنے لگے۔ میں منع کرتا ہی رہ گیا۔ جناب نے ٹوپی اُتار کے پھینک دی۔ گویا باوا کا مال ہو۔ کیا کروں اتنے لوگوں میں بولتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔ سارا مجمع اُدھر ہے۔ اِدھر کوئی بھی نہیں"۔

اب وہ پھر وہی ڈرپوک، وہی بزدل، وہی حاجتمند دفتر کے کلرک تھے۔ اُن کی آنکھوں میں وہی مالون صاحب کی خونبار آنکھیں تھیں۔ وہی دفتر کا کمرہ تھا۔ وہی بابو تھے وہی بابوؤں کی غلامانہ ذہنیت تھی۔

لکشمی نارائن نے کہا "لیکن آپ اِدھر آ کیسے گئے؟ ہمیں تو یہی تعجب

ہے۔ کہیں صاحب سُن لیں تو کیا کہیں"
رام گوپال "پس یہ غلطی ہو گئی اور کیا کہوں؟"
لکشمی نارائن نے رام گوپال کی طرف مُسکرا کر دیکھا۔ گویا زبان حال سے کہا۔ ہم کو باتوں میں نہ اُڑاؤ۔ ہم سب کچھ سمجھتے ہیں +
رام گوپال "اب کل چھ روپے کھُل جائیں گے اور کیا؟ دفتر میں یہ ٹوپی پہن کر چلے جائیں تو صاحب کھڑے کھڑے نکلوا دیں"
لکشمی نارائن "اور آپ نے عورتوں کا جلوس دیکھا یا نہیں؟ بھئی! ہم تو دنگ رہ گئے۔ اُفوہ! کس قدر جوش تھا۔ اگر چندے یہی عالم رہا۔ تو ہم مردوں کے لئے باہر نکلنا دشوار ہو جائیگا"
رام گوپال کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ سوچنے لگے۔ اس موذی کو کہیں کسی نے بتا تو نہیں دیا۔ اُس کی طرف متجسس نگاہوں سے دیکھ کر بولے "ہاں بھئی! یہ ضروری ہماری ناک کاٹ ڈالیں گی۔ کیا بڑھ بڑھ کر گاتی ہیں گویا آج ہی سوراج لے لیں گی۔ ہم سے تو عورتیں ہی بھلی"
لکشمی نارائن "آپ نے وہ لڑکی بھی دیکھی جو سب کے پیش پیش تھی بھئی! خوب جوش سے بولتی ہے۔ اُس کی آواز سُن کر تو مُردے بھی جی اُٹھیں۔ اور کیا؟"
رام گوپال کا منہ سوکھ گیا +
لکشمی نارائن "سُنا ہے اس کا خاوند کسی دفتر میں نوکر ہے۔ تنخواہ خواہ تھوڑی ہی پاتا ہو۔ لیکن تواری صاحب! ہے خوش نصیب

ایسی بیوی ملی۔ ایک ہمارے گھر کی عورتیں ہیں۔ کہ باہر نکلیں تو پاؤں ہی نہ اُٹھیں۔ چار قدم چلیں تو تھک جائیں۔ اور کیا مجال جو مُنہ سے ایک لفظ بھی نکل جائے"۔

رام گوپال کو یقین ہوگیا۔ کہ یہ شیطان سب کچھ جانتا ہے۔ اُنہیں اِس پر رہ رہ کر غُصّہ آ رہا تھا، کیسا ظالم کیسا سنگ دل ہے۔ ایک ہی مرتبہ گلے پر چھُری نہیں پھیر دیتا۔ آہستہ آہستہ ذبح کرتا ہے، اور تڑپنے کا تماشہ دیکھ کر خُوش ہوتا ہے۔ تربینی سے کیا کیا مزے کی باتیں کرنے کے منصُوبے باندھے تھے۔ سوچتا تھا چل کر بیٹھ ٹھونک کر کہیں گے۔ واہ! میرے جرنیل! تُو نے تو آج کمال کر دیا سارا کانپور تیری طرف دیکھتا تھا۔ اور ہم تو پھُولے نہ سماتے تھے۔ لیکن لکشمی نارائن کی دو باتوں نے سارا گڑ گوبر کر دیا۔ وہ جوش ہی نہ رہا۔

(۴)

رام گوپال کو رات بھر نیند نہ آئی۔ سوچتے تھے "اگر ملازمت چھُوٹ گئی تو کیا کروں گا، بے روزگاری کا زمانہ ہے۔ جدھر جاؤ، جواب ملتا ہے۔ کوئی جگہ خالی نہیں۔ تو پھر کیا بھوکوں مرنا ہوگا؟ یہ خیال آتے ہی اُن کا دِل سہم جاتا تھا۔ کبھی کبھی خیال آتا کہ یہ سب وہم ہی وہم ہے لکشمی نارائن کو کیا معلوم کہ یہ میری بیوی ہے۔ خواہ مخواہ مرا جاتا ہوں۔ کوئی [illegible] تو نہیں ہوں کہ سارا شہر جانتا ہو۔ باقی رہ گیا [illegible] کا۔ اس [illegible] پر ذرا بھی قصور نہیں۔ اب اگر کوئی شہدا کسی سر سے [illegible] اپنی اُنگلی [illegible] تو

وہ کیا کرسکتا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ ہاں! اگر خود اپنی مرضی سے اُتار کر پھینکے۔ تو اُس سے جواب طلب کیا جا سکتا ہے۔ صاحب پُوچھیں گے تو صاف کہہ دُونگا۔ کہ اس میں میرا کیا قصور؟ مَیں ایسی باتوں میں کبھی آتا ہی نہیں۔ لیکن اگر صاحب پُوچھ بیٹھے کہ تم وہاں گئے ہی کیوں تھے۔ تو کیا جواب دُونگا؟ رام گوپال کے پاس اِس سوال کا جواب نہ تھا۔

رات گزُر گئی اِس طرح جس طرح اُس شخص کی گزُرتی ہے جس کا مقدمہ دُوسرے دن پیش ہونے والا ہو اور جسے ہار جانے کا اندیشہ ہو۔ صُبح کے وقت جب بازار کھُلا تو رام گوپال نے سب سے پہلے جاکر کرِشتی ٹوپی خریدی۔ تربینی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اُس کا جی چاہتا تھا۔ شوہر کو ایسا آڑے ہاتھوں لے کہ اُس کا مُنہ نہ کھُلے۔ ایسی بُزدلی بھی کِس کام کی کہ ہم حاکموں کی مرضی کے غُلام ہی بن جائیں۔ جو وہ چاہیں پہنیں۔ جو وہ چاہیں کھائیں۔ ہمیں اتنا بھی اختیار نہیں۔ کہ اپنی پسند کا لباس ہی استعمال کرسکیں۔ کام کرتے ہیں۔ تنخواہ پاتے ہیں۔ کوئی مُفت تھوڑا ہی اُٹھا دیتا ہے۔ اُدھر رام گوپال سوچتے تھے۔ یہ کرنی کیا ہے؟ نوکری چھُوٹ گئی تو ساری ہیکڑی بھُول جائیگی۔ پھر پُوچھونگا۔ شریمتی بتاؤ۔ کیا کھائیں؟ اُس وقت تو جھنڈا ہاتھ میں لے کر پھُولی نہ سماتی تھی۔ جیسے کل ہی سوراج مل جائیگا۔ اب بولو ہے کوئی ایسا ہمدرد جو ہماری ملازمت کا بھی انتظام کردے۔ تالیاں پیٹنے والے سبھی ہیں۔ روٹیاں کھلانے والا کوئی بھی نہیں۔ یہ کام تو وہ کریں۔ جن کو کھلنے

پینے کی کمی نہ ہو۔ ہم غریب آدمی۔ چار دن کے لئے بھی آمدنی بند ہو جائے۔ تو بھوکوں مر جائیں۔ نو بجے رام گوپال دفتر میں پہنچے۔ تو اُن کے چہرہ کا رنگ ہی اور تھا دیکھنے سے شبہ ہوتا تھا۔ کہ مہینوں سے بخار آ رہا ہے کرسی پر بیٹھے تو اسّی سال کے بُوڑھے کے مانند کانپ رہے تھے چٹھیاں ٹائپ کرنے لگے۔ تو اُنگلیاں کہیں کی کہیں جا پڑتی تھیں۔ مگر دس بج گئے اور کوئی واقعہ نہ ہُوا۔ رام گوپال کو قدرے اطمینان ہُوا۔ گیارہ بج گئے۔ صاحب نے پھر بھی نہ بُلایا۔ رام گوپال کا خوف قدرے کم ہونے لگا۔ مگر ابھی نگاہیں دروازے پر جمی تھیں۔ کوئی چپراسی آتا تو کانپ جاتے کہ کہیں صاحب نے نہ بُلایا ہو۔ دل میں منتیں مان رہے تھے۔ کہ اگر یہ بلا ٹل جائے تو یتیم خانہ کو پانچ روپے دان دیں گے۔ گھر جاتے وقت کوئی سادھو مہاتما مِل جائے تو اُسے خوش کر دیں گے وہ ایک پیسہ مانگے گا ہم اُسے چونی دیں گے۔ بھگوان اب کے بچالے تو پھر تربینی کو کبھی باہر نہ نکلنے دیں کہیں پہلے انجام سوچ لو، پھر جھنڈا لے کر جلوس میں نکلنا، جوش میں آکر ہم سب کچھ کر گزرتے ہیں۔ اس کا انجام کیا ہو گا؟ اس کی طرف ہمارا دھیان ہی نہیں جاتا۔ رام گوپال انہیں خیالات میں محو تھے۔ کہ دیوار گھڑی نے بارہ بجا دیئے۔ اس کے ساتھ ہی صاحب موٹر میں بیٹھ کر کھانا کھانے چلے گئے۔ اب رام گوپال نے اطمینان کا سانس لیا۔ اُن کو ایسا معلوم ہُوا۔ جیسے یہ موٹر اپنی جگہ سے نہیں سرکا۔ اُن کے سینہ سے سرک گیا ہے۔ جیسے اُن کے دل سے بوجھ اُتر گیا ہے۔ لیکن

حقیقت میں بوجھ اُترا نہ تھا۔ تقدیر اُن کے ساتھ امید و یاس کا تماشہ کھیل رہی تھی۔ بلی چوہے کو ہلاک کرنے سے پیشتر اُسے کبھی پکڑتی ہے کبھی چھوڑ دیتی ہے۔

دو بجے صاحب کھانا کھا کر لوٹے۔ تو سب سے پہلے رام گوپال کی طلبی ہوئی یہ طلبی کوئی نئی بات نہ تھی۔ صاحب دن میں رام گوپال کو کئی کئی مرتبہ اپنے کمرے میں بُلایا کرتے تھے۔ مگر ڈرے ہوئے آدمی کو رات میں درخت بھی بھوت نظر آتا ہے۔ رام گوپال کا دل بیٹھ گیا۔ جب اُٹھنے لگے۔ تو اُن کے دل میں کسی نے کہا اِس کمرہ سے سدا کے لئے جا رہے ہو۔ جب صاحب کے کمرہ میں پہنچے تو اُن کے پاؤں کانپ رہے تھے۔ صاحب بہادر کوئی کاغذ دیکھنے میں مصروف تھے۔ رام گوپال جا کر چُپ چاپ کھڑے ہو گئے۔ لیکن اُن کے دل میں جو شور مچا ہُوا تھا۔ اُسے کون جانتا ہے؟ اس وقت پھر وہی خیالات تھے۔ یتیم خانہ کو پانچ روپیہ۔ سادھو فقیر کو جوتی۔ ترہبنی کو گھر سے نکلنے کی ممانعت۔

معاً صاحب بہادر نے سر اُٹھا کر اُن کی طرف دیکھا رام گوپال نے جھک کر سلام کیا اور ٹائپ کی ہوئی چٹھیاں میز پر رکھ دیں۔ اس وقت رام گوپال کی حالت چھرے تلے لیٹے ہوئے بکرے سے بہتر نہ تھی۔ سالون صاحب نے کرسی کے ساتھ ٹیک لگا کر سگرٹ سُلگایا۔ اور بولے "دیکھو بابو! ہمارے پاس رپورٹ پہنچا ہے۔ کہ تم باغی لوگ ہے۔ کیا یہ سچ ہے"۔

تو آخر جس بات کا اندیشہ تھا۔ وہ سچ نکلی۔

رام گوپال نے اپنی زبان ہونٹوں پر پھیری۔ اور جواب دیا "حضور!

یہ بالکل غلط ہے"۔

صاحب "ٹھیک ٹھیک بولو۔ ہم جھوٹ نہیں مانگتا"۔

رام گوپال "حضور! میں نے جو کچھ کہا ہے وہ حرف بحرف سچ ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ کہ میں جلسوں میں بھی شریک نہیں ہوتا۔ لوگ اخبار پڑھتے ہیں۔ میں اخبار بھی نہیں پڑھتا۔ گھر سے دفتر آتا ہوں دفتر سے گھر چلا جاتا ہوں۔ دُنیا میں کیا ہو رہا ہے، مجھے اس سے غرض ہی نہیں"۔

صاحب "کیا تُم یہ کہنا چاہتا ہے۔ کہ ہم کو گلت کھبر ملا ہے"۔

رام گوپال "بالکل غلط حضور! اِس میں رتی بھر صداقت نہیں۔ یہ میرے کسی دشمن کی شرارت ہے"۔

صاحب "کل کیا ہُوا ہے۔ بولو!"

رام گوپال کا مُنہ کانوں تک سُرخ ہو گیا۔ تاہم سنبھل کر بولے۔

"جب چُھٹی ہوئی۔ تو عورتوں کا ایک جلوس جا رہا تھا۔ میں بھی دیکھتے ساتھ چلا گیا۔ حضور! ہمارے یہاں عورتوں کا جلوس بالکل نئی بات ہے۔ عورتیں سخت پردہ کی پابند ہیں۔ یہ جلوس بالکل نئی بات تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ میں جلسہ گاہ میں پہنچ گیا۔ وہاں ایک من چلے طالب علم نے میرے سر سے ٹوپی اُتار کے پھینک دی۔ حضور کیا کہوں؟ ایک لفظ بھی مُنہ سے نکالتا تو ضرور پِٹ جاتا۔ من مار کر رہ گیا صُبح سب سے پہلے یہ ٹوپی خریدی"۔

صاحب نے کچھ سوچ کر کہا "ہوں"۔

رام گوپال:۔ حضور! اگر مَیں نے اپنی مرضی سے پھینکی ہوتی۔ تو آج نئی کبھی نہ خریدتا۔ چھ روپے کی چپت ہے"۔

یہ بات صاحب کے دل میں بیٹھ گئی۔ بولے "تم یہ ٹھیک بولتا ہے۔ مگر کیا یہ بھی جھوٹ ہے۔ کہ تمہارا وائف جلوس نکالتا ہے، بدیسی مال کے بائیکاٹ پر زور دیتا ہے۔ اور سانگ گاتا ہے؟"

یہ کہہ کر صاحب نے اپنی آنکھیں رام گوپال کے چہرہ پر گاڑ دیں۔ گویا دیکھنا چاہا۔ کہ رام گوپال پر ان الفاظ کا کیا اثر ہوتا ہے۔ رام گوپال کے چہرہ کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ فوراً کوئی جواب نہ دے سکے۔ شاید دل میں سوچ رہے تھے۔ کہ کیا جواب دیں۔ اسے تو سب کچھ معلوم ہو گیا۔ لاکھ منت کروں۔ کبھی نہ مانے گا۔ معلوم ہوتا ہے۔ آج ڈسمس ہوئے۔

صاحب نے سگرٹ کا کش لگا کر کہا "ویل بولو ہمارا ٹائم ضائع ہوتا ہے۔ تم چپ کیوں ہے؟"

رام گوپال:۔ حضور! یہ ٹھیک ہے۔ مگر اس نے مجھ سے مشورہ نہیں کیا۔ مَیں دفتر میں تھا وہ جلوس میں چلی گئی۔ مَیں گھر پر ہوتا۔ تو اُسے کبھی اجازت نہ دیتا"۔

صاحب نے غرّا کر کہا "تم جھوٹ بولتا ہے"۔

رام گوپال:۔ مَیں جناب کو یقین دلاتا ہوں۔ کہ یہ پہلا موقعہ ہے۔ جب میری بیوی کسی جلوس میں شریک ہوئی ہے۔ اب کے معافی مل جائے۔ تو پھر یہ غلطی کبھی نہ ہو گی"۔

صاحب "ہمیں معلوم نہ تھا۔ کہ تم ایسا ڈینجرس لوگ ہے۔ ورنہ اتنی جلدی کبھی انکری منٹ نہ دیتا۔ ہم سے بیوقوفی ہوا"۔

رام گوپال کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ نہایت عجز سے بولے۔ جناب! سچ عرض کرتا ہوں۔ اب آپ کو کبھی شکایت کا موقعہ نہ ملے گا"۔

صاحب "تم شیطان ہے۔ ہم کو تم پر ذرا اعتبار نہیں"۔

(۵)

خودداری کا سوتا ہوا جذبہ بیدار ہوگیا۔ رام گوپال نے سر اُٹھا کر جواب دیا "مگر میرا اس میں کیا قصور ہے؟ آپ کا نوکر میں ہوں۔ میری بیوی نہیں ہے۔ اس کے کسی کام کے لئے آپ کو مجھ سے کیفیت طلب نہ کرنا چاہیئے۔ کیا آپ پسند کریں گے۔ کہ آپ سے آپ کی میم صاحبہ کے کسی کام کے لئے ہیڈ آفس جواب طلب کرے"۔

صاحب چونک پڑے۔ ایک ملازم اور اس طرح کی گفتگو! ان کی آنکھیں غصہ سے لال ہوگئیں۔ دانت پیس کر بولے "تم کس طرح بولتا ہے؟"

رام گوپال نے انجام کی طرف سے آنکھیں بند کرکے جواب دیا۔ "جس طرح آپ بولتے ہیں۔ اُسی طرح میں بولتا ہوں۔ آپ نے سمجھا ہوگا۔ جیسے دفتر کے دُوسرے آدمی گالیاں کھا کر بھی چُپ رہتے ہیں۔ ویسے ہی یہ چُپ رہے گا۔ مگر میں ایسا آدمی نہیں ہوں۔ میرے لئے پہلے عزت ہے۔ بعد میں روپیہ ہے عزت بیچ کر جو روپیہ ملے اُس پر لعنت بھیجتا ہوں"۔

صاحب "یوڈیم! ہمارا آگے بولتا ہے۔ ہمارا گستاخی کرتا ہے"۔

رام گوپال کی بھویں تن گئیں۔ غصہ سے بولے "دیکھئے گالیاں دینے کی کوئی ضرورت نہیں"۔

صاحب "نان سنس! ہم تم کو ڈسمس کرتا ہے"۔

رام گوپال "ڈسمس کر سکتے ہو۔ مگر گالیاں نہیں دے سکتے"۔

صاحب "ہم گالی دے گا۔ تم کیا کر سکتا ہے۔ بولو"۔

رام گوپال نے غصہ سے ہونٹ چبا کر کہا "میں تم کو ایسا سبق دیسکتا ہوں۔ جو تمہیں عمر بھر نہ بھولے۔ جس سے تمہاری آنکھیں کھل جائیں"۔

صاحب۔ (چیخ کر) "تم راسکل ہے۔ ہم تم کو ایک منٹ میں دفتر سے نکال دیگا"۔

یہ کہتے کہتے صاحب بہادر نے کھڑے ہو کر دونوں ہاتھوں سے رام گوپال کے کان پکڑ لئے۔ اور ان کا سر دیوار کے ساتھ دے مارا۔ صاحب بہادر دُبلے پتلے آدمی تھے۔ جیسے دمہ کے مریض ہوتے ہیں۔ ادھر رام گوپال صحت و تندرستی کی زندہ تصویر۔ ان سے یہ ضبط نہ ہو سکا۔ آنکھوں سے آگ کے شرارے نکلنے لگے۔ وہ غریب تھے۔ لیکن خود داری کی دولت خداداد سے محروم نہ تھے۔ سوچنے لگے۔ ملازمت جا چکی ہے عزت کیوں جائے۔ انہوں نے ایک منٹ تک سوچا۔ اور اپنے طرزِ عمل کا فیصلہ کر لیا۔

دوسرے لمحہ میں صاحب بہادر فرش پر پڑے تھے! ور رام گوپال ان کے سینہ پر سوار تھے۔ صاحب بہادر کو یہ اُمید نہ تھی۔ انہوں نے کبھی

خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ کہ کوئی ہندوستانی ایسا جرأت آفرین عملی قدم بھی اُٹھا سکتا ہے ان کو آج تک بزدل۔ چاپلوس جھوٹے کلرکوں سے واسطہ پڑا تھا۔ آج ایک سچّے غیرت مند خود دار بہادر نوجوان سے واسطہ پڑا۔ صاحب بہادر حیرت میں آ گئے۔ یہ ان کے لئے نیا تجربہ تھا! انہوں نے رام گوپال کی طرف استعجاب اور مایوسی کی مِلی جُلی نگاہوں سے دیکھا۔ اور ڈر گئے۔ رام گوپال کی آنکھوں سے سفاکانہ شعاعیں نکل رہی تھیں۔ صاحب نے سمجھ لیا۔ کہ یہ شخص اِس وقت دیوانہ ہو رہا ہے۔ جو بھی کر گزرے تھوڑا ہے۔ معافی کے دو لفظ کہہ دینے سے جان چھوٹ جاتی۔ چپراسی کو ایک آواز دینے سے وہ بھاگا ہُوا اندر آ جاتا۔ لیکن صاحب بہادر کمزور ہونے پر بھی صاحب بہادر تھے۔ نہ اپنی نگاہوں میں گرنا چاہتے تھے نہ دُوسروں کی نگاہوں میں ذلیل ہونا گوارا تھا۔ چپراسی اِس حالت میں دیکھ کر کیا کہیں گے؟ کیا صاحب بہادر پھر کسی کو مُنہ دکھانے کے قابل بھی رہ جائیں گے؟ سارا رُعب۔ سارا دبدبہ مٹّی میں مِل جائیگا۔ عجب نہیں۔ یہ واقعہ دُوسروں کے لئے نظیر بن جائے۔ پھر ان سے کون ڈرے گا؟

صاحب بہادر نے فرش پر لیٹے لیٹے صُورت حال پر غور کر لیا۔ اور تب بولے "تُم جانتا ہے۔ ہم کون ہے۔ اور ہم کیا کر سکتا ہے؟"

رام گوپال پہلے ہی جھلائے ہوئے تھے۔ یہ سُن کر اور بھی جھلاّ گئے۔ انہوں نے صاحب کی کنپٹی پر پُورے زور سے ایک گھونسا جمایا۔ اور بولے۔ ہم یہ کر سکتا ہے اب تم بتاؤ۔ تُم کیا کر سکتے ہو؟"

صاحب بہادر کو دن میں تارے نظر آنے لگے۔ ایسا ٹھلا ہُوا ہاتھ ان کے آج تک نہ لگا تھا۔ سر چکرانے لگا گھبرا کر بولے۔ ہم تُم پر کورٹ پر دعوے کرے گا"۔

رام گوپال نے ایک گھونسہ دُوسری طرف جڑ دیا اور کہا "بڑی خوشی سے"۔

مسالون صاحب کا سر بھنا گیا۔ تھوڑی دیر تک آنکھیں مُوندے اس طرح چُپ چاپ پڑے رہے۔ جیسے ان میں جان ہی نہ ہو۔ اس کے بعد انہوں نے آنکھیں کھول کر رام گوپال کی طرف سہمی ہوئی نگاہوں سے دیکھا اور کراہ کر بولے "مسٹر! کیا تم ہم کو مار ڈالنا چاہتا ہے؟

رام گوپال "پھر گالی دوگے؟"

صاحب "ہم کمزور آدمی ہے۔ اگر تُم نے ایک اور گھونسہ مار دیا۔ تو ہم مر جائیگا"۔

رام گوپال "ہم پُوچھتے ہیں تُم نے ہمیں گالی کیوں دی۔ بولو"۔

صاحب "یہ ہمارا گلتی تھا"۔

رام گوپال "معافی مانگتے ہو؟"

صاحب "ہاں ہمیں کوئی عذر نہیں۔ ہم سے سچ مچ گلتی ہُوا۔ بہت بڑا گلتی"۔

رام گوپال "پھر دوگے گالی کسی کو؟"

صاحب "نہیں نہیں۔ اب ہم کسی کو گالی نہ دیگا ہم کو بخشو"۔

رام گوپال صاحب کے سینے سے اُٹھ بیٹھے۔ اور پسینہ پُوچھنے لگے سالون

صاحب بھی ہانپتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ اور کنپٹیاں وہلنے لگے۔ اس کے بعد جب ذرا ہوش ٹکانے ہوئے۔ تو ہاتھ بڑھا کر بولے "مسٹر تواری! ہاتھ ملاؤ۔ تم آج سے ہمارا دوست ہے۔ ہاتھ ملاؤ"۔

رام گوپال کو تعجب ہُوا۔ کوئی شخص مار کھا کر بھی دوست بن سکتا ہے۔ یہ انہوں نے آج تک نہ سوچا تھا صاحب نے پھر کہا "آؤ ہاتھ ملائیں۔ تُم آج سے ہمارا دوست ہے"۔

رام گوپال نے سوتے ہوئے آدمی کی طرح ہاتھ بڑھا دیا۔ صاحب نے گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا "ہمارا ایک درکھاست ہے۔ اسے تم کو مہربانی کر کے ماننا ہوگا"۔

رام گوپال "فرمائیے"۔

صاحب "آج کا یہ بات کسی کو معلوم نہ ہو۔ ورنہ ہمارا بے عزّتی ہوگا"۔

یہ درخواست سُن کر رام گوپال کو ہنسی آگئی۔ مگر اسے ضبط کر کے بولے۔ "اس کی طرف سے بے فکر رہئیے"۔

صاحب "تھینک یُو"۔

یہ کہہ کر انہوں نے رام گوپال سے پھر ہاتھ ملایا۔ رام گوپال نے اپنے کپڑے درست کرتے ہوئے پُوچھا "تو اب استعفےٰ لکھ کر بھیج دُوں۔ آپ کے پاس؟"

صاحب "نہیں مسٹر رام گوپال نہیں۔ جاکر اپنا کام کرو۔ تُم نے ہمیں ماف کیا۔ ہم نے تمہیں ماف کیا"۔

رام گوپال کو اور بھی تعجب ہُوا۔ صاحب کے مُنہ کی طرف دیکھ کر بولے "کیا آپ اب مجھے ڈسمس نہ کریں گے"؟

صاحب "نہیں"۔

رام گوپال "کیا آپ مجھے گُستاخ نہیں سمجھتے"؟

صاحب۔ (مُسکرا کر) "بالکل نہیں"۔

رام گوپال "لیکن میں نے آپ کو.....:"

صاحب بہادر "دیکھو میرے دوست! جو آدمی اپنی عزّت آپ نہیں کرتا۔ ہم اسے کمینہ سمجھتا ہے۔ لیکن جو آدمی اپنی عزّت کا پروا کرتا ہے۔ ہم بھی اُس کی عزّت کرتا ہے۔ اور اُسے اچھّا آدمی سمجھتا ہے"۔

رام گوپال کو نئی بات معلوم ہوئی۔ جب وہ باہر نکلے تو چپراسیوں نے انہیں جُھک کر سلام کیا اور مُسکرائے ان کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ آج تم نے اِس شخص کو آدمی بنا دیا۔

انہوں نے دروازہ کے ساتھ لگ کر سب کچھ دیکھ لیا تھا۔

رام گوپال سیدھے اپنے کمرہ میں جا کر اپنی کُرسی پر بیٹھ گئے۔ اور چٹھیاں چھاپنے لگے۔ لیکن ان کا دل گھر جانے کو بے قرار ہو رہا تھا۔ سوچتے تھے۔ کب چھٹّی ہو گی اور کب جا کر اِس واقعہ کا ذکر تربینی سے کروں گا۔ لیکن ابھی تین بھی نہ بجے تھے۔

ایک تصویر کے دو رُخ

یہ کہانی نہیں۔ سچّا واقعہ ہے۔

اُن دنوں بھی لوگ میری کتابوں کو اسی شوق سے پڑھتے تھے میری کہانیوں کے لئے لوگ اس وقت بھی اسی طرح بیتاب رہتے تھے لیکن میری مالی حالت چنداں تسلی بخش نہ تھی۔ مِل جاتا، تو کھا لیتے تھے نہ مِلتا تو نہ کھاتے تھے۔ مگر اسے خودداری کہئے یا جھوٹا غرور۔ مَیں نے اپنی حالت کا کسی پر اظہار نہیں ہونے دیا۔ اندر بیٹھ کر خواہ گھنٹوں روتا رہوں۔ مگر جب باہر نکلتا ہوں تو ہنستا ہُوا نکلتا ہوں۔ ایسا کہ کسی کو شبہ بھی نہ ہو سکے۔ خوش نصیبی سے میری بیوی بھی میری ہم خیال ہے۔ بلکہ وہ مجھ سے بھی دو قدم آگے ہے ہمّت، استقلال اور صبر و قناعت کی جیتی جاگتی تصویر۔ مَیں گھر میں بیٹھ کر رو لیتا ہوں وہ گھر میں بھی نہیں روتی۔ مَیں نے تاریک سے تاریک لمحوں میں بھی اُس کے چہرے پر مُسکراہٹ کی روشنی دیکھی ہے۔ اِس مُسکراہٹ نے میری ادبی زندگی کے پُرخار رستے کو گلزار بنا دیا ہے۔ مَیں گھبراتا ہوں، وہ مجھے سنبھال لیتی ہے۔ مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ اگر مجھے کوئی زیوروں اور کپڑوں کی شوقین بیوی

مل جاتی تو کیا ہوتا ؟ ہوتا کیا۔ زندگی دوبھر ہو جاتی۔ باہر بھی روتا۔ گھر میں بھی روتا۔ لیکن خدا بڑا کارساز ہے اُس نے ہر بیماری کے ساتھ اُس کی دوا بھی پیدا کر دی ہے مجھے لکھنے کی بیماری دی تو ساتھ ہی دوا بھی دیدی +

ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہُوا کہ ہمیں تین دن فاقے کرنے پڑے مَیں بالکل ہی قلاش ہو گیا تھا۔ یہ بات نہ تھی۔ تاجرانِ کُتب کی طرف کئی سو روپیہ نکلتا تھا۔ لیکن وہ دیتے نہ تھے۔ کوئی کہتا آج کچھ آیا ہی نہیں۔ کوئی کہتا آج خرچ ہو گیا ہے۔ مَیں نے اُن کی منتیں کیں۔ دھمکیاں دیں۔ لڑائی جھگڑا کیا۔ کہا یہ تمہارا صریح ظلم ہے۔ ساری رقم یک مُشت نہیں دے سکتے۔ تھوڑا تھوڑا کر کے دیدو۔ تمہیں بھی تکلیف نہ ہو۔ میرا بھی کام چل جائے۔ لیکن جناب کون سُنتا ہے ؟ کہتے "جناب ! چند دن کی مُہلت دیجئے پائی پائی ادا کر دینگے۔ آخر دُکاندار ہیں چور تو نہیں ہیں کہ آپ کا روپیہ لے کر بھاگ جائیں گے"!

ایک دُکاندار نے یہاں تک ستم ظریفی کی۔ کہ ہماری آنکھوں کے سامنے چالیس روپے میں بیوی کے لئے بنارسی لہنگا خرید لیا۔ کوئی سفری ایجنٹ آ گیا تھا۔ سستا دیتا تھا۔ یہ حضرت مچل پڑے۔ ہم نے "کچھ" مانگا۔ تو کیش بکس اُلٹ کر دکھا دیا۔ کہ دیکھ لیجئے سب ملا کر سوا تیرہ آنے باقی ہیں۔ پھر مُسکرا کر یہ بھی کہہ دیا کہ گھر میں آٹا نہ ہو تو لے جائیے۔ اُس غریب کو کیا معلوم تھا کہ میرے گھر میں درحقیقت آٹا نہیں بلکہ دو دن سے میاں بیوی فاقے کر رہے ہیں۔ بچّوں کو کھلا دیتے ہیں۔ خود پیٹ پر صبر کا پتھر باندھ کر سو جاتے ہیں۔ حمیت نے گوارا نہ کیا کہ اپنی تباہ حالی کی داستان سُناؤں۔

سخت سُست کہہ کر چلا آیا کہ شاید کوئی دُوسرا سنجی دیدے۔ لیکن پتہ نہیں اُن کی بدنیّتی تھی یا ہماری بدنصیبی۔ کسی نے پیسہ بھی نہ دیا۔ اور مَیں جیسا گیا تھا ویسا ہی لَوٹ آیا۔ بلکہ اُس سے بھی بدتر۔ اُمید لے کر گیا تھا۔ یاس لے کر واپس آیا +

اب حالت یہ تھی کہ گھر جانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ سوچتا تھا۔ بیوی پُوچھے گی کچھ ملا تو کیا کہونگا۔ نیک بخت نے صُبح کے وقت کہا تھا۔ آج تو سر میں چکّر آتے ہیں کچھ ضرور لاؤ۔ اور آج بچّوں کے لئے بھی کچھ نہیں ہے۔ مَیں نے اُسے یقین دلایا تھا کہ آج ضرور لاؤنگا۔ جاکر دھرنا دے کر بیٹھ جاؤنگا۔ کہونگا بابا! میری رقم دو تو جاؤں ورنہ مَیں یہیں بیٹھا رہوں گا۔ دھنا سیٹھ نہیں ہوں۔ کہ تین تین مہینے حساب ہی نہ کروں۔ سب کھانا پینا اسی میں ہوتا ہے۔ دیکھتا ہوں کیسے نہیں دیتے۔ اور اب۔ کسی نے کچھ بھی نہ دیا تھا" +

مَیں آہستہ آہستہ مکان کی دُوسری چھت پر گیا جیسے طالب علم امتحان میں فیل ہو کر گھر آتا ہے۔ تو اُس کے پاؤں نہیں اُٹھتے یا بچہ کوئی قصور کر بیٹھے تو گھر جاتے ڈرتا ہے۔ نیچے گلی میں دروازہ کے باہر بچے کھیل رہے تھے۔ مَیں اُن سے آنکھیں چُرا کر اُوپر گیا۔ اور ایک چارپائی پر لیٹ کر اپنی زندگی کے اِس افسوسناک پہلو پر آنسو بہانے لگا +

شریمتی جی اُوپر تھیں۔ میرے پاؤں کی آواز سُن کر نیچے چلی آئیں اور بجلی کا بٹن دباتے ہوئے بولیں۔ بجلی کیوں نہیں جلائی۔ میں نے اس کی طرف بے بسی کی نگاہوں سے دیکھا، اور گردن جھکالی۔ افلاس میں آدمی

کسی سے آنکھیں ملاتے ہوئے بھی شرماتا ہے۔

وہ سب کچھ سمجھ گئیں۔لیکن اُن کے چہرے پر اب بھی وہی شگفتگی تھی۔ وہ میرے پاس آکر چارپائی پر بیٹھ گئیں۔اور بولیں، جی چھوٹا کیوں کرتے ہو۔آج نہ سہی کل سہی۔آخر کبھی تو بھگوان سُنے گا۔رونے سے کیا ہوتا ہے؟ وقت بھی نہیں گزرتا"۔

مَیں نے سرد آہ بھر کر کہا "آج تو بچّوں کے لئے بھی کچھ نہ ہوگا۔کیا کھائیں گے؟"

شریمتی نے "اُن کا فکر نہ کرو۔یہ جو سامنے کے مکان میں پنڈت رہتا ہے اس کی بیوی زبردستی سب کو چاول کھلا دیئے۔مزے سے کھیل رہے ہیں"۔

میں "تمہیں صبح چکر آرہے تھے اُن کا کیا حال ہے؟"

شریمتی "اب تو نہیں آتے آپ کو تو وہم کی بیماری ہے۔ذرا کہیں سر میں درد ہے۔پھر کیا مجال جو سارا دن بھول جائیں آخر اس طرح کسی کا کام چل سکتا ہے کیا؟ آپ باہر بھی رُلتے رہے ہونگے۔مَیں گھر میں بھی ہنستی رہی ہوں۔شائد آپ باور نہ کریں۔مَیں آج گاتی رہی ہوں۔ کئی عورتیں آگئی تھیں۔خوب جلسہ رہا"۔

مگر میرا دھیان ادھر نہ تھا۔شریمتی نے میرا کندھا جھنجھوڑ کر کہا "یہ آپ کیا سوچ رہے ہیں اس وقت؟"

مَیں "سوچتا ہوں کل کیا ہوگا"۔

شریمتی "جو کل ہونا ہے وہ کل دیکھا جائیگا۔اسوقت سوچنے کی ضرورت نہیں"

میں "پریس والے کا بل دینا ہے۔ اُس کا آدمی آج تو نہیں آیا"؟

شریمتی۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی اور بولی "آیا تھا۔ میں نے کہہ دیا۔ چند دن صبر کرو۔ جب روپیہ ہاتھ میں آئیگا بھیج دینگے"۔

میں "اور مالک مکان؟"

شریمتی (اطمینان سے) "وہ تو نہیں آیا۔ اور آئیگا تو میں کہہ دونگی اگلے مہینے دینگے۔ اس مہینے نہیں ہے کیا کرے گا؟ ہمارے وی پی تو وصول ہو کر آنے والے ہیں کتنے روپے کے ہونگے؟ ہونگے پچاس ایک کے قریب؟"

میں نے دل میں حساب کر کے کہا "اس سے زیادہ کے ہونگے"۔

شریمتی "میرے خیال میں دو تین منی آرڈر کل ضرور آئیں گے"۔

مجھے جیسے سہارا مل گیا۔ پوچھا "تمہیں کیسے معلوم ہے؟"

شریمتی "میرا دل کہتا ہے آئیں گے۔ اور دیکھ لینا ضرور آئیں گے۔ (تالی بجا کر) آج روزہ ہے، کل عید ہو گی۔ سویاں کھائیں گے"۔

شریمتی ہنستی تھی۔ مگر میرے چہرے پر ہنسی نہ تھی۔ سوچتا تھا۔ اس غریب نے میرے ساتھ بیاہ کر کے کیا سُکھ پایا! روٹیوں کو بھی ترستی ہے۔ اس کی سہیلیاں اچھا کھاتی ہیں اچھا پہنتی ہیں۔ اسے کھانے کو بھی میسّر نہیں۔ یہ دل میں کیا کہتی ہو گی؟

اتنے میں کسی نے نیچے آواز دی "مہاشہ جی!"

میں چونک پڑا! یہ کون ہے؟ میں جواب دیتے ہوئے بھی ڈرتا تھا کہ کہیں قرضخواہ نہ نکل آئے۔ شاید مالکِ مکان ہی آ گیا ہو۔ شریمتی جی نے کہا۔

باوا جیمل سنگھ ہیں! بُلا لو۔"

ہاں یہ وہی تھے۔ میری جان میں جان آئی بلند آواز سے کہا۔ چلے آئیے!"

جیمل سنگھ لاہور کے رئیس اعظم باوا ڈِنگا سنگھ صاحب کے صاحبزادے تھے۔ لاہور میں ایسا علم دوست دوسرا کم ہو گا۔ انہیں مطالعہ کُتب کا بیحد شوق تھا۔ اور میری تصنیفات کے تو عاشق تھے۔ میری ایک ایک کہانی اُن کی زبان پر تھی۔ میری ایک ایک کتاب اُن کی لائبریری میں تھی۔ مجھے اُن پر پُورا پُورا بھروسہ تھا۔ وہ میری خاطر سب کچھ کرنے کو تیار تھے۔ اگر اُنہیں صُورتِ حال کا علم ہوتا تو وہ آٹے کی بوریاں اور گھی کے ٹین بھجوا دیتے لیکن مَیں مصنّف ہوں اور مصنّفوں میں خُود داری کا جذبہ بدرجہ اُتم ہوتا ہے۔ مَیں گھر میں رو سکتا تھا۔ لیکن کسی کے سامنے اپنی حاجت ظاہر نہ کر سکتا تھا۔ یہاں تک کہ باوا جیمل سنگھ جیسے عزیز دوست کے سامنے بھی نہیں۔

شریمتی دُوسری چارپائی پر جا بیٹھی۔ باوا صاحب نے اُوپر آ کر ہم دونوں کو نمستے کی اور میرے پاس چارپائی پر بیٹھ کر کہا "آج رات کو ہم لوگ ناٹک دیکھنے جا رہے ہیں۔ آپ کو بھی چلنا ہو گا۔ یہ لیجئے درجہ خاص کا ٹکٹ۔ آپ کی سیٹ بُک ہو چکی ہے۔ مَیں نو بجے موٹر لے کر آؤں گا۔ تیار رہئیے آج بڑی بڑی بھیڑ رہے۔"

مَیں نے حیران ہو کر جیمل سنگھ کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا۔

"بلوا صاحب! مَیں آج تو نہ جا سکوں گا۔"

باوا صاحب نے پہلے اپنے کوٹ کی جیب سے چار اور ٹکٹ نکال کر

میرے سامنے چارپائی پر پھیلا دیئے۔ پھر میرے ہاتھ میں دیا سلائی کی ڈبیا دیدی۔ پھر پتلون کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کھڑے ہو گئے اور بولے ”بہت بہتر تو انہیں جلا دیجئے“۔

میں تذبذب میں تھا۔ روکھائی سے بولا ”باوا صاحب! یہ آپ کی سراسر زیادتی ہے۔ اگر آج میں نہ جا سکوں تو کیا کروں؟ اتنے اور آدمی ہیں۔ اُنہیں لے جائیے“۔

جیمل سنگھ ”مگر مہاشہ جی! آپ کے بغیر ناٹک دیکھنے کا خاک مزا آئیگا آپ نہ جائیں گے تو ڈاکٹر، چوہدری، بھٹناگر کوئی بھی نہ جائیگا۔ یہ سمجھ لیجئے“۔ یہ کہہ کر جیمل سنگھ نے اپنی ہاتھ گھڑی میں وقت دیکھا، اور کمرے میں ٹہلنے لگے شریمتی نے میری طرف دیکھ کر اشارے سے کہا۔ ”باوا صاحب اس لئے کر آئے ہیں چلے جاؤ“۔ میں نے نگاہوں میں جواب دیا۔ میں آدمی ہوں۔ قصائی نہیں ہوں کہ تم یہاں فاقہ کرو۔ میں ناٹک دیکھتا پھروں۔

باوا صاحب آ کر پھر میرے سامنے کھڑے ہو گئے اور بولے ”کہئے! آپ نے کیا فیصلہ کیا (شریمتی کی طرف اشارہ کر کے) کیا ان کا خوف ہے؟ ان سے میں اجازت لے دیتا ہوں“۔

شریمتی نے جلدی سے کہا ”میری طرف سے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بڑے شوق سے جائیں۔ بلکہ میں تو خود کہنے جا رہی تھی۔ کہ آپ جائیے۔ ذرا تفریح ہو جائے گی“۔

جمیل سنگھ نے مسرت کا اظہار کیا۔ "تو پھر یہ کیسے نہ جائیں گے؟ ان کو ضرور جانا ہوگا۔ ورنہ کوئی بھی نہ جائیگا۔ لیجئے۔ مہاشہ جی! سب ٹکٹ آپ ہی کے پاس رہینگے۔ مَیں سب لوگوں کو لے کر ۹ بجے آ جاؤں گا۔ نمستے!"

مَیں مُنہ دیکھتا ہی رہ گیا۔ جمیل سنگھ کھٹ کھٹ کرتے ہوئے نیچے اُتر گئے۔ مَیں نے ٹکٹ اُٹھائے اور اُن کے پیچھے بھاگا لیکن ابھی دروازے ہی میں تھا۔ کہ اُن کا موٹر چلا گیا۔ مَیں چلّاتا ہی رہ گیا۔ جمیل سنگھ نے موٹر سے گردن نکال کر کہا۔ "۹ بجے آؤں گا۔ ۹ بجے تیار رہنا"۔

اُوپر آیا تو بیوی صاحبہ نے ہنس کر کہا۔ "چلے جاؤ اب۔ کیا حرج ہے! ذرا دل بہل جائیگا۔ یہاں رہ کر بھی کیا کر لیتے؟ وہاں اور نہ ہوگا۔ ذرا ہنس کھیل تو آؤ گے۔ یہی غنیمت ہے"۔

مَیں۔ "مَیں وہاں تماشا دیکھوں گا، تم یہاں بیٹھ کر رو ؤگی۔ کیوں؟"

شریمتی۔ "واہ رونے کی کیا ضرورت ہے۔ بیٹھ کر باجہ بجاؤں گی مزے سے جب نیند آئیگی سو جاؤں گی"۔

مَیں۔ "مَیں نہ جاؤں گا۔ یہ جمیل سنگھ کی سراسر زیادتی ہے۔ یہاں تین دن سے فاقے کر رہے ہیں۔ انہیں ناٹک کی سُوجھ رہی ہے"۔

شریمتی۔ "اس غریب کو کیا معلوم کہ یہاں یہ حالت ہے! وہ تو سمجھتا ہے۔ مہاشہ جی کو کسی چیز کی پرواہی نہیں ہے"۔

مَیں۔ "مَیں صاف کہہ دُونگا۔ مَیں آج نہیں جا سکتا"۔

لیکن جمیل سنگھ زبردستی گھسیٹ کر لے گئے۔ محبت کے احکام کی

نافرمانی کس نے کی ہے؟ چُپ چاپ موٹر میں بیٹھ گیا۔ ساڑھے نو بجے یُں درجہ خاص میں بیٹھا ناٹک دیکھ رہا تھا۔ کسے خیال ہو سکتا تھا کہ یہ شخص جو موٹر میں بیٹھ کر آیا ہے۔ سات روپے کے درجہ میں بیٹھا ہے اور جس کے لئے باہر موٹر کھڑا ہے۔ تین دن کا بھُوکا ہو گا۔ یں تصویر کے اُن دونوں رُخوں کو دیکھتا تھا اور کبھی ہنستا تھا کبھی روتا تھا۔ مگر دوستوں میں سے کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔ کہ اس کے دِل پر کیا کچھ گزُر رہی ہے۔

بارہ بجے پہلا باب ختم ہوا۔ ہم لوگ باتیں کرنے لگے۔

جمیل سنگھ "عجیب چیز ہے۔ نہ دیکھتے تو افسوس رہتا۔ کیوں مہاشہ جی!"

یں "بلاشبہ ناٹک بہت عمدہ ہے۔ سین سینری بھی قابل دید ہے!"

ڈاکٹر صاحب "ڈرامے کا پلاٹ بھی نہایت عمدہ ہے ولایت میں لوگ سین سینری نہیں دیکھتے۔ پلاٹ اور ایکٹنگ دیکھتے ہیں"۔

چودھری "ہم کو سینری چاہیئے۔ آپ پلاٹ دیکھئے کیوں بھٹناگر!"

بھٹناگر (ذرا سے ہنس کر) "ہم کو سب کچھ پسند ہے۔ ماسٹر موہن کمال کا ایکٹر ہے"۔

یں "کیا کہنا! یہ شخص یورپ میں ہوتا۔ تو سونے کے محل کھڑے کر لیتا"۔

معاً جمیل سنگھ نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "کیوں مہاشہ جی! کچھ کھاؤ گے؟ میرے پیٹ میں تو چوہے دَوڑنے لگے"۔

یں "بھُوک تو مجھے لگی ہے"۔

جیمل سنگھ:۔ "تو آئیے باہر چلیں۔ دیکھیں کیا مل سکتا ہے۔ اگر گرم گرم پُوریاں مل جائیں۔ تو مزا آجائے"۔

ہم دونوں باہر آئے۔ پُوریاں بن رہی تھیں۔ مگر خریدار اتنے تھے۔ کہ مجھے مایُوسی سی ہو گئی۔ جیمل سنگھ نے بھیڑ میں گھس کر حلوائی سے کہا۔ "یار تم ہمیں اندر پُوریاں نہیں بھجوا سکتے؟"

حلوائی نے پُوریاں کا دونا ایک آدمی کے ہاتھ پر رکھا اور دُوسرے ہاتھ سے پیسے گن کر کہا:۔ "بابو جی! یہاں مل جائیں جب بھی غنیمت سمجھئے۔ وہاں کون بھیج سکتا ہے؟ یہ کہہ کر پیسے برتن میں ڈال لئے"۔

جیمل سنگھ کو طیش آگیا۔ بولے "فی پُوری ار دو نگا درجہ خاص میں بھیجو"۔

حلوائی کو تعجب ہُوا۔

جیمل سنگھ:۔ "ہاں ہاں ایک آنہ فی پُوری۔ یہ لو پانچ کا نوٹ باقی لوٹا دینا"۔

حلوائی نے نوٹ لے کر مؤدبانہ انداز سے:۔ "آپ چلئے۔ آپ کو وہاں پُوری ملے گی"۔

جیمل سنگھ:۔ "مگر اُستاد گرم گرم ملے"۔

حلوائی:۔ "جو ذرا بھی ٹھنڈی ہو گی اُس کے دام کاٹ لینا بابو صاحب"۔

اِدھر تماشا شروع ہُوا، اُدھر ہم لوگوں کو گرم گرم پُوریاں ملنے لگیں میں نے بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارے اسوقت اِن پُوریوں کا ذائقہ ہی اور تھا۔

پُوریوں کے بعد مٹھائی آئی۔ لڈو بہت عمدہ بنے تھے۔ جیمل سنگھ نے

ایک لڈّو اُٹھا کر مجھے دیا اور کہا "مہاشہ جی! یہ لڈّو کھائیے! نہایت لذیذ ہے"۔
مَیں نے کھا کر دیکھا۔ واقعی لذیذ تھا۔ مگر ——— میرے کلیجہ میں جیسے کسی نے مُکّا مار دیا۔ مَیں یہاں اس طرح مٹھائیاں کھا رہا تھا۔ وہاں گھر میں میری بیوی بھوکی سو رہی تھی۔ کاش اس وقت وہ بھی یہاں ہوتی۔
مَیں سوچنے لگا ———
جب مَیں تین بجے گھر پہنچا تو میرے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔
شریمتی جی نے پوچھا "ناٹک کیسا تھا؟"
مَیں نے کوٹ اُتارتے ہوئے کہا "اچھا کیا، جو مجھے بھیج دیا۔ خوب پوریاں اور مٹھائیاں کھائیں"۔
شریمتی "اکیلے ہی اکیلے کھا آئے۔ میرے لئے کیوں نہیں لائے؟"
مَیں۔ (مسکرا کر) "چڑاتا! تو لو بھئی تم بھی کیا یاد کرو گی؟"
یہ کہہ کر مَیں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اور دو لڈّو نکال کر شریمتی جی کے ہاتھ میں رکھ دیئے۔
شریمتی نے لڈّو منہ میں ڈال لئے اور کہا "چور"!
میں نے بستر پر لیٹ کر جواب دیا "شکر ہے، مَیں چور ہوں۔ ورنہ مَیں آدمی نہ ہوتا۔ شیطان ہوتا"۔
میری بیوی نے مُسکرا کر میری طرف دیکھا اور دوسرا لڈّو بھی منہ میں ڈال لیا۔

———

حکیم ارسطو اور ایک عورت

دو ہزار سال، بلکہ اس سے بھی زیادہ زمانہ گزرا، یونان پر ایک ایسا اولوالعزم بادشاہ حکومت کرتا تھا، جس نے یونان کی شہرت کو دُنیا کے گوشے گوشے میں پھیلا دیا۔ اور جسے تاریخ کی دُنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ سکندر اعظم کا نام یونان اور اس کے باہر، نزدیک و دُور، بچے بچے کی زبان پر تھا۔ اور اُس کی شجاعت کے کارنامے، اور اُس کی جانبازی کے افسانے اِس قدر عام اور تحیّر خیز تھے، کہ دُوسرے تاجدار اپنے اپنے محلوں میں بھی اُس کے تصوّر سے کانپ اُٹھتے تھے، اور اُن کی نیند اُچاٹ ہو جاتی تھی۔ ہر نیا سُورج اُس کی فتوحات میں نیا اضافہ کرتا تھا۔ ہر نئی شام اُس کی عظمت کو پہلے سے وسیع، بلند اور زمین میں زیادہ مضبوطی سے گڑا ہُوا پاتی تھی۔

پُورا سکندر اعظم اپنے پُورے شباب پر تھا، اور موت کا خدشہ اُس کی اُمیدوں کی دُنیا سے کوسوں دُور تھا۔ اُسے ابھی یہ سوچنے کی بھی فرصت نہ تھی، کہ میرے لئے قدرت نے موت بھی پیدا کی ہے، اور وہ

کسی دن میری شجاعت اور زندگی دونوں کو شکست دے کر مجھ پر قابض ہو جائے گی۔ وہ جب اپنے باوقار گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو کر باہر نکلتا تھا، تو یونان کی مہ جبین کنواری لڑکیوں میں ہلچل مچ جاتی تھی اور اُن میں سے وہ جو اپنے حسن و شباب پر زیادہ نازاں تھیں، اور جن کو شاہی دبدبہ کا کم خوف تھا، ڈرتے ڈرتے اپنے پُر جذبات دلوں کو پھولوں میں لپیٹتی تھیں۔ اور جرأت کر کے سکندر کی طرف پھینک دیتی تھیں لیکن سکندر اُن کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھتا بھی نہ تھا۔ وہ فتوحات اور شہرت کا پیاسا تھا حسن و شباب کا پیاسا نہ تھا۔

اور اس کا اک خاص سبب تھا۔ اُس کی تربیت اُستاد ارسطو کے زیر نگرانی ہوئی تھی۔ اور اُستاد ارسطو معمولی منشی نہ تھا۔ یونان کا وہ حکیم تھا، جس کی حکمت و دانائی کی لافانی باتیں یاد کر کے یونان آج بھی ٹھنڈی آہیں بھرتا ہے۔ اُس نے سکندر کو اُس کے عہد طفلی ہی سے اپنی نگرانی میں لیا اور اُسے اِس قسم کی تربیت دی، کہ وہ بڑا ہو کر یونان کے لئے باعث توقیر ثابت ہو اور دُنیا اِس حقیقت سے آگاہ ہو جائے کہ جب کوئی قابل اُستاد اپنے شاگرد پر اپنے دل و دماغ کی کامل قابلیتیں کامل ایمانداری سے صرف کرتا ہے، تو شاگرد جوانی کی قوت اور بڑھاپے کی عقل و دانش حاصل کر کے کیا بن جاتا ہے؟ لیکن اُسے اب بھی اطمینان نہ تھا۔ وہ اب بھی سکندر کے لیل و نہار کی ہمیشہ نگرانی کرتا تھا۔ اور اُس کی طرف سے کبھی غافل و بے پرواہ نہ ہوتا تھا۔ مبادا حُسن، جو دُنیا کا سب سے لطیف دھوکا

ہے، اُس کی آنکھوں پر قبضہ کر کے اس کی تمام کوششوں۔ تمام محنتوں اور تمام پیش بندیوں کو پائمال کر دے۔ سکندر دُوسروں کے لئے جوان تھا۔ ہوشمند تھا، شہنشاہ تھا، فاتح اعظم تھا، لیکن ارسطو کے لئے وہ اب بھی وہی خطا کار، قدم قدم پر غلطیاں کر جانے والا، ذرا ذرا سی بات کو بھول جانے والا نادان بچہ تھا جس کو ہر لمحہ کسی بزرگ کی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ بوڑھا ارسطو ہر وقت اور ہر جگہ جوان سکندر کے ساتھ رہتا تھا۔ اور اُسے ہر خطرے، اور ہر مصیبت سے وقت پر آگاہ کر دیتا تھا*

بعض وقت جب نو عمر، کنواری لڑکیاں سکندر اعظم پر محبت کے پھول پھینکتی تھیں تو اُن میں سے بعض اُستاد ارسطو کے گھوڑے پر بھی آگر پڑتے تھے۔ اُستاد ارسطو اُن کو اُٹھا کر پہلے اپنے سامنے، سڑک کی مٹی پر پھینک دیتا تھا۔ اور اس کے بعد انہیں بے دردی سے اپنے گھوڑے کے سُموں تلے کچل دیتا تھا*

سکندر اپنی جانباز سپاہ لے کر یُونان سے نکلا، اور جو ملک سامنے آیا، اُسے اس آسانی سے فتح کرتا گیا جیسے اُس کی قسمت میں کوئی شکست نہ تھی۔ جیسے وہ صرف فتح حاصل کرنے کے لئے پیدا ہُوا تھا۔ سپاہی آرام کے لئے ترستے تھے، لیکن سکندر امنگوں کے آسمان پر اُڑا چلا جاتا تھا۔ اُسے کھانے پینے کا خیال نہ تھا، نہ عیش و آرام کی چاہ تھی۔ وہ صرف فتح کرنا چاہتا تھا۔ آخر ایران کے ایک شہر میں وہ ایک ہفتہ کے لئے ٹھہر گیا۔

تاکہ اُس کی سپاہ آرام کرلے، اور نئی لڑائیوں کے لئے جو بظاہر کسی ختم نہ ہونے والے پہاڑی سلسلہ کے مانند اُس کے سامنے دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اپنی تھکی ہوئی طاقتوں کو پھر سے اُستوار کرلیں۔ لیکن ہفتہ گزر گیا اور شاہی خیمہ سے کوُچ کا حکم جاری نہ ہُوا ؛

اس کی وجہ مہ جبین تھی۔ جسے سکندر نے گھوڑے کی پیٹھ پر سے ایک کھڑکی میں بیٹھے دیکھا تھا اور ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ اُس نے یُونان میں ہزاروں خوبصورت عورتیں دیکھی تھیں۔ لیکن جو بات ایران کی اِس معمولی عورت کے نقش و نگار میں تھی، وہ اس سے قبل کہیں نہ دیکھی تھی۔ جو کل تک فتوُحات کا دلدادہ تھا، وہ آج ایک حسینہ پر مٹا ہُوا تھا۔ اور سکندر کے سینہ کی اُمنگیں اُس حسینہ کے پاؤں میں لوٹ رہی تھیں ؛

جہاندیدہ ارسطو نے یہ دیکھا، اور اُسے اُس کے دل کی کمزوری پر رنج ہُوا۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں نے حکمت و دانش کے جو خیالات اُس کے دل میں بھر دیئے ہیں وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے اور وہ عورت کے جادُو سے سدا کے لئے محفوُظ رہے گا۔ لیکن اُس کی اُمیدیں صادق نہ اُتریں۔ اور اُس نے اپنے شاگرد کو حُسن کے حملوں کے سامنے عاجز و بے بس پایا۔ چنانچہ ایک دن جب سکندر اپنے بہادر سپاہیوں اور جرنیلوں کے درمیان بیٹھا اپنی فتوُحات پر تعریف و ثنا کی باتیں سُن سُن کر خوش ہو رہا تھا، تو بُوڑھا اور بدصوُرت ارسطو کوّے کے لمبے سائے کی طرح جو باغ کے حسین و جمیل پھولوں پر سے گزر رہا ہو، اِس محفل میں آیا، اور آکر سکندر کے

سامنے کھڑا ہو گیا۔

اور اس وقت ارسطو نے دُنیا کی سب سے خوفناک، اور تباہی آور بیماری محبت پر ایک جامع اور پُرتاثیر تقریر کی۔ اور یُونان اور رُوم کے قدیم حکیموں کی کتابوں کے حوالے دے دے کر ثابت کیا، کہ سپاہیوں کے لئے عورت کا وجود اُن کے بلند و بالا ارادوں کی پستی کا باعث ہے اور لوگ اِس فریب میں آ جائیں تو حرج نہیں مگر حکیموں اور بادشاہوں کے لئے عورت کا حُسن زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر ہے۔

ارسطو نے اپنی عُمر بھر کی حکمت و دانائی کی تمام دلیلیں عورت کی مخالفت میں ختم کر دیں اور سکندر سر جُھکا کر اُس کا ایک ایک لفظ سُنتا رہا۔ لیکن جب ارسطو چلا گیا تو سکندر کی نگاہیں اپنے سپاہیوں کے چہرے پر نہ اُٹھتی تھیں۔ اور وہ اپنے دل میں نادم تھا، کیونکہ ارسطو نے اُسے بھرے دربار میں ذلیل کیا تھا، اور اِس بات کی پروا نہ کی تھی۔ کہ اب وہ طفلِ مکتب نہیں، بلکہ فاتحِ اعظم ہے۔ درباری اور سپاہی ابھی تک اُس کے سامنے بیٹھے تھے، اور اُن کے دلوں میں متضاد خیالات تھے۔ کوئی ارسطو کی جرأت پر اُس کی تعریف کرتا تھا۔ کوئی اُسے ناعاقبت اندیش حکیم سمجھتا تھا۔ کوئی سکندر کی بُردباری کا مداح تھا، کوئی اُس کی خاموشی کو اُس کی بُزدلی اور کم عقلی پر محمول کرتا تھا۔ اور سکندر۔

وہ اس وقت بے انتہا آزردہ تھا۔ اُس کے سینہ میں بُردباری اور

غصّہ کی لڑائی ہو رہی تھی چنانچہ اُس نے دربار کی بقیّہ کارروائی عجلت و ندامت میں ختم کی۔ اور اُسی وقت اپنے مقام کو جہاں وہ ٹھیرا ہُوا تھا۔ چلا گیا۔ اور ایرانی عورت کے حُسن خداداد کو۔ اپنے دل کی کمزوری کو اور ارسطو کی بیباکی کو کوسنے لگا اور اُس نے دل میں فیصلہ کر لیا۔ کہ اب اس حسین لڑکی کا مُنہ نہ دیکھوں گا۔ لیکن جب چند گھنٹے گزر گئے تو اُس کے ارادے پست ہو گئے اور اُس نے اپنے دل کی مزاحمت کو حُسن کی کشمکش کے سامنے بے دست و پا پایا اور اُسے اُستاد کی حکمت و دانائی کے الفاظ حکمت و دانائی سے خالی اور حقیقت سے مبرّا نظر آئے۔ اب وہ پھر وہی اسیرِ حُسن سکندر تھا، وہی اُس کا گھوڑا تھا، وہی پتھریلی سڑک تھی، اور وہی اس لڑکی کی سیاہ آنکھوں اور سفید دانتوں کا بیتاب و بے چین کر دینے والا تصوّر تھا۔

مگر جب وہ وہاں پہنچا، اور وہ لڑکی اپنے حُسن و جمال کی تمام کافرادا رعنائیوں کو لے کر اُس کے سامنے آئی۔ تو سکندر کا دل اُس کے سینہ میں سرد ہو گیا۔ اور اُستاد ارسطو کے تنبیہ کے الفاظ اُس کے اور حسینہ کے درمیان آ کر کھڑے ہو گئے۔

وہ چُپ چاپ سر جُھکا کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔ مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ یُونان سے دُنیا جیتنے نکلا تھا۔ یہاں آ کر اپنا دل ہار گیا۔ لوگ کیا کہیں گے؟ سکندر کھڑا ہو گیا، اور بولا "معاف کرو، مجھے ضروری کام ہے۔ آج نہ ٹھیر سکوں گا"۔

لیکن اِس گھر کے فرش نے سکندر کے پاؤں کو پکڑ لیا۔

اور حسینہ نے مسکرا کر کہا: "یقیناً تمہیں کسی نے یہاں آنے سے منع کیا ہے۔ یہ تمہارے چہرے سے، تمہاری آنکھوں سے۔ تمہاری آنکھوں کی ندامت سے ظاہر ہے۔ بتاؤ وہ کون ہے؟ اور میں تمہارے شاہی دبدبہ کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اُس کا غرور مٹی میں ملا دوں گی"۔

سکندر اپنے زمانہ کے سب سے بڑے حکیم ارسطو کا بیحد احترام کرتا تھا اور اس ذلت کے گھر میں اُس کا نام لے کر اُس کی توہین کرنے کو تیار نہ تھا لیکن وہ کمزور تھا، اور اُسے حُسن کی حکم عدولی کی تاب نہ تھی۔

اُس نے سب کچھ کہہ دیا۔

حسینہ نے حکیم ارسطو کے الفاظ، سکندر کی زبان سے سُنے اور تلملا کر کھڑی ہو گئی۔ سکندر نے اُس کا غُصّہ دیکھا اور اُس پر جادو سا ہو گیا۔ اُسے آج تک معلوم نہ تھا کہ حُسن جب برہم ہوتا ہے، تو کیا ہوتا ہے!

اُس نے کہا: "جانِ من! میں تمہیں چاہتا ہوں آہ نہیں بتا سکتا، کس قدر چاہتا ہوں۔ تم میری محبّت کے صدقہ میں اس بیوقوف بُڈھے کے الفاظ کو بھلا دو۔ وُہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا"۔

"نہیں" بپھری ہوئی حسینہ نے کہا: "اُس نے عورت کے حُسن کی، عورت کے شباب کی، عورت کے وقار کی توہین کی ہے اُس نے عورت کی تقدیس کو گالیاں دی ہیں۔ اُس نے عورت کو مقابلہ کے لئے للکارا ہے اور میں ایک کمزور اور ناتوان عورت، عورتوں کی دُنیا کی طرف سے اس کا جواب

دُونگی۔ اور اس کو بتا دُونگی کہ اس کی، اُس کے بڑھاپے کی، اور اُس کی حکمت کی عورت کے سامنے کوئی حقیقت نہیں ہے۔ وہ سمجھتا ہے، مَیں حکیم ہوں، مجھ پر کسی کا اثر نہیں ہو سکتا مگر مَیں ثابت کر دُوں گی، کہ جب ایک نازنین اپنی پُر تبسم نگاہوں کا حربہ لے کر اُس پر حملہ کرتی ہے تو اُس کی حکمت و دانائی کا زرہ بکتر آنِ واحد میں پاش پاش ہو جاتا ہے"۔

سکندر نے مُسکرا کر کہا "وہ ایسی باتوں سے بالاتر ہے"۔

حسینہ "لیکن وہ پھر بھی آدمی ہے۔ اُس کے سینہ میں دل ہے۔ دل میں جذبات ہیں، جذبات میں حرارت ہے"۔

سکندر "میرا خیال ہے اُس کے سینہ میں کوئی دل نہیں ہے۔ اگر کبھی تھا تو وہ مر چکا ہے"۔

حسینہ "میری نگاہیں اُسے پھر سے زندہ کر دیں گی۔ تم کو صرف دو باتیں کرنا ہوں گی"۔

سکندر "کیا"۔

حسینہ "ایک تو جس باغ میں آپ اور وہ ٹھیرے ہیں اُس کی چابی مجھے بھجوا دیجئے۔ دُوسرے میں چاہتی ہوں صبح کے وقت آپ اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر باغ کی طرف دیکھئے۔ اور آپ وہ دیکھیں گے جس کی آپ کو کبھی توقع نہ ہو گی"۔

سکندر نے کچھ سوچ کر جواب دیا "بہت اچھا۔ اے حسینہ! تیری خاطر میں یہ دونوں باتیں کرونگا۔ گو مجھے یقین نہیں کہ میرا اُستاد اپنی اور میری نگاہوں میں

ذلیل ہوگا۔ تاہم تو اپنے ترکش کے تمام تیر اس پر ختم کر سکتی ہے۔"

دُوسرے دن تین آدمی بہت سویرے جاگے۔ ایک اُستاد ارسطو، دُوسرا بادشاہ سکندر، تیسری نوعمر حسینہ۔ اور تینوں کے خیالات مختلف تھے۔

ارسطو سوچتا تھا۔ انسان کتنا احمق ہے، جو ناپائیدار شہرت، پنچھی کے سایہ کی طرح گزر جانے والی دولت اور برساتی ندی کے مانند چند روز چڑھ کر اُتر جانے والی جوانی کے پیچھے دَوڑتا ہے اور یہ سوچنے کی پروا نہیں کرتا کہ اِس دُنیا میں میرا مقصد کیا ہے؟ اور اُس کو پُورا کرنے کے کیا ذرائع ہیں؟

سکندر سوچتا تھا، آج ایک نوعمر عورت حُسن و شباب کے حربے لے کر حکمت و دانش پر حملہ کرنے جا رہی ہے۔ دیکھیں کون جیتتا ہے، کون ہارتا ہے؟

حسینہ سوچتی تھی۔ بُوڑھا دانا ہے، اور رات دن دُنیا کے مُشکل ترین عُقدے حل کرتا رہتا ہے اور اپنے دل کو دفن کر چکا ہے۔ دیکھیں میرے ناز و انداز اُس کے مُردہ دل میں زندگی کی حرارت پیدا کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں یا نہیں؟

اُستاد ارسطو نے اپنی بتی جلائی، کاغذ اور قلم دوات لے کر بیٹھ گیا۔ اور انسانی زندگی کے واحد مقصد پر ایک جواب مضمون لکھنے لگا اُس وقت باہر باغ میں تاریکی تھی۔ اور گھاس اور گلاب کے پھُول کا رنگ سیاہ نظر آتا

تھا ارسطو نے باہر جھانک کر اس تاریکی کی طرف دیکھا، اور پھر اپنے روشن خیالات کی منوّر و شاداں دُنیا میں ہمہ تن محو ہو گیا۔ وہ آسان الفاظ کے چھوٹے چھوٹے فقروں میں دل اور رُوح کی پاکیزگی کو ایسے حسین انداز میں بیان کر رہا تھا کہ جو کوئی ایک مرتبہ پڑھ لے، پھر اُس کی گمراہی کا کوئی خدشہ نہ رہے۔ اِدھر باہر سُورج کی کرنیں باغ کے پھولوں اور پتّوں اور درختوں کے ساتھ کھیل رہی تھیں اور ایک نوعمر حسینہ اپنے کبوتر کی طرح سفید پاؤں سبز گھاس پر رکھتی ہوئی ٹہل رہی تھی اور طلوعِ حُسن و شباب کا ایک دلکش گیت گا رہی تھی۔

حسینہ گاتی تھی، سُورج کی کرنیں ناچتی تھیں اور دُور فاصلے پر ایک کھڑکی میں کھڑا اسکندر یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

ارسطو لکھتے لکھتے رُک گیا۔ اور سُننے لگا۔ باہر باغ میں سے کوئی آواز آ رہی تھی۔ لیکن اُس نے اس آواز کی طرف سے اپنے کان بند کر لئے اور اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذ پر اپنے خیالات بکھیرنے میں مصروف ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ارسطو کے کانوں نے پھر وہی آواز سُنی۔ اب اس میں دلکشی تھی، اور شیرینی تھی، اور موہنی تھی۔ ارسطو کو اپنے دائیں ہاتھ میں تکان کا احساس ہُوا۔ اور اُس نے سوچا۔ میں بُڈھا ہو گیا ہوں اور میرے ہاتھ کمزور ہو گئے ہیں۔ اُس نے بائیں ہاتھ سے اپنے دائیں ہاتھ کو دبایا۔ اُسے گرم کیا پھر اُس کے لکھنے کے لئے قلم اُٹھایا۔ لیکن باہر سے

پھر آواز آئی۔ اور اس کی اُنگلیوں کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ اور اُس کا دماغ اُس کے حکم کے خلاف بغاوت کرنے لگا۔ وہ لکھنا چاہتا تھا لیکن اُس کا دماغ، اور اس کی اُنگلیاں دونوں اس کے بس میں نہ تھے۔ اور اُس کے کان باغ کی آواز سُننے کے لئے بے چین و بے قرار تھے۔

آخر وہ اپنے لکھنے کی ڈسک سے اُٹھا، اور کھڑکی میں کھڑا ہو کر نیچے باغ میں جھانکنے لگا۔ وہاں سرسبز و شاداب درخت تھے، گھاس تھی۔ حسین پھول تھے اور اُن پر شبنم کے قطرے سفید موتیوں کے مانند چمک رہے تھے۔ لیکن وہاں کچھ اور بھی تھا۔ اور یہ ایک مست شباب نازنین تھی جو نہایت پیارے انداز میں ہنس کی طرح ٹہلتی تھی اور گاتی تھی اور اُس کا ٹہلنا کسی باکمال رقاصہ کے رقص سے کم دلکش نہ تھا۔

اُستاد ارسطو اُس کی طرف اپنی ضعیف آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اور اُسے دُنیا و مافیہا کا ہوش نہ تھا۔ اُس کے سر پر سے کپڑا کھسک گیا تھا اور اُس کے لمبے لمبے سُنہرے بال اُس کے شانوں پر سے بکھیر کر کمر تک لٹک رہے تھے اور ہوا کے جھونکے اُنہیں چھوتے تھے اور اُنہیں چھیڑ کر اور اُنہیں اور بھی خوبصورت بنا کر پھولوں پر منتشر ہو جاتے تھے۔ اور اس کا گیت اِس قدر میٹھا، اور ترنم ریز تھا۔ کہ معلوم ہوتا تھا پھول اور پتے گھاس اور پودے سب ہمہ تن گوش ہو کر سُن رہے ہیں۔ اُستاد ارسطو کھڑکی میں اور بھی جھک گیا اور بڑے دھیان سے اِس گیت کو سُننے لگا۔

سکندر نے اپنی کھڑکی سے اپنے اُستاد کو حسینہ کی طرف تاکتے ہوئے دیکھا اور قدرے حیران ہُوا۔ لیکن اُستاد کی آنکھیں اس طرف سے بالکل بند تھیں:۔

ارسطو بڑا زبردست مصنّف تھا، اور اُسے اپنے الفاظ پر اور خیالات پر، اور اُن کے اظہار پر پُوری پُوری قُدرت حاصل تھی۔ لیکن جو جذبات اس وقت اُس کے دل میں تھے۔ اگر وہ انہیں قلمبند کرنا چاہتا، تو غالباً کبھی نہ کر سکتا۔ اِس وقت اُس کے سامنے باغ میں ایک لڑکی تھی، اور وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا، لیکن اسوقت وہ ایک اور لڑکی کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ جو کبھی یونان میں رہتی تھی اور اُس سے محبّت کرتی تھی۔ اُسے ایسا معلوم ہُوا، جیسے وہ لڑکی جسے مرے ہوئے کئی سال گزر چکے تھے۔ باغ کی اِس لڑکی میں زندہ ہو گئی ہے۔ پھر اُسے ایسا معلوم ہُوا جیسے وقت کی سُوئیاں پیچھے مُڑ گئی ہیں، اور اُس کا دل پھر سے نوجوان ہو گیا ہے، اور اسی شدّت سے اسی جوش سے اُس سے محبّت کرتا ہے لیکن وہ خود بُوڑھا ہے، جس کی نوجوانی کی بہار ختم ہو چکی ہے۔ اور جس کا جسم بُڑھاپے کی جھرّیوں میں اسیر ہے۔ وہ چند لمحے تک انہی خیالات میں محو رہا۔ اس کے بعد وہ اس قدر بے پروائی سے پیچھے کی طرف مُڑا، کہ اُس کی دوات لکھے ہوئے کاغذوں پر اُلٹ گئی۔ اور سیاہی سارے مضمون پر پھیل گئی، لیکن اُس نے نہ اِدھر دیکھا نہ دیکھنے کی ضرورت سمجھی اور نیچے اُتر کر باغ میں چلا گیا۔ اور اس لڑکی کے پیچھے کھڑا ہو کر اُس کی طرف نہایت غور سے

دیکھنے لگا۔

بظاہر لڑکی کو علم نہ تھا، کہ کوئی شخص اُس کے پیچھے کھڑا اُس کی صراحی دار گردن، اُس کی گوری پیٹھ اور اُس کے سیاہ لمبے بالوں کی بہار کو دیکھ رہا ہے۔ وہ ایک پھول کے پاس کھڑی تھی، اور اس کی دلکشی اور رنگینی کا نظارہ کرنے میں ہمہ تن مستغرق تھی۔ یکایک ارسطو نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔ اور کہا "تعجب ہے پھول بھی پھول کو محبت کی نگاہوں سے دیکھتا ہے"۔

لڑکی نے قدرے چونک کر بوڑھے کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا کر زمین کی طرف دیکھنے لگی۔

ارسطو کے حوصلے بڑھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے اپنے لکڑی کے مانند خشک بازو لڑکی کے گلے میں ڈال دیئے۔ اور اُسے وہ زمانہ یاد آگیا جب وہ جوان تھا اور اپنی پیشانی پر خوش رنگ پھولوں کے ہار باندھ کر اپنی محبوبہ کے ساتھ محبت کی بازیاں کھیلا کرتا تھا۔

یہ لڑکی وہ نہ تھی، مگر پھر بھی ویسی ہی تھی، ویسی ہی شوخ، ویسی ہی خوبصورت، ویسی ہی نوعمر۔ ارسطو نے اُس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان دبا کر اپنی آنکھیں اُس کی آنکھوں میں ڈال دیں۔ اور آہستہ سے کہا "مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔ کیا تم بھی مجھے چاہتی ہو؟"

لڑکی نے ارسطو کی طرف مسکراہٹ کی نگاہوں سے دیکھا اور سر

جھکا لیا۔ اور اُس کی زبان سے کوئی لفظ نہ نکلا۔

"کیا تم بھی مجھے چاہتی ہو؟" ارسطو نے دوسری مرتبہ پھر پوچھا۔

لڑکی نے اب کے بھی جواب نہ دیا۔

ارسطو نے اپنی اُنگلی لڑکی کی ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر اُس کا چہرہ اُوپر اُٹھایا اور پھر پوچھا "کیا تم مجھ سے محبت کر سکتی ہو؟"

لڑکی کا چہرہ حیا سے سُرخ ہو گیا۔ آہستہ سے بولی "کر سکتی ہوں۔ لیکن ایک شرط ہے اگر پوری کر سکو تو میری محبت تمہارے لئے وقف ہوگی"

"کیا"؟

لڑکی نے اپنا مُنہ یونان کے سب سے بڑے حکیم کے کان کے پاس لے جا کر کچھ کہا اور پھر بچوں کی طرح کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

لیکن ارسطو کے چہرہ پر ہنسی نہ تھی۔ اُس نے لڑکی کی طرف نہایت غور سے دیکھا۔ گویا وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا، کہ کیا جو کچھ لڑکی نے کہا ہے وہ سنجیدگی سے کہا ہے؛ یا یہ اُس کی دل لگی ہے۔ اور جب اُس کو یقین ہو گیا، کہ لڑکی اپنی طلب میں صادق ہے تو اُس کا چہرہ اُداس ہو گیا۔ اور جو رونق اس کی بے نور آنکھوں میں ابھی ابھی پیدا ہوئی تھی۔ وہ پھر بڑھاپے کی بے رونقی میں تحلیل ہو گئی۔ اُس نے مایوسی کی اک آہ سرد بھری اور اپنے لکھنے کے کمرہ کی طرف جانے کے لئے قدم اُٹھایا۔

لڑکی نے کہا "بس!"

ارسطو رُک گیا۔ کچھ دیر سوچتا رہا۔ اِس کے بعد اُس نے مصنوعی انداز سے ہنس کر کہا:۔ "معلوم ہوتا ہے، تم نری بیوقوف ہو۔ لیکن خیر! تمہاری خاطر مجھے یہ تذلیل بھی منظور ہے"۔

یہ کہہ کر وہ صبح کی سرد گھاس پر گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ لڑکی نے ایک رسہ لاکر اُس کے مُنہ میں دیدیا۔ اور کُود کر اُس کی پیٹھ پر سوار ہو کر بولی:۔ "میرا محبوب گھوڑا کتنا اچھا ہے!

اور یہ اس حکیم کا حال تھا، جو یُونان کے دانشمندوں کی محفلوں میں حکمت و دانائی کے موضوع پر تقریریں کیا کرتا تھا۔ جو کہتا تھا۔ محبت ایک بیماری ہے، جو حُسن کو دُنیا کی سب سے ناپائیدار شے کہہ کر اُس کی تحقیر کیا کرتا تھا۔ اور محبت کے مریضوں پر ہنستا تھا:۔

یکایک کسی کے قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ اور سکندر اعظم آکر اُن کے سامنے کھڑا ہو گیا اور بولا:۔ "محبت ایک بیماری ہے، جس سے داناؤں کو احتراز کرنا چاہیئے۔ عام آدمی یہ غلطی کریں تو حرج نہیں۔ لیکن بادشاہوں اور حکیموں کے لئے عورت کا حُسن زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر ہے"۔

ارسطو نے اپنا حسین بوجھ اپنی پیٹھ سے اُتار دیا۔ اور مُنہ سے لگام نکال کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے لڑکی کی طرف دیکھا لیکن اُس کی آنکھیں بادشاہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اُس نے بادشاہ کی طرف دیکھا۔ بادشاہ اپنی ہنسی کو کھانسی کے پردہ میں چھپانے کی سعی کر رہا تھا:۔

ارسطو نے دونوں کی طرف سے مُنہ موڑ لیا اور چُپ چاپ کھڑا ہو کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے اُسے اِن دونوں کی پروا نہ تھی۔ اس وقت اُسے خیال آیا، کہ ایران کے اُس وقت ہیں، اور یونان کے اِس وقت میں کس قدر فرق ہے؛ اُس وقت محبت اس کے پاؤں تلے بچھتی تھی اور وہ اس کی پروا نہ کرتا تھا۔ آج اُس نے محبت کے پاؤں تلے اپنا آپ بچھایا اور محبت نے اس کی پروا نہ کی۔ آخر اُس نے بادشاہ کو مخاطب کیا اور کہا:۔

”اے میرے بچے! تُو مجھ پر ہنس رہا ہے لیکن اگر تو دانشمند ہوتا۔ تو یہ منظر دیکھ کر تیری رگوں کا خُون سرد ہو جاتا۔ اور تیری قوت گفتار سلب ہو جاتی۔ کاش تجھے یہ خیال آتا کہ اگر محبت میرے جیسے بُوڑھے، ٹھنڈے اور حکیم کو اس حال کو پہنچا سکتی ہے تو تُو ہی سوچ۔ وہ تجھے کیا کچھ نہ بنائے گی! وہ ہمیں عذاب دیتی ہے۔ وہ ہمیں ستاتی ہے۔ وہ ہمیں ذلیل کرتی ہے۔ اور ہم اِس قدر کم عقل، ایسے بیوقوف اور جاہل ہیں کہ جب وہ آتی ہے، تو اس کا خیر مقدم کرنے کو گھر سے باہر نکل آتے ہیں“

یہ کہتے کہتے بُوڑھے ارسطو نے اپنا سر بلند کیا اور پھولوں کی کیاریوں کے درمیان سے گزرتا ہُوا اپنے مطالعہ کے کمرہ کو چلا گیا۔ سکندر اور وہ لڑکی دونوں چُپ چاپ کھڑے تھے اور سوچتے تھے۔ یہ شخص کتنا بلند کتنا صادق، کتنا پاکیزہ ہے اور ہم اس کے مقابلہ میں کس قدر جھوٹے، کتنے غلط کار ہیں!

Cares Kania

(۱)

راپسن کالج کے انگریزی کے پروفیسر رُوحی صاحب کو غیر معروف اور مُشکل الفاظ استعمال کرنے کا شوق تھا۔ شائد ان کا خیال تھا۔ کہ اظہار قابلیت کا اور کوئی ذریعہ ہی نہیں ہے۔ آسان لفظ ہر کوئی جانتا ہے۔ یہ بھی کوئی بہادری ہے، کہ مڈل سکول کی ریڈروں کے الفاظ میں اپنا مفہوم ادا کیا جائے۔ مزہ جب ہے۔ کہ ہم بولیں۔ اور لوگ مُنہ تکتے رہ جائیں۔ انہیں بھی معلوم ہو۔ کہ کسی سے بات چیت کی تھی آسان زبان "قابلیت کا معیار ہے"۔ یہ خیال ان کے نزدیک لغو ولایعنی تھا۔ گھر جا کر لُغات کی کتابیں دیکھا کرتے۔ اور جو مُشکل لفظ پاتے۔ پاکٹ بُک پر "چڑھا" لیتے۔ اور جناب جب تک اس لفظ کو استعمال نہ کر لیتے۔ تب تک چین نہ آتا۔ اُن کا کوئی لیکچر ایسا نہ ہوتا تھا۔ جس میں دو تین لفظ نئے نہ ہوں۔ اور نئے بھی ایسے جنہیں کسی نے بھی نہ سُنا ہو۔ ساری جماعت مُنہ تکتی تھی۔ اور رُوحی صاحب مُسکراتے تھے۔ گویا زبان حال سے کہتے تھے۔ اور بھی کئی

لفظ ہیں۔ کوئی ایسا ویسا سمجھا ہے تُم نے ہمیں۔ ایک مرتبہ انہوں نے فخریہ طور پر کہا تھا۔ کالج میں جتنے لفظ مجھے یاد ہیں۔ اتنے اور کسی کو یاد نہیں۔ کالج کے دوسرے پروفیسران کی اس بیہودگی پر ہنستے تھے۔ لیکن انہیں کیا۔ وہ سمجھتے تھے یہ سب نالائق اور حاسد ہیں۔ ان کے پاس لفظوں کا ذخیرہ ہی نہیں ہے۔ چند لفظ ہیں۔ انہیں کے ہیر پھیر سے کام چلا لیتے ہیں۔ مَیں ہر موقع پر نیا لفظ استعمال کرتا ہوں۔ یہ جلتے ہیں۔ اور طُلبا کو دھوکا دیتے ہیں۔ کہ آسان الفاظ استعمال کرو، فصاحت کا یہی معیار ہے۔ یہ نہ کہیں۔ تو لڑکوں کی نگاہوں میں ذلیل ہو جائیں۔ کوئی ان کی قدر ہی نہ کرے +

آخر ایک دن گنڈا سنگھ، سُندر لال اور محمود نے مل کر فیصلہ کیا۔ کہ پروفیسر کو سبق دیا جائے۔ فورتھ ایر میں پڑھتے ہیں۔ یہ سال نکل گیا۔ تو دل میں ارمان رہ جائیگا +

محمود بولا "سبق تو مَیں ایسا دُونگا۔ کہ جناب ساری عُمر نہ بھُولیں۔ مگر تم کو میرے ساتھ رہنا ہوگا۔ یہ سوچ لو۔ کہیں ایسا نہ ہو۔ معاملہ پرنسپل صاحب تک پہنچ جائے۔ اور یار لوگ کالج سے نکال دیئے جائیں" +

گنڈا سنگھ "مگر پرنسپل صاحب تک معاملہ پہنچے ہی کیوں؟"

محمود نے سگرٹ سلگا کر کش لگایا۔ اور کہا "سُنو بھائی۔ اگر تم ساتھ رہوگے۔ تو نہ پہنچے گا۔ اگر ساتھ چھوڑ دوگے۔ تو پہنچ جائیگا" +

سُندر لال نے اپنی نکٹائی کی گرہ کو کستے ہوئے گنڈا سنگھ کی طرف دیکھا اور بولا "کیوں خالصہ جی! بے وفائی تو نہ کروگے۔ مجھ پر تو شبہ ہو ہی نہیں

سکتا۔ تمہیں پر ہوگا۔ بکو!"

گنڈا سنگھ۔ (اپنی دستار پر ہاتھ پھیر کر) "ہم خالصے ہیں۔ خالصہ لوگ بیوفائی نہیں کر سکتے"۔

محمود۔ "تو پھر شروع کر دوں۔ آج ہی سے"۔

گنڈا سنگھ۔ "کچھ خرچ تو نہ ہوگا؟"

سُندر لال۔ "یہ بھی طے کر لو۔ بعد میں کہوگے۔ اب پیچھے قدم ہٹا رہے ہو۔ ایک ایک روپے میں کام بن جائیگا"۔

محمود۔ "ایک ایک روپیہ میں تو جناب کسی چپراسی کا بھی مذاق نہیں اُڑایا جا سکتا۔ یہ تو پروفیسر رُوحی ہیں۔ سب سے لائق پروفیسر جن کے مقابلہ میں دُوسرے تمام پروفیسر ہیچ ہیں"۔

گنڈا سنگھ۔ (مُسکرا کر) "دو دو سہی۔ اب تو ٹھیک ہے بس بس اب نہ بولنا۔ اس سے زیادہ بجٹ کی گنجائش نہیں"۔

محمود۔ "خیر یہ بعد میں دیکھا جائیگا۔ جو خرچ ہوگا۔ حصہ رسدی دیدینا۔ میں اپنی محنت کا پیسہ لے جاؤں۔ تو کان پکڑ لینا"۔

سُندر لال۔ "لیکن یار مزہ آجائے! یہ بھی کیا یاد کرے گا؟"

محمود۔ "ذرا موقعہ ہاتھ آنے دو۔ توبہ نہ کرے، تو محمود نام نہیں۔ ساری عمر مُشکل لفظ استعمال نہ کرے گا"۔

(۲)

اور یہ موقعہ دُوسرے ہی دن مل گیا۔ پروفیسر رُوحی کا گھنٹہ تھا۔

وہ لیکچر دے رہے تھے۔ اور محمود چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے اُسے سبق سے واسطہ ہی نہ ہو۔ پروفیسر رُوحی نے للکار کر کہا "محمود!

تمام لڑکے چوکنّے ہو گئے۔

محمود نے چھت پر سے نگاہیں ہٹالیں، اور بیٹھے بیٹھے پروفیسر صاحب کی طرف دیکھ کر جواب دیا "یس سر!"

رُوحی "تم چھت کی طرف کیا دیکھ رہے تھے؟"

محمود "میں لیکچر سُن رہا تھا"۔

رُوحی "میرا خیال ہے۔ تم جھوٹ بول رہے ہو"۔

محمود۔ (اُسی طرح بیٹھے بیٹھے) "اور میرا خیال ہے۔ مَیں سچ کہہ رہا ہوں"۔

رُوحی "اچھّا تو بتاؤ۔ مَیں کیا کہہ رہا تھا۔ بولو!"

محمود "آپ کہہ رہے ہے۔ کہ جب شہزادہ ڈنمارک نے اپنے باپ کی رُوح کو دیکھا تو......

رُوحی "تو کیا"؟

محمود "میرا خیال ذرا باہر کی طرف چلا گیا تھا"۔

رُوحی۔ (پُر معنی انداز سے) "ٹھیک!"

محمود "مَیں معافی چاہتا ہوں"۔

رُوحی "تم نہایت CARE LESS ہو۔ دیکھ لینا۔ اب کے تم کبھی پاس نہ ہوگے۔ خدا جانے تمہارے خیالات کہاں رہتے ہیں؟"

محمود۔ صاحب! یہ تو مجھ پر بہتان ہے۔ آپ مجھے CARE LESS

کہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں، میں CARE SKANIA کہانے کا حق دار ہوں۔

پروفیسر رُوحی یہ نیا لفظ سُن کر چونک پڑے۔ بولے۔ تُم کیا ہو یہ لفظ تم نے کیا بولا؟

محمود۔ میں نے عرض کیا۔ میں CARE SKANIA کہانے کا حق دار ہوں"۔

رُوحی۔ اِس لفظ کے کیا معنی ہیں؟"

محمود۔ وہ شخص، جو ضرورت سے زیادہ محتاط ہو"۔

لڑکے اپنے اپنے مُنہ کے سامنے کتاب لے کر مُسکرانے لگے۔ پروفیسر رُوحی نے اپنے ہاتھ کی کتاب میز پر رکھ دی اور کہا" CARE SKANIA کوئی لفظ نہیں ہے"۔

محمود۔ آپ کو معلوم نہ ہو۔ تو کوئی کیا کرے۔ میں نے ڈکشنری میں دیکھا ہے"۔

پروفیسر رُوحی کچھ دیر یاد کرتے رہے۔ پھر بولے "میں نے یہ لفظ آج تک نہیں سُنا"۔

محمود کو قدرے جراٗت ہوئی۔ اس نے کہا "میں کل ڈیلی ہیرلڈ کا ایک پرچہ پڑھ رہا تھا۔ اُس میں یہ لفظ آیا۔ ڈکشنری دیکھی۔ تو یہ معنی معلوم ہوئے ورنہ یہ لفظ کل تک مجھے بھی معلوم نہ تھا"۔

پروفیسر صاحب نے ہجے نوٹ بُک میں لکھ لئے اور پھر پوچھا۔ کونسی

ڈکشنری تھی وہ؟"
محمود۔ (ہچکچاتے ہوئے) "فلاں صاحب کی ڈکشنری۔ تین چار روپے اُس کی قیمت ہے"۔
تھوڑی دیر بعد خالی گھنٹہ آیا۔ تو تینوں دوست اکٹھے ہو گئے اور باتیں کرنے لگے۔
گنڈا سنگھ:۔ یہ تم نے کیر سکا نیا خُوب نیا لفظ بتایا۔
محمود نے اُنگلی سے سگرٹ کی راکھ گرا کر کہا:۔ اور کیا۔ یہ سمجھتا تھا۔ نئے لفظ میں ہی جانتا ہوں۔ مُنہ توڑ دیا"۔
سُندر لال:۔ لکھ کر لے گیا ہے۔ جا کر ڈکشنری دیکھے گا۔ پھر استعمال کرے گا"
محمود:۔ چلو، ہم بھی کہہ سکیں گے۔ کہ ہم نے ایک نیا لفظ پروفیسر صاحب کو سکھا دیا۔ ساری عُمر ٹکریں مارتا پھرتا۔ یہ لفظ نہ ملتا۔ ایجادِ بندہ ہے"۔
سُندر لال:۔ ارے! تو کیا تم نے ایسا لفظ بتا دیا۔ جو ہے ہی نہیں۔ کل ہی آ کر تمہیں پکڑ لیگا۔ کیا جواب دو گے؟
محمود:۔ تمہیں کیا فکر ہے۔ مَیں جواب دے لُونگا۔ تُم چُپ چاپ تماشہ دیکھتے چلو"۔
گنڈا سنگھ:۔ کہیں پھنس نہ جانا"۔
محمود:۔ پھنسنے والے دن بندہ پیدا نہیں ہُوا۔ اس طرح نکل جاؤں گا۔ جیسے مکھن سے بال۔ مگر جماعت کے لڑکے ہمارے ساتھ ہیں نا۔ وہ خلاف ہو گئے۔ تو سارا گڑ گوبر ہو جائیگا۔ کیوں خالصہ جی!"
گنڈا سنگھ:۔ یہ مجھ پر چھوڑ دو۔ مَیں سب انتظام کر لوں گا"۔

(۳)

دُوسرے دن پروفیسر رُوحی نے جماعت میں آتے ہی کہا "محمود! وہ فالن ڈکشنری کہاں ہے۔ ذرا مجھے بھی تو دکھاؤ۔ میرے پاس جو ڈکشنری ہے۔ اس میں وہ لفظ نہیں ملا"۔

محمود "مگر جناب ڈکشنری تو میرا بھانجہ گجرات لے گیا۔ مجھے معلوم ہوتا۔ آپ کو ضرورت پڑے گی۔ تو نہ دیتا"۔

رُوحی "کسی اَور کے پاس وہ ڈکشنری ہے"؟

سب نے انکار کیا۔ پروفیسر رُوحی نے کہا "تمہارا بھانجہ کب تک لَوٹ آئیگا"؟

محمود "اب صاحب! کیا عرض کروں۔ ایک ہفتہ سے پہلے کیا لَوٹے گا؟ ممکن ہے۔ دو چار دن اَور لگ جائیں بہرحال پندرہ دن کے اندر اندر ضرور آجائیگا"۔

رُوحی "میں تمہاری یہ باتیں خُوب سمجھتا ہوں۔ کیر سکانیا کوئی لفظ نہیں ہے۔ ایک جھُوٹ بول چکے ہو۔ اب اُسے چھپانے کے لئے اور جھُوٹ بول رہے ہو۔ صاف کیوں نہیں کہہ دیتے۔ کہ وہ لفظ تمہارا اپنا ایجاد کردہ ہے"۔

محمود "یہ تو اُسی وقت معلوم ہو۔ جب وہ لَوٹ آئے اِس سے پہلے آپ کو یقین نہ آئیگا"۔

پندرہ دن کے بعد پھر پروفیسر رُوحی نے پُوچھا "کیوں بھائی وہ تمہارا

بھانجہ گجرات سے آیا یا نہیں؟"

محمود نے فوراً جواب دیا "آگیا جناب!"

رُوحی "تو تم وہ ڈکشنری ضرور لائے ہو گے۔ دکھاؤ"

محمود "جی جناب لایا تو تھا۔ لیکن اب دیکھتا ہوں۔ تو وہ کتابوں میں نہیں ہے۔ خدا جانے کہاں گر گئی (تھوڑی دیر کے بعد) ممکن ہے۔ اسلم کے کمرہ میں رہ گئی ہو"

رُوحی "اسلم بورڈنگ ہوس ہی میں رہتا ہے۔ جا کر لے آؤ۔ کون میلوں کا فاصلہ ہے۔ بھاگ کر جاؤ"

محمود گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد لوٹ آیا۔ پروفیسر رُوحی بلیک بورڈ پر کچھ لکھ رہے تھے۔ انہوں نے مُڑ کر اُس کی طرف دیکھا اور فاتحانہ انداز سے مُسکرا کر پُوچھا "کیوں! ملی؟"

محمود "کمرہ بند ہے" سب لڑکے ہنسنے لگے۔

پروفیسر صاحب کو زہر چڑھ گیا۔ یہ کل کا لونڈا مجھے بنا رہا ہے۔ جُھنجلا کر بولے "تالہ توڑ دو!"

محمود بھی تیار تھا۔ اس نے تڑ سے جواب دیا "تالے کے پیسے کون دیگا؟ آپ!"

رُوحی۔ (پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر) "ہاں ہم دینگے لیکن ڈکشنری وہاں بھی نہ ملے گی"

محمود "ملے گی کیوں نہ۔ اُسی کے میز پر رہ گئی ہے۔ تو جاؤں۔ تالہ توڑ دوں؟"

رُوحی :- "ہاں تالے کی قیمت مَیں دُوں گا" ۔
محمود لپکا لپکا پھر باہر نکل گیا ۔ پروفیسر صاحب نے طلبا سے مخاطب ہو کر کہا :- "صاف جھُوٹ بول رہا ہے ۔ مَیں دعوے سے کہہ سکتا ہوں ۔ کیرسکانیا کوئی لفظ نہیں ہے" ۔
ایک لڑکے نے کہا :- "جناب ممکن ہے ۔ ہو ۔ آپ نے ڈکشنری دیکھی ؟"
رُوحی :- "میرے پاس بڑی ڈکشنری ہے ۔ اس میں یہ لفظ نہیں ہے ۔ اُس کے مقابلہ میں فالن بہت چھوٹی ڈکشنری ہے ۔ اس میں کیسے ہو سکتا ہے ؟ بالکل جھُوٹ بولتا ہے" ۔
ایک اَور لڑکا :- "تالہ بھی توڑنا پڑا" ۔
رُوحی :- "مذاق کرتا ہو گا" ۔
گنڈا سنگھ :- "یہ ناممکن ہے ۔ وہ ہم سے مذاق کر سکتا ہے ۔ پروفیسر صاحب سے مذاق نہیں کر سکتا ۔ کیا اتنا بھی نہیں جانتا ۔ کہ یہ مذاق بہت گراں پڑے گا ۔ شرارتی ہے ، بیوقوف نہیں ہے" ۔
سُندر لال :- "مجھ سے بھی کہتا تھا ۔ یہ لفظ مَیں نے دیکھا ہے ۔ اگر شرارت ہوتی ۔ تو مجھ سے کبھی نہ چھُپاتا" ۔
رُوحی ۔ (سنجیدگی سے) "ابھی معلوم ہو جاتا ہے (تھوڑی دیر بعد) دیکھ لینا خالی ہاتھ لوٹے گا ...... کیرسکانیا کوئی لفظ نہیں ہے" ۔
لڑکے مُسکرا رہے تھے ۔ پروفیسر رُوحی بیتابی سے اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے ۔ اور بار بار دروازے کی طرف دیکھتے تھے ۔ یکایک محمود ایک

ہاتھ میں ڈکشنری اور دُوسرے ہاتھ میں ٹوٹا ہُوا تالہ لئے کمرے میں داخل ہُوا اور بولا "لیجئے، مِل گئی ——— وہیں تھی"۔

یہ کہہ کر اس نے ڈکشنری پروفیسر صاحب کے ہاتھ میں دیدی۔ تالہ میز پر رکھ دیا۔ اور لڑکوں کی طرف مُنہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ گویا زبان حال سے کہتا تھا "کیوں سمجھ آیا یا نہیں؟ تم اب تک سمجھتے تھے۔ جھوٹ بولتا ہے"۔

پروفیسر رُوحی ڈکشنری کے اوراق اُلٹ رہے تھے۔ لڑکے ٹکٹکی لگا کر اُن کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اور محمود بے پروائی سے چھت کے شہتیر گن رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بولا "کیوں جناب مِل گیا یا میں ڈھونڈ دوں؟"

رُوحی۔ (کتاب پر نظریں جمائے ہوئے) "بھئی! مِل تو گیا۔ معنی بھی وہی لکھے ہیں"۔

محمود "آپ کہتے تھے، جھوٹ بولتا ہوں"۔

رُوحی (قدرے ندامت سے) تعجب ہے۔ میری ڈکشنری میں کیوں نہیں ہے؟"

محمود "کوئی پُرانا ایڈیشن ہوگا"۔

رُوحی "ممکن ہے، یہی وجہ ہو"۔

یہ کہہ کر انہوں نے ڈکشنری محمود کو لوٹا دی۔ اور ٹوٹے ہوئے تالے کی طرف دیکھ کر بولے "اس کی قیمت کیا ہوگی؟"

محمود نے تالہ اُٹھا لیا۔ اور بولا "ڈیڑھ روپیہ۔ جس دن اسلم نے اِسے خریدا ہے۔ اُس دن میں بھی اُس کے ساتھ تھا۔ بڑا مضبوط تو ہا

ہے۔ ڈھونڈتا ہی نہ تھا"۔

پروفیسر صاحب نے ڈیڑھ روپیہ دیدیا۔ محمود بولا "یہ آپ کو مُفت میں جُرمانہ ہُوا۔ اگر آپ جلدی نہ کرتے۔ تو اسلم دس پندرہ منٹ میں ضرور آجاتا۔ سائیکل پر گیا تھا"۔

رُوحی "تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ میں ایک نئے لفظ کی قیمت اس سے بھی زیادہ سمجھتا ہوں"۔

اتنے میں گھنٹی بج گئی۔ اور سارے لڑکے باہر نکل آئے۔ اب ہر ایک لڑکا محمود پر گرا پڑتا تھا۔ ہر ایک کہتا تھا۔ تم نے کمال کر دیا۔ ہم سمجھتے تھے۔ یہ بھی تمہاری شرارت ہو گی۔ محمود کچھ دیر تک چُپ چاپ اپنے دوستوں کی باتیں سُنتا رہا۔ اس کے بعد چاروں طرف دیکھ کر بولا "اگر تم نے ہمیں درحقیقت شریف آدمی سمجھ لیا ہے۔ تو یہ تمہاری پرلے درجے کی حماقت ہے۔ ہم اس وقت بقائمی ہوش وحواس سب کے سامنے اعلان کرتے ہیں۔ کہ آج کا واقعہ بھی ہمارے شرارت نامہ کا ایک باب ہے۔ لیکن یہ باب تمہاری امداد کے بغیر مکمل نہ ہو گا۔ کہو! تم لوگ اس کارِ خیر میں شریک ہو کر ثوابِ دارین حاصل کرو گے یا دُور کھڑے تماشہ دیکھو گے؟"

سب لڑکے یک زبان ہو کر بولے "ہم سب تمہارے ساتھ ہیں"۔

محمود "اگر تم سے کوئی پُوچھے۔ کہ میں نے کوئی ڈکشنری دکھائی تھی۔ اور اس میں پروفیسر رُوحی کو کیرسکانیا لفظ ملا تھا۔ تو تم صاف انکار کر دینا۔ کہنا ہمیں اس واقعہ کا ذرا بھی علم نہیں۔ بس تم یہی سمجھ لو۔ کہ آج کوئی

واقعہ ہُوا ہی نہیں۔ مَیں تُم سے یہی امداد چاہتا ہوں۔ بولو! کرو گے؟"
سب لڑکوں نے کہا "ہم تیار ہیں" محمود مطمئن ہو کر سگرٹ پینے لگا۔

(۴)

اب پروفیسر رُوحی کو قرار نہ تھا۔ اِس نئے لفظ کو استعمال کرنے کا موقعہ تلاش کرنے لگے۔ اِس کے لئے وہ کئی دن پریشان رہے ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے ڈیڑھ روپیہ دیا ہے۔ جب تک اِس لفظ کو استعمال نہ کرلیں گے۔ انہیں چین نہ آئیگا۔

خوش قسمتی یا بدقسمتی سے یہ موقعہ ان کو جلدی ہی مل گیا۔ کالج کا سالانہ ڈنر ہونے والا تھا۔ اِس تقریب پر طلباء نے ایک ناٹک کرنے کا فیصلہ کیا۔ پروفیسر رُوحی اس کے منتظم تھے۔ ہر روز ایک گھنٹہ ریہرسل ہوتا تھا۔ ایک دن پرنسپل واکر نے انہیں بُلا کر انگریزی میں پُوچھا "آپ کے ڈرامہ کا کیا حال ہے۔ سب لڑکوں کو اپنا اپنا پارٹ حفظ ہو گیا یا نہیں؟"

رُوحی "کر رہے ہیں۔ اُمید ہے۔ آپ کو شکایت کا موقعہ نہ ملے گا"۔

پرنسپل "فیروز چند نے اپنا پارٹ یاد کیا یا نہیں۔ اس کا خیال رکھئے گا۔ وہ بڑا CARE LESS ہے"۔

رُوحی صاحب کو موقعہ مل گیا۔ جھٹ بولے "نہیں صاحب! میرے خیال میں وہ کیر سکا نیا ہے"۔

پرنسپل صاحب نے چونک کر سر اُٹھایا اور متعجب ہو کر پُوچھا۔ "یہ آپنے کیا فرمایا ہے۔ وہ کیا ہے؟"

رُوچی صاحب نے پھر دوہرا کر کہا "کیر سکانیا"۔

پرنسپل:۔ "یہ لفظ میں نے آج تک نہیں سُنا۔ اس کے کیا معنی ہیں؟"

رُوچی:۔ "حد سے زیادہ محتاط"۔

پرنسپل:۔ "آپ نے کسی کتاب میں پڑھا ہے؟"

رُوچی:۔ "جی نہیں۔ مَیں نے ڈکشنری میں دیکھا ہے"۔

پرنسپل:۔ "تعجّب ہے۔ یہ لفظ میں نے آجتک نہیں سُنا کس ڈکشنری میں ہے؟"

رُوچی:۔ "فالن صاحب کی ڈکشنری میں"۔

پرنسپل:۔ "اگر آپ کو تکلیف نہ ہو۔ تو وہ ڈکشنری مجھے دکھائیے گا۔ مَیں آپ کا شکر گزار ہوں گا...... میرے لئے یہ لفظ بالکل نیا ہے"۔

رُوچی:۔ "مَیں کل وہ ڈکشنری لیتا آؤں گا"۔

تھوڑی دیر بعد انہوں نے اِس واقعہ کا ذکر پروفیسر مکرجی سے کیا۔ اور کہا۔ "تعجب ہے۔ ایک انگریز مَیں ہے۔ مَیں نے یہ لفظ کبھی نہیں سُنا۔ آپ نے تو سُنا ہوگا۔ بڑا جامع لفظ ہے"۔

مُکرجی:۔ "مجھے افسوس ہے۔ یہ لفظ مَیں نے کبھی نہ سُنا ہے نہ پڑھا ہے۔ لیکن آپ ایسے غیر معروف الفاظ کا استعمال کیوں کرتے ہیں۔ آجکل زبان وہ عُمدہ سمجھی جاتی ہے جس میں ایک بھی لفظ مشکل نہ آئے"۔

رُوچی:۔ "اس معاملہ میں ہماری تمہاری ایک رائے کبھی نہیں ہو سکتی مَیں آسان زبان کا حامی نہیں ہوں۔ آخر فصاحت و بلاغت بھی کوئی شے ہے یا نہیں؟"

مُکرجی "بہت اچھا! (مُسکرا کر) ہم ایسی فصاحت کے حق میں نہیں۔ جو مشکل الفاظ کے بغیر نہ رہ سکے"۔

رُوحی "اب کل پرنسپل صاحب کو ڈکشنری دکھاؤں گا"۔

مُکرجی "اور کالج کی ڈکشنری کیا ہوئی؟"

رُوحی "اس میں یہ لفظ نہیں ہے۔ مَیں دیکھ چکا"۔

مُکرجی "ارے میرے یار! اب تم ایسے الفاظ استعمال کرنے لگے۔ جو ڈکشنریوں میں بھی نہیں۔ پہلے تمہارے الفاظ نہ ملتے تھے۔ اب تمہاری ڈکشنریاں بھی نہ ملیں گی"۔

رُوحی صاحب مُسکرا کر بولے "تمہارے جیسے نالائقوں کا یہی علاج ہے۔ کہاں تک چلو گے!"

پروفیسر رُوحی نے آفس میں جاکر محمود کو بُلا بھیجا۔ اور کہا "وہ اپنی ڈکشنری تو کل لیتے آنا۔ مجھے ذرا ضرورت ہے"۔

محمود نے چونک کر جواب دیا "وہ ڈکشنری تو میری پھوپھی کا بیٹا لے گیا"۔

رُوحی "کہاں گیا ہے۔ کب تک لوٹے گا؟"

محمود "افریقہ گیا ہے۔ چار سال میں لوٹے گا"۔

رُوحی "یہ تم نے بُری سُنائی (یکایک اُچھل کر) اور وہ ڈیلی ہیرلڈ کا پرچہ تو تمہارے پاس ہوگا۔ جس میں کیرسکانیا کا لفظ تم نے دیکھا تھا۔ وہی لے آؤ"۔

محمود۔ (ہاتھ مل کر) "افسوس! اُس اخبار کے بچوں نے پتنگ بنا لئے"۔

اور پھاڑ پھونک کے پھینک دیئے گئی ہیں "

روحی "تو بھئی! جیسے بھی ہو۔ وہ ڈکشنری کہیں سے پیدا کرو۔ پرنسپل صاحب دیکھنا چاہتے ہیں "

محمود "بہت اچھا جناب! میں بھی کوشش کروں گا۔ آپ بھی کوشش کریں "

محمود نے تو کیا کوشش کی ہو گی۔ لیکن پروفیسر صاحب نے چھٹی کے بعد کوشش کی۔ ان کے پڑوس میں ایک لڑکا انٹرنس میں پڑھتا تھا۔ اُس کے پاس یہ ڈکشنری تھی۔ پروفیسر صاحب نے سمجھا۔ چلو روگ کٹا۔ لیکن جب ڈکشنری آگئی۔ تو اس میں کیرسکانیا لفظ نہ تھا۔ باقی سب کچھ وہی تھا۔ صرف یہ ایک لفظ نہ تھا۔ پروفیسر صاحب سناٹے میں آگئے۔ حیران ہو کر سوچنے لگے۔ یہ کیا۔ اُس میں یہ لفظ برابر موجود تھا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یہی ڈکشنری تھی۔ یہی ایڈیشن تھا خدا جانے یہ کیا طلسم ہے؟ کالج میں جا کر محمود اور جماعت کے دوسرے لڑکوں سے ذکر کیا۔ تو سب نے کانوں پر ہاتھ رکھا۔ کہ صاحب ہمیں تو کوئی علم نہیں۔ نہ ہم نے یہ لفظ سُنا نہ پڑھا۔ پروفیسر صاحب آگ بگولا ہو گئے۔ اگر سکول ہوتا۔ تو ایک ایک کو پکڑ کر اُس کی کھال اُدھیڑ دیتے۔ لیکن یہ کالج تھا۔ کالج کے لڑکے دھونس میں سہنے ہار کر خاموش ہو رہے۔ اور کر ہی کیا سکتے تھے۔ سارا دن پرنسپل صاحب کے سامنے نہ گئے۔ ڈرتے تھے کہ میں ان کے سامنے گیا۔ اور انہوں نے پُوچھا۔ کہ وہ ڈکشنری لائے تو کیا جواب دُونگا۔ مُنہ نہ کُھلے گا۔

آنکھیں نہ اُٹھیں گی۔ زمین میں گڑ جاؤں گا۔

(۵)

دوپہر کے وقت آفس میں بیٹھے تھے۔ کہ پروفیسر گیلانی نے آ کر پوچھا۔
"کیوں رُوحی صاحب یہ کیرسکا نیا کیا بلا ہے؟ ہم نے تو یہ لفظ کبھی نہیں سُنا!"
رُوحی صاحب کی رُوح فنا ہو گئی۔ بولے "یہ آپ سے کس نے کہا ہے؟"
گیلانی "کئی لڑکے آ کر پُوچھتے تھے۔ کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ مَیں نے پُوچھا۔ تم نے یہ لفظ کس سے سُنا ہے تو انہوں نے آپ کا نام لیا۔ میرے خیال میں انگریزی زبان میں یہ لفظ ہے ہی نہیں۔ آپ نے کہاں دیکھا ہے؟"
رُوحی صاحب نے جواب نہ دیا۔ میز پر پڑے ہوئے کاغذ پہ پنسل سے لکیریں کھینچنے لگے۔

اتنے میں دُوسرا پروفیسر آ کر بولا "ارے یار رُوحی! یہ کیرسکا نیا لفظ کے کیا معنی ہیں؟"
رُوحی صاحب نے اس کی طرف دیکھ کر رُوکھائی سے جواب دیا "مَیں نہیں جانتا۔"
پروفیسر "عجیب معاملہ ہے۔ تُم ہی ایک لفظ بتاتے ہو۔ تُم ہی کہتے ہو مَیں نہیں جانتا۔"
رُوحی۔ (غصّہ سے) کون کہتا ہے۔ یہ لفظ مَیں نے بتایا ہے"۔
پروفیسر "فورتھ ایر کے لڑکے کہتے ہیں"۔
رُوحی صاحب کی آنکھوں سے آگ کے شرارے نکلنے لگے۔ بولے۔

"سب بدمعاش ہیں۔ مجھے تنگ کرتے ہیں"۔

پروفیسر نے بات کو طوالت نہ دی۔

تین بجے کے قریب رُوحی صاحب گھر جانے لگے۔ تو بدقسمتی سے پرنسپل صاحب سامنے آگئے۔ اب رُوحی صاحب کی حالت دیکھنے کے قابل تھی چہرہ کا رنگ سُرخ تھا۔ آنکھیں اُوپر نہ اُٹھتی تھیں۔ مقروض قرضخواہ سے بچ بچ کر جا رہا تھا۔ یکایک قرضخواہ سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اب مقروض کیا کر سکتا تھا؟ ان کا سارا جسم کانپتا تھا۔ سوچتے تھے۔ زمین پھٹے تو اس میں سما جاؤں۔ اگر پرنسپل صاحب پُوچھ بیٹھے۔ تو کیا جواب دُوں گا۔ لیکن پرنسپل صاحب نے کچھ بھی نہ پُوچھا۔ اور اپنے کمرہ میں چلے گئے۔ رُوحی صاحب نے اطمینان کا سانس لیا!

اتنے میں فرسٹ ایر کے ایک لڑکے نے ادب سے سلام کیا اور پُوچھا۔

"پروفیسر صاحب! کیرسکانیا کے کیا معنیٰ ہیں؟"

رُوحی صاحب سے اب برداشت نہ ہو سکا۔ گرج کر بولے "تمہارا سر!"

لڑکا سہم گیا۔ اُسے محمود اور گنڈا سنگھ نے بھیجا تھا۔ غریب کو کیا معلوم یہ شرارت ہے۔ چُپ چاپ سر جُھکا کر چلا گیا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

پروفیسر صاحب گھر پہنچے۔ تو نوکر نے ایک چِٹھی دی کھول کر دیکھا۔ تو اس میں لکھا تھا "مائی ڈیر کیرسکانیا!" رُوحی صاحب نے اور کچھ نہ پڑھا۔ چِٹھی کو پُرزہ پُرزہ کر کے پھینک دیا۔ اور جا کر کمرہ میں بیٹھ گئے۔

اب لڑکوں کو ایک مشغلہ ہاتھ لگ گیا۔ جونہی انہیں دیکھتے ۔ پکار کر کہہ دیتے ۔ پروفیسر کیر سکانیا جا رہا ہے ۔ پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور ہنستے ۔ کبھی آپس میں ایک دوسرے سے کہتے ۔ جو زیادہ بکوگے تو کیر سکانیا بنا دیں گے ۔ اس کے ساتھ ہی قہقہے پر قہقہہ بلند ہوتا اور پروفیسر صاحب جل بھن کر رہ جاتے ۔ کالج کی کوئی دیوار اور بورڈنگ کا کوئی کمرہ ایسا نہ تھا ۔ جہاں جلی حروف میں کیر سکانیا صاحب تشریف فرما نہ ہوں ۔ یہاں تک کہ ظالموں نے ٹٹی کے باہر بھی یہی لفظ لکھ دیا ۔ چند ہی دنوں یہ کہانی دوسرے کالجوں میں بھی مشہور ہو گئی ۔ ایک دن کسی نے فون پر بلا کر کہا ۔ میں نے آپ کو نہیں بلایا پروفیسر کیر سکانیا کو بلایا ہے ۔ گر ہوں ۔ تو ذرا فون پر بھیج دیں ایک دن سنیما دیکھنے گئے ۔ تو کسی نے چلا کر کہا ۔ تھری چیرز فار پروفیسر کیر سکانیا ! پروفیسر صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ جدھر جاتے کیر سکانیا کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا ۔ اپنے اوپر جھلاتے تھے ۔ کیسی حماقت ہو گئی ۔ کسی سے ملتے جلتے بھی نہ تھے ۔ ممکن ہے ۔ اظہار ہمدردی کے طور پر یہی قصہ چھیڑ دیں ۔ اور ان کو جھینپنا پڑے ۔ جیسا دوبھر ہو گیا ۔ ہر وقت سہمے سہمے رہتے تھے ۔ وہ زندہ دلی ، وہ شگفتگی ، وہ ہنسنا کھیلنا جانے کہاں چلا گیا ! ایسا معلوم ہوتا تھا ۔ جیسے یہ شخص ہمیشہ کڑھتا رہتا ہے ۔ جیسے اس نے ہنسنا سیکھا ہی نہیں ہے ۔ آزردگی افسردگی اور بے بسی کی ایسی تصویر کسی نے کم دیکھی ہو گی ۔ چہرے پر نحوست چھائی رہتی تھی ۔

آخر ایک دن انہوں نے محمود کو اپنے مکان پر بلا بھیجا۔ پہلے چائے پلائی، مٹھائی کھلائی۔ اس کے بعد مطلب کی بات پر آئے۔ بولے "محمود! تم میرے طالب علم ہو۔ میں تمہارا پروفیسر ہوں۔ مگر اس وقت ہم تم دوست ہیں۔ ایک بات بتاؤ گے؟"

محمود کو پروفیسر کی حالت پر بے اختیار رحم آگیا حلیمی اور شرافت کے سامنے بدتہذیبی اور شرارت بھی نہیں ٹھہرتی۔ اس نے سر جھکا کر جواب دیا "پوچھئے میں ہر ایک بات کا جواب دینے کو تیار ہوں"۔

رُوحی۔ یہ کیر مکانیا کا کیا معاملہ ہے؟ تمہارے پاس جو ڈکشنری تھی۔ اس میں یہ لفظ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اب جو ڈکشنری دیکھتا ہوں۔ اس میں یہ لفظ ندارد۔ یہ کیا طلسم ہے؟"

محمود۔ (چاہیوں کے گچھے سے کھیلتے ہوئے) "امر واقعہ یہ ہے۔ کہ فلاں ڈکشنری میں اس قسم کا کوئی لفظ نہ تھا میں نے آپ سے جھوٹ کہا تھا۔ کہ میں نے یہ لفظ دیکھا ہے۔ جب آپ نے کہا۔ ڈکشنری دکھاؤ۔ تو میں نے ایک پریس سے انتظام کیا۔ کہ وہ مجھے ڈکشنری کے دو صفحے چھاپ دے۔ پہلے تو پریس کا مالک مانتا ہی نہ تھا۔ بڑی مشکل سے مانا۔ ان دو صفحوں کا مضمون وہی تھا۔ صرف یہ لفظ زیادہ تھا۔ ٹائپ وغیرہ سب ویسا ہی تھا۔ ہم نے یہ بھی احتیاط کی تھی۔ کہ کاغذ کا رنگ بھی ڈکشنری کے کاغذ سے مختلف نہ ہو۔ تاکہ کہیں آپ کو شبہ نہ ہو جائے۔ جب یہ صفحے چھپ کر آگئے۔ تو میں نے نہایت احتیاط سے

پہلے صفحے نکال کر یہ صفحے لگا دیئے - اگر آپ ذرا بھی غور سے دیکھتے - تو ضرور بھانپ جاتے"۔

رُوحی:- ارے! اتنا آسان طریقہ! - مگر خدا کی قسم!! مجھے شُبہ تک نہیں ہُوا - اب سوچتا ہُوں - تو معلوم ہوتا ہے - مَیں بیوقوف تھا - جو اتنی بات کو بھی نہ سمجھ سکا - داد دیتا ہُوں بھئی! لیکن ایک بات اَور بتا دو........

محمود - (مُسکرا کر لیکن سر جُھکائے ہوئے) "وہ بھی عرض کئے دیتا ہُوں - ہم آپ کے نئے نئے الفاظ سے تنگ آ گئے تھے - یہ طریقہ محض اِس لئے اختیار کیا گیا - تاکہ........

رُوحی:- ہاں ہاں رُک کیوں گئے........ تاکہ مَیں اس سے باز آ جاؤں! بہت اچھا! اب مَیں آئندہ کبھی غیر معروف اور نئے الفاظ استعمال نہ کروں گا"۔

محمود - (ندامت سے) "اب جناب کیا عرض کروں اِحماقت ہو گئی - اب کے معاف کر دیں - تو پھر ایسی غلطی کبھی نہ ہو گی"۔

رُوحی - (مُسکرا کر) "مُفت میں معافی نہ ملے گی - تمہیں اس کے لئے جُرمانہ دینا پڑے گا - بولو تیار ہو"۔

محمود - (جلدی سے) "جی ہاں! اگر جُرمانہ سے اِس حماقت کی تلافی ہو جائے - تو مَیں بڑی خوشی سے تیار ہُوں"۔

رُوحی:- "اتوار کے دن کھانا یہاں کھاؤ"۔

محمود ۔ (رُوحی صاحب کی طرف دیکھ کر) "یہ آپ تکلیف کیوں کرتے ہیں ؟"
رُوحی "۔ اِس میں مجھے تکلیف نہ ہوگی ۔ اُلٹے خوشی ہوگی"۔
محمود چلنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوگیا ۔ اور بولا "تو میرے دوستوں کو بھی بُلا لیجئے ۔ ان کے بغیر اِس جلسے کا رنگ نہ جمے گا"۔
رُوحی ۔ (تولیہ کرسی پر رکھتے ہوئے) "وہ تمہارے دوست کون سے ہیں ؟"
محمود "۔ ایک گنڈا سنگھ ۔ دُوسرا سُندر لال"۔
رُوحی "۔ مجھے انکار نہیں ۔ مگر انہوں نے کیا کیا ہے جو ان کا مُنہ میٹھا کرایا جائے"۔
محمود ۔ (زیرِ لب مُسکرا کر) "اِس کا ذخیرہ میں وہ برابر کے حصہ دار ہیں ۔ چھپائی کے پیسے انہوں نے بھی دیئے تھے ۔ جماعت کے تمام لڑکوں کو انہوں نے ہی رضامند کیا تھا ۔ کہ صاف انکار کر جانا ۔ کہنا ہمیں کچھ معلوم ہی نہیں ہے ۔ اگر وہ میرے ساتھ نہ ہوتے ۔ تو یہ کامیابی محال تھی ۔ اب اُن کے بغیر اکیلا دعوت کھاؤں ۔ تو کہیں گے بیوفا نکلا ۔ میں شرارتوں سے باز آجاؤں گا ۔ مگر ان کی شرارتیں ختم نہ ہوں گی ۔ آپ کا نمک کھا کر نمک حرامی نہ کریں گے"۔
رُوحی صاحب نے مُسکرا کر جواب دیا "چلو بھئی ! اُن کو بھی بلا لو ۔ ایک وقت میں تین شیطانوں کو گھر پر بُلا رہا ہوں ۔ خدا خیر کرے !"

نخلِ محبّت

(۱)

قریب ڈیڑھ سو سال کا عرصہ گزر چکا ہے، مگر دیوی سُلکھی کا نام آج بھی زندہ ہے۔ گورداسپور کے ضلع میں کڑیالہ نام کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ جہاں زیادہ تر آبادی ہندو جاٹوں کی ہے۔ وہاں آپ کسی سے پُوچھیں۔ وہ آپ کو دیوی سُلکھی کی سمادھ کا پتہ بتادے گا۔ اس پر ہر سال میلہ لگتا ہے۔ عورتیں رنگ برنگ کے کپڑے پہن کر آتی ہیں اور اس پر گھی کے دئے جلاتی ہیں۔ جب بیر پکتے ہیں، تو سب سے پہلے بیر دیوی سُلکھی کی سمادھ پر چڑھائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد لوگ کھاتے ہیں۔ کیا مجال ہے کہ اس سمادھ پر بیر چڑھائے بغیر کوئی بیر کو مُنہ بھی لگا جائے۔ دیوالی کی رات کو لوگ پہلے یہاں چراغ جلاتے ہیں۔ اس کے بعد اپنے گھر میں جلاتے ہیں۔ کسی میں اتنی جُرأت نہیں کہ دیوی سلکھی کی سمادھ کو روشن کئے بغیر اپنے گھر میں روشنی کر جائے۔ بیاہ کے بعد بہوئیں پہلے یہاں آکر اظہارِ عقیدت کرتی ہیں۔ اس کے بعد سسرال میں قدم رکھتی ہیں۔ کسی میں ہمت نہیں کہ

ریت کو توڑ جائے گا۔ دیوی کی سمادھ گاؤں کے وسط میں ہے اُس کے اُوپر عقیدتمندوں نے سنگ مرمر کی ایک چھت بنا دی ہے۔ اس چھت کے اُوپر ایک جھنڈا لہراتا ہے، جو دُور دُور سے نظر آتا ہے۔ دیوی سُلکھی نے کوئی مُلک فتح نہیں کیا نہ کوئی سلطنت قائم کی۔ نہ اُس میں کوئی ایسی ناقابلِ فہم روحانی طاقتیں تھیں۔ جو لوگوں کے دلوں کو پکڑ لیتیں۔ نہ اُس نے رفاہِ عام کی خاطر کوئی قربانی کی۔ وہ ایک غریب اَن پڑھ سیدھی سادھی گرستونتی براہمن لڑکی تھی۔ جو ایک ناعاقبت اندیش، جاہل جاٹ کے غیظ و غضب کا شکار ہو گئی۔ اُس نے اپنے شوہر سے جو عہد کیا تھا۔ وہ اس پر اٹل رہی۔ وہ شہیدِ وفا بھی تھی۔ مظلوم بھی تھی، معصوم بھی تھی۔ اور یہی وہ بات ہے۔ جس نے اُسے اس قدر عرصہ گزر چکنے کے بعد بھی گاؤں میں جیتی جاگتی طاقت بنا رکھا ہے۔ ہندو دیوی دیوتاؤں کی پُوجا کرتے ہیں۔ مسلمان پیروں فقیروں کو مانتے ہیں لیکن دیوی سُلکھی کی حکومت میں مذہب و ملّت کا یہ امتیاز بھی نہیں ہے۔ اُس کی حُکمرانی ہندو مسلمان دونوں کے دلوں پر ہے۔

(۲)

دیوی سُلکھی اسی گاؤں کے ایک غریب براہمن جے چند کی بیوی تھی۔ جے چند کے گھر میں کوئی بھی نہ تھا۔ نہ ماں نہ باپ۔ نہ بہن نہ بھائی۔ دونوں خاوند بیوی تھے۔ کوئی بال بچّہ بھی نہ تھا۔ چند سال علاج معالجہ کرتے رہے لیکن جب تمام کوششیں بے ثمر ثابت ہوئیں تو قسمت پر شاکر ہو کر بیٹھ رہے۔ اُس زمانہ میں براہمن لوگ عام طور پر ملازمت وغیرہ نہ کرتے

تھے۔ نہ روپیہ میں اُس وقت ایسی دلکشی تھی۔ نہ لوگ اِس جنس کو جنسِ نایاب سمجھ کر اُس کے حصول کے لئے بیتاب رہتے تھے تھوڑے ہی میں گُذر ہو جاتا تھا۔ ایک کماتا تھا، دس کھا لیتے تھے۔ آج وہ زمانہ کہاں؟ دس کمانے والے ہوں ایک بیکار کو نہیں کھلا سکتے۔ سارے سارے دن پُوجا پاٹ میں لگے رہتے تھے کھانے پینے کو جاٹ ججمانوں کے ہاں سے آجاتا تھا۔ دونوں کو کسی قسم کا فکر نہ تھا۔ البتہ اپنی بے اولادی پر اکثر کُڑھا کرتے تھے۔ اگر ایک بھی بچہ ہو جاتا تو دونوں بہل جاتے۔ اُن کی زندگیاں شیریں، منوّر، پُر رونق ہو جاتیں۔ اُن کو کوئی مشغلہ مل جاتا۔ اب ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُن کا گھر سُونا سُونا ہے۔ جیسے اُن کے لئے دُنیا بالکل سیٹھی ہے۔ جیسے اُن کی زندگی ایک ختم نہ ہونے والی اندھیری رات ہے۔ جس میں کوئی تارہ کوئی چاند نہیں۔ صرف یاس کے بادل گھرے ہُوئے ہیں۔ اِن دنوں میں کبھی کبھی تھوڑی دیر کے لئے اُمید کی بجلی بھی چمک جاتی تھی۔ لیکن اُس سے اُن کے دلوں کی تاریکی بڑھتی تھی گھٹتی نہ تھی۔ اِسی طرح کئی سال گُذر گئے۔

ایک دن جے چند نے اپنے آنگن کے کونے میں بیری کا ایک پودا دیکھا جو خود بخود اُگ آیا تھا۔ پودا بہت چھوٹا تھا۔ اور عام پودوں سے ذرا بھی مختلف نہ تھا۔ لیکن جے چند کو ایسا معلوم ہُوا جیسے یہ پودا نہ تھا قدرت کے حُسن و جمال کا جلوہ تھا۔ اُس کے چھوٹے چھوٹے رگ و ریشے اور چکنی چکنی ننھی ننھی خوبصورت کونپلیں دیکھ کر اُن کے دل پر خود فراموشی کا عالم طاری ہو گیا۔ دوڑے دوڑے سُلکھنی کے پاس گئے اور بولے "آؤ

کچھ دکھاؤں! بھگوان نے ہمارے گھر میں بُوٹا لگایا ہے بڑا خوبصورت ہے"۔

سُلکھی نے جاکر دیکھا تو ایک ننھا سا پَودا تھا۔ بولی "کیا ہے یہ؟ بڑے خُوش ہو رہے ہو"۔

جے چند "بیری کا پَودا ہے۔ ابھی چھوٹا ہے، چند دنوں میں بڑا ہو جائیگا۔ اس میں سبز سبز پتّے آئیں گے۔ میٹھے میٹھے پھل لگیں گے۔ لمبی لمبی ڈالیاں پھیلا کر کھڑا ہو گا"۔

سُلکھی نے خوش ہو کر کہا "آنگن میں سایہ ہو جائیگا"۔

جے چند "ہر سال بیر لگیں گے۔ خُوب میٹھے ہوں گے"۔

سُلکھی "مَیں ہر روز پانی سے سینچا کروں گی۔ چند ہی دنوں میں بڑا ہو جائے گا۔ کب تک پھلے گا"؟

جے چند۔ (پودے کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھ کر) چار سال بعد۔ تُم نے دیکھا کیسا پیارا لگتا ہے! بڑا ہو کر اَور بھی پیارا لگے گا۔ کیسا چکنا ہے! کیسا خوبصورت ہے!! دیکھ کر آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں"۔

سُلکھی۔ (سادگی سے) "گرمی کے دن ہیں کمھلا جائیگا مجھے تو اب بھی گھبرایا

سلہ یہ خاص پنجاب کا محاورہ ہے۔ بُوٹا لفظ پَودے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ بیٹے کے لئے بھی۔ یہاں اِس کے دونوں معنی ہیں ایک یہ ہمارے گھر میں ایک پودا اُگا ہے، دُوسرے یہ کہ ہمارے ہاں بیٹا پیدا ہُوا ہے۔ مُحمد رشن۔

ہُوا معلوم ہوتا ہے۔ ذرا کونپلیں تو دیکھو جیسے پیاس سے بیاکل ہو رہی ہوں کہئے تازہ پانی بھر لاؤں؟ گرمی سے بڑے بڑوں کا بُرا حال ہے، یہ تو بالکل ننھی سی جان ہے! ابھی بھر لاؤں گی"۔

جے چند" ایسے وقت میں تم کہاں جاؤ گی۔ مَیں جاتا ہُوں"۔

لیکن سُلکھی نے کاسا اُٹھایا اور چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد دونوں خاوند بیوی اُس ننھے سے پودے کو پانی سے سینچ رہے تھے۔ ایسی محبت سے جیسے اُن کا جیتا جاگتا بچہ ہو۔ ایسی عقیدت سے جیسے اُن کا دیوتا ہو۔ ایسی محویت سے جیسے کوئی نہایت دلکش چیز ہو۔ پَودا دھوپ سے سچ مچ کمھلایا ہُوا تھا۔ ٹھنڈا پانی پا کر اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ سُلکھی بولی "دیکھو تو اب اس میں تازگی آگئی ہے یا نہیں؟ کیوں؟"

جے چند" مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ مُسکرا رہا ہے"۔

سُلکھی" اور مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے باتیں کر رہا ہے۔ کہتا ہے۔ مَیں تمہارا بیٹا ہُوں"۔

جے چند" بھئی یہ بات تو تم نے میرے ہونٹوں سے چھین لی۔ مَیں بھی یہی کہنے جا رہا تھا۔ ہاں بیٹا تو ہے ہی۔ اس سے خُوب پیار کرو گی نا؟"

سُلکھی" تمہارے کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ بیٹے سے کون پیار نہیں کرتا"۔

جے چند" لیکن کہیں مجھے نہ بُھول جانا۔ بڑی عمر میں لڑکا پا کر عورتیں خاوند کی طرف سے لاپرواہ ہو جاتی ہیں۔ مگر مجھ سے تمہاری لاپرواہی برداشت نہ ہوگی۔ یہ ابھی سے کہے دیتا ہوں"۔

سُلکھی "چلو ہٹو! تمہیں تو ابھی سے ڈاہ ہونے لگا۔" جے چند ہنستے ہنستے گھر کے اندر چلے گئے لیکن سُلکھی کئی گھنٹے وہیں دُھوپ میں کھڑی بیری کی طرف دیکھتی رہی اور خوش ہوتی رہی۔ آج بھگوان نے اُس کے گھر میں بُوٹا لگا دیا تھا، آج اُس کو ایسا محسُوس ہُوا جیسے وہ بانجھ نہیں رہی۔ معصُوم بچّہ چھاچھ کو دُودھ سمجھ کر پینے لگا ✦

(۳)

اب جے چند اور سُلکھی دونوں کو ایک مشغلہ مل گیا کبھی بیری کو پانی دیتے، کہ کمہلا نہ جائے۔ کبھی کھُرپی لے کر اُس کے آس پاس کی زمین کھودتے کہ اُسے زمین سے خوراک حاصل کرنے میں دقت نہ ہو۔ کبھی اُس کے گرداگرد باڑ لگاتے کہ کوئی جانور نقصان نہ پہنچائے۔ کبھی دو چار پائیاں کھڑی کر کے اُس پر چادر پھیلا دیتے۔ کہ گرمی میں سُوکھ نہ جائے۔ لوگ یہ دیکھتے تھے اور ہنستے تھے۔ بعض شخص کہہ بھی دیتے تھے کہ ان کے حواس بجا نہیں رہے۔ لیکن محبّت کے ان سادہ دِل متوالوں کو اس کی ذرا پروا نہ تھی۔ اُنہیں بیری کی کونپلیں بڑھتی دیکھ کر وہی خوشی ہوتی تھی۔ جو خوشی ماں باپ کو بچّے کے ہاتھ پاؤں بڑھتے دیکھ کر ہوتی ہے۔ جے چند باہر سے آتے تو سب سے پہلے بیری کی عافیت دریافت کرتے۔ سُلکھی رات کو کئی کئی مرتبہ چونک کر اُٹھتی اور بیری کو دیکھنے جاتی۔ شاید اُسے خطرہ تھا کہ کوئی اس انمول چیز کو اُکھاڑ کر نہ لے جائے۔ ایسی محبّت، ایسی احتیاط سے کسی بیوہ نے اپنے اکلوتے بیٹے کی بھی کم پرورش کی

ہو گی۔ دھیرے دھیرے یہ نخلِ محبّت بڑھنے لگا۔ اب وہ زمین سے بہت اُوپر اُٹھ گیا تھا۔ اُس کا تنا بھی بہت موٹا ہو گیا تھا۔ ڈال بھی بڑے بڑے ہو گئے تھے۔ رات کے وقت ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ باہیں پھیلا کر کسی کو گلے لگانے کو بے قرار ہو۔ سُلکھی اُسے اپنی بیٹی اور جے چند اُسے اپنا بیٹا کہتے تھے۔ اُسے دیکھ کر اُن کی آنکھیں روشن ہو جاتی تھیں۔ اُن کے دل کنول کھل اُٹھتے تھے۔ یہ درخت معمولی درخت نہ تھا۔ اُن کی مشترکہ محنتوں کا نتیجہ تھا۔ اس کے لئے انہوں نے اپنی راتوں کی نیند قربان کی تھی۔ اس پر انہوں نے اپنے جسم و رُوح کی تمام خوشیاں نثار کر دی تھیں ؛

اسی طرح پیار و محبّت اور غور و پرداخت کے چار سال گزر گئے۔ اور بیری کے پھلنے کا زمانہ نزدیک آ گیا۔ جے چند اور سُلکھی دونوں کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ اُن کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ جب بُور آیا، تو دونوں سارے سارے دن آنگن میں بیٹھے اُس کی حفاظت کیا کرتے تھے۔ کیا مجال، جو کوئی جانور بھی قریب پھٹک جائے جے چند اب پہلے کی طرح پُوجا پاٹھ کے پابند نہ رہے تھے۔ سُلکھی کو اب چرخہ کا خیال نہ تھا۔ معمولی درخت کی محبّت نے اُن کو اس طرح باندھ لیا تھا کہ ہلتے بھی نہ تھے۔ ہر وقت اسی کی باتیں کرتے تھے۔ اُس وقت اُن کا انداز شاعرانہ رنگ اختیار کر لیتا تھا۔ سُلکھی کہتی تمہارے خیال میں یہ زرد رنگ کا بُور ہو گا۔ مگر مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری بیٹی نے سونے کے زیور پہنے ہیں۔ کس شان سے کھڑی ہے کہ دیکھ کر دل خوش ہو جاتا ہے۔ جے چند کہتے یہ میرے بیٹے کی

پہلی کمائی ہے۔ اسے بُور کون کہتا ہے۔ یہ تو مُہریں ہیں۔ بلکہ مجھے تو اس کے سامنے مُہریں بھی ہیچ معلوم ہوتی ہیں۔ اُنہیں آدمی بناتا ہے۔ اسے خود بھگوان اپنے ہاتھوں سے سنوارتا ہے۔ اس کے سامنے مُہروں اور اشرفیوں کی حقیقت ہی کیا ہے۔ چند دن کے بعد یہ بیر بن جائیں گے۔ اُن میں جو خوبصورتی، جو شباب، جو شیرینی جو حلاوت ہوگی۔ وہ سونے کے اُن سکّوں میں کہاں؟ سُلکھی کہتی جس دن پہلے بیر اُتریں گے اُس دن مٹھائی بانٹوں گی۔ جَے چند کہتے ہیں رات جگا کروں گا۔ گاؤں کے سارے لوگوں کو بُلاؤں گا۔ ساری رات رونق لگی رہے گی۔ سُلکھی کہتی، خُوب خرچ کرنا پڑے گا۔ جے چند جواب دیتے۔ لوگ بیٹوں کے بیاہ میں لُٹاتے ہیں۔ میرے لئے یہی بیٹے کا بیاہ ہے۔ سب کچھ خرچ ہو جائے جب بھی پروا نہیں۔ لیکن ایک مرتبہ دل کے ارمان نکل جائیں۔ کوئی حسرت باقی نہ رہ جائے۔ یہ سُن کر سُلکھی کسی دُوسری دُنیا میں پہنچ جاتی تھی۔ اُس کے بحرِ دل میں خوشی کی ترنگیں اُٹھنے لگتی تھیں۔ جیسے چاندنی رات میں سمندر میں جوار بھاٹا آ جائے۔

(۴)

آخر وہ دن آ گیا، جس کے لئے خاوند بیوی دونوں چشم براہ تھے۔ پہلے دن بیری کے دو سَو بیر اُترے۔ یہ بیر اس قدر موٹے، ایسے سبز اور سُرخ، اتنے خوبصورت اور چکنے چکنے تھے کہ دیکھ کر طبیعت ہری ہو جاتی تھی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ سُلکھی نے پُرانے زمانہ کی ہندو عورتوں کی طرح نئے کپڑے پہنے، سُرخ رنگ کا باغ[1] اوڑھا۔ ناک میں نتھ پہنی اور ہاں گر

[1] ایک سُرخ رنگ کا دوپٹا جس پر ریشم سے پھول وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ پُرانے خیال کی ہندو مستورات ہر مبارک موقعہ پر اسی قسم کے کپڑے استعمال کیا کرتی ہیں۔

جے چند کے سامنے کھڑی ہوگئی جیسے آج اُس کے ہاں کوئی بیاہ شادی تھی۔ اُس کو اِس لباس میں دیکھ کر جے چند پر خوشی کا عالم طاری ہو گیا۔ چند لمحوں تک اُس کے مُنہ سے کوئی بات نہ نکلی۔ آنکھیں موند کر دل ہی دل میں اِس رُوحانی مسرت سے لُطف اندوز ہوتے رہے۔ تب انہوں نے بیر ٹوکری میں رکھے اور سُلکھی سے کہا "جا۔ جا کر ججمانوں کے ہاں گِن کر بیس بیس دے آ۔ سُلکھی نے اُمید وبیم کی نگاہوں سے شوہر کی طرف دیکھا اور درد بھری آواز میں کہا "پرماتما کرے خُوب میٹھے ہوں۔ لوگ خُوب تعریف کریں آ کر دوہائیاں دیں۔ کہیں ایسے بیر سارے گاؤں میں نہیں ہیں"۔

جے چند نے دس بیر اپنے لئے رکھ لئے تھے۔ اُن کی طرف تاکتے ہوئے بولے "تُو مفت میں مری جاتی ہے۔ دُوسروں کے لئے میٹھے نہ ہوں گے نہ سہی۔ پر ہمارے لئے اِن سے میٹھی چیز دُنیا میں اَور کوئی نہیں ہے۔ یہ مَیں بغیر چکھے کہہ سکتا ہُوں۔ جا۔ دیر ہوئی جاتی ہے، تُو بانٹ کر آ جائے گی تو ایک ساتھ کھائیں گے"۔

سُلکھی نے شوہر کی طرف محبت سے دیکھ کر جواب دیا "مَیں ایک گھر میں دے لوں تو تُم کھا لینا۔ میرا انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

جے چند "واہ ضرورت کیوں نہیں ہے۔ ایک ساتھ کھائیں گے۔ اکیلے میں ذرا مزا نہ آئے گا۔ ذرا جلدی لَوٹ آنا"۔

سُلکھی نے چھوٹا سا گھونگٹ نکالا، اور بیروں کی ٹوکری اُٹھا کر بانٹنے چلی، جیسے کوئی بیاہ شادی کی مٹھائی تقسیم کرنے جا رہا ہو۔ تھوڑی دیر میں

ایک ججمان دَوڑتا ہُوا آیا اور بولا "پنڈت جی! مبارک ہو۔ بیر خُوب میٹھے نکلے ہیں"

جَے چند کا دل دھڑکنے لگا۔ چہرہ گُل رنگ ہو گیا۔ بولے "اچھا! آپ نے کھائے ہیں"

ججمان "کھائے کیا ہیں۔ ایک بیر چکھا ہے۔ مگر واصاحب وا! گُڑ سے بھی میٹھا ہے۔ آم سے بھی میٹھا ہے۔ کوئی اَور بیر ہے یا نہیں؟"

جَے چند کی باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ انہوں نے دو بیر اُٹھا کر ججمان کے ہاتھ میں رکھ دیئے۔ ججمان کھاتا جاتا تھا اور تعریف کرتا جاتا تھا۔ کہتا تھا "پنڈت جی یہ بیر کیا ہیں۔ کھانڈ کھلونے ہیں۔ میری اتنی عمر ہو گئی ایسے بیر میں نے آج تک نہیں کھائے۔ پرماتما جانے اِن میں کیسا جائیکہ ہے، مالم ہوتا ہے جیسے کوئی کھوسبو بھری ہے۔ جیسے کسی نے عطر بھر دیا ہے"

جَے چند "پرماتما نے ہماری محنت سپھل کر دی"

ججمان "سارے الاکے میں ایسے بیر مل جائیں۔ تو مونچھیں کٹوا دُوں۔ دُور نجیک سے لوگ آیا کریں گے مالم ہوتا ہے آپ نے ابھی تک نہیں چکھے"

جَے چند "ججمانوں کو بھینٹ کر لوں پھر کھاؤں گا"

ججمان "حیران رہ جاؤ گے۔ ایسے بیر کابل۔ کندھار میں بھی نہ ہوں گے۔ ہمارے گھر میں دس بیس بیروں سے کیا بنتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے کھتم ہو گئے۔ اَور بیر کب تک اُتریں گے؟ ہم ہینس ۲ اَور لیں گے"

جے چند: "آپ کا اپنا درخت ہے دو چار دن تک اور اُتریں گے۔ تو بھجوا دوں گا۔ مجھے کھلا کر جو خوشی حاصل ہوتی ہے وہ کھا کر نہیں ہوتی۔ لیجئے دو اَور لے جائیے۔ چھ باقی ہیں۔ ہم دونوں تین تین کھالیں گے۔"

تھوڑی دیر بعد ایک اور ججمان آیا۔ اُس نے بھی اِس قدر تعریف کی۔ کہ جے چند کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ بولا "یہ محبت کا درخت ہے۔ اِس میں محبت کے بیر لگے ہیں۔ اِس سے میٹھے بیر دُنیا بھر میں نہ ہوں گے۔ صاحب اِتنی محنت کون کرتا ہے۔ آپ دونوں نے ایک مثال قائم کردی۔ دو بیر کھائے ہیں۔ دو اَور مل جائیں۔ تو مزہ آجائے۔ وافر ہیں یا نہیں؟"

جے چند نے مسکرا کر کہا "چھ بچے ہیں۔ دو آپ لے جائیے۔ دو دو ہم کھالیں گے۔"

ججمان: "یہ تو آپ پر ظلم ہوگا۔ رہنے دیجئے۔ پھر سہی۔ اَور بیر کب تک اُتریں گے؟"

جے چند: "آپ لے جائیے۔ ہمیں ذائقہ دیکھنا ہے۔ پیٹ تھوڑا بھرنا ہے (بیر ہاتھ پر رکھتے ہوئے) رات رتجگا ہے۔ آئیے گا نا؟ کوئی بیٹے کا بیاہ کرتا ہے —— کوئی پوتے کا مُنڈن کرتا ہے۔ میری زندگی میں ایک دن آیا ہے۔ یہی پہلا ہے، یہی آخری ہوگا۔"

ججمان: "ضرور آؤں گا پنڈت جی! مگر بیر خوب میٹھے ہیں ابھی تک مُنہ سے خوشبو آرہی ہے۔"

یہ کہہ کر ججمان چلا گیا۔ اتنے میں دو اَور آگئے۔ پنڈت جی کے پاس

چار بیر باقی تھے۔ وہ اُن کی نذر ہو گئے۔ اب آپ کے پاس ایک بھی بیر نہ تھا۔ پنڈت جی دل میں ڈرے سُلکھی سے کیا کہوں گا۔ کہیں خفا نہ ہو جائے، طیش میں نہ آ جائے۔ لیکن سُلکھی اِس قسم کی عورت نہ تھی۔ سارا واقعہ سُن کر بولی "آپ نے بہت اچھا کیا ہے۔ ہمارا کیا ہے؟ پھر کھالیں گے۔ اپنی بیری ہے کہیں مانگنے تھوڑا جانا ہے۔ اور کیا؟"

جے چند "گاؤں میں دھوم مچ گئی ہے۔ کہتے ہیں ایسے بیر دُور دُور تک کہیں نہیں ہیں"۔

سُلکھی کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ نتھ کو سنبھالتے ہوئے بولی۔ "سبھی کہتے ہیں، اور دو۔ بیر کیا ہیں کھٹے کے پیڑے ہیں"۔

جے چند "کہتے ہیں۔ ان میں سگندھ بھی ہے"۔

سُلکھی "جو کھاتا ہے، چٹخارے لیتا ہے کہتے ہیں۔ ایسا مزہ نہ آم میں ہے نہ سنگترہ میں"۔

جے چند "یہ سب تمہاری محنتوں کا پھل ہے۔ روز پانی دیا کرتی تھیں۔ تمہارے ہاتھوں کا پانی امرت ہو گیا"۔

سُلکھی "اور جو تم کپڑوں سے سایہ کرتے پھرتے تھے اُس کا کوئی اثر ہی نہیں۔ یہ سب اسی کا نتیجہ ہے"۔

جے چند "تم دیر میں تو ہیں۔ ورنہ ایک ساتھ کھاتے۔ اب دو چار دن کے بعد پکیں گے"۔

---

(۵)

لیکن جے چند کی قسمت میں بیر پکانا لکھا تھا۔ بیر کھانا نہ لکھا تھا۔ رتجگا کے بعد اُن کو یکایک بخار ہو گیا۔ گاؤں میں جیسا علاج ہو سکتا تھا۔ ہوا۔ حکیم نے سمجھا۔ تکان کا بخار ہے۔ معمولی دواؤں سے اُتر جائے گا۔ مگر یہ تکان کا بخار نہ تھا۔ موت کا بخار تھا۔ جس کی دوا دُنیا کے بڑے سے بڑے حکیم کے پاس بھی نہیں۔ چوتھے دن صبح کے وقت جے چند سُلکھی سے گھنٹہ بھر آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے۔ باتیں کیا کرتے رہے۔ روتے اور رُلاتے رہے۔ دُنیا داری کی باتیں سمجھاتے رہے۔ یہ باتیں اُن کی زندگی کا ماحصل تھیں۔ سُلکھی یہ باتیں سُنتی تھی۔ اور روتی جاتی تھی۔ اِس وقت اُس کا دل بس میں نہ تھا۔ وہ چاہتی تھی۔ جس طرح بھی ہو۔ شوہر کو بچالے۔ اگر اُس کے اختیار میں ہوتا۔ تو وہ اپنی جان دے کر بھی اُنہیں بچا لیتی۔ اس سے اُسے ذرا بھی عار نہ تھا۔ لیکن جو قسمت میں بدا ہو۔ اُسے کون روک سکتا ہے؟ تھوڑی دیر بعد اِدھر دُنیا کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ اُدھر جے چند کی زندگی کا آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔

اب سُلکھی دُنیا میں بالکل اکیلی تھی۔ اب اُس کا سوائے ایک چھوٹے بھائی کے اور کوئی بھی نہ تھا۔ چند دن روتی رہی۔ اس کے بعد چپ ہو گئی۔ اِس لئے نہیں کہ موت کا رنج فراموش ہو گیا۔ بلکہ اِس لئے کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو نہ رہے تھے۔ رو رو کر آنسو بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن اُس کے دل کے زخم ہمیشہ ہرے تھے۔ اُسے کسی پہلو کل نہ پڑتا تھا۔ شوہر کی

مَوت کے بعد اُسے کسی نے ہنستے نہیں دیکھا۔ نہ اچھا کھاتی تھی۔ نہ اچھا پہنتی تھی۔ اُس کا بیشتر وقت غریب دُکھی لوگوں کی خدمت میں گزرتا تھا۔ گاؤں میں کوئی بیمار ہوتا۔ سُلکھی پہنچ جاتی۔ پھر اُسے سونا حرام تھا۔ کیا مجال جو سرہانے سے ٹل جائے۔ ہر وقت خدمت میں لگی رہتی تھی۔ جیسے ماں بچے کی تیمارداری کر رہی ہو۔ جب وہ تندرست ہو جاتا۔ تب گھر لوٹتی۔ اُس کی ان خدمت گزاریوں نے گاؤں والوں کے من موہ لئے۔ وہ کہتے تھے۔ یہ عورت نہیں۔ دیوی ہے۔ اب اُنہیں معلوم ہوتا تھا۔ کہ یہ نہ ہو۔ تو گاؤں والوں پر مصیبت ٹوٹ پڑے۔ اُسے دُنیا کی کسی چیز سے محبت نہ تھی۔ کسی چیز کی پروا نہ تھی جیسے اُس نے سنیاس لے لیا ہو۔ جیسے اُسنے دُنیا کی ہر ایک چیز ترک کر دی ہو +

لیکن اُسے ایک چیز سے اب بھی محبت تھی۔ اور وہ اُس کی بیری تھی۔ وہ اب بھی اُس کا اسی طرح خیال رکھتی تھی۔ اُس کو اُسی طرح پانی دیتی تھی۔ اُسی طرح دیکھ بھال کرتی تھی۔ گرمی میں اُس کے پتوں کو کملائے ہوئے دیکھ کر اب بھی اُسی طرح بے چین ہو جاتی تھی۔ رات کو چونک چونک کر اب بھی اُسی طرح دیکھتی تھی۔ باہر جاتی۔ تو بھائی لچھمن سے کہہ جاتی۔ بیری کا خیال رکھنا۔ جب بیر لگتے۔ تو دو دو تین تین مہینے اُس کے پاس سے نہ اُٹھتی۔ مبادا جانور آ کر کتر جائیں۔ جب بیر اُترتے۔ تو سارے گاؤں میں بانٹتی۔ جس طرح پہلے سال بانٹے تھے۔ مگر آپ بیر کو مُنہ نہ لگاتی تھی۔ نہ پہلے سال کھائے تھے۔ نہ اب کھاتی تھی۔ اُس کا بھائی

لچھمن خوب پیٹ بھر کر کھاتا تھا۔ وہ کہتا تھا۔ یہ بیر اس دُنیا کے نہیں۔ سورگ پوری (جنّت) کے ہیں بعض وقت کہتا۔ ایسے بیر سورگ میں بھی نہ ہوں گے۔ بہن سے کہتا۔ تُو بھی چکھ کر دیکھ۔ وہ کہتی۔ وہ کھاتے۔ تو میں بھی کھاتی۔ اُنہوں نے نہیں کھائے۔ مَیں بھی نہ کھاؤں گی۔ لچھمن کہتا۔ تُو بدقسمت ہے۔ سُلکھی جواب دیتی۔ بدقسمت نہ ہوتی۔ تو وہ کیوں مرتے۔ اب تو ساری عُمر اسی طرح گزر جائے گی۔

گورداسپور کے کئی دُکان داروں نے بیری خریدنی چاہی۔ مگر سُلکھی نے صاف انکار کر دیا۔ کہا مرتی مر جاؤں گی۔ مگر بیری نہ دُوں گی۔ ایک دُکاندار نے کہا۔ دو سَو روپیہ لے لے۔ بیری دیدے۔ سُلکھی نے جواب دیا۔ تُو دو ہزار دے۔ جب بھی نہ بیچوں۔ دو لاکھ دے۔ جب بھی نہ بیچوں۔

دُکاندار۔ "تُو عجب عورت ہے۔ نہ کھاتی ہے۔ نہ بیچتی ہے۔"

سُلکھی۔ "بانٹتی تو ہُوں۔ میرے لئے یہی خوشی کی بات ہے۔ مَیں نہیں کھاتی تو کیا ہُوا۔ سارا گاؤں تو کھاتا ہے۔"

دُکاندار۔ "مگر اس سے تجھے کیا مل جاتا ہے؟ جس کو بیر کھانے کی خواہش ہوگی۔ پیسے دے کر خرید لیگا۔"

سُلکھی نے دُکاندار کی طرف درد بھری نگاہوں سے دیکھا۔ اور کہا۔ "مَیں براہمنی ہوں۔ کنجڑن نہیں ہوں۔ جو اپنی بیری کے بیر بیچوں۔ نہ بھئی! یہ نہ ہوگا۔ تو اپنے روپے لے جا۔ مجھے یہ سودا منظور نہیں۔"

ایک دُوسرے دُکاندار نے کہا۔ "تو بیری بیچ دے۔ تو مَیں پانسو دُوں۔

بول! ہے ارادہ"۔
سُلکھی:۔ "یہ بیری نہیں ہے۔ ہماری اولاد ہے۔ اپنی اولاد کو کون بیچتا ہے؟"
دُکاندار:۔ "یہ تیرا وہم ہے۔ آدمی کی اولاد آدمی ہوتا ہے۔ درخت نہیں ہوتا"۔
سُلکھی:۔ "اپنا اپنا خیال ہے۔ کئی آدمی ایسے بھی ہیں۔ جو ٹھاکر کو پتھر کہتے ہیں"۔
دُکاندار:۔ "مجھے تو درخت ہی معلوم ہوتا ہے"۔
سُلکھی:۔ "تیری آنکھوں میں وہ بینائی کہاں؟ جو اس کی اصلی صُورت دیکھ سکے۔ درختوں کے بیر ایسے میٹھے کہاں ہوتے ہیں"۔
پھمن اب تک خاموش تھا۔ یہ سُن کر بولا:۔ "ایسے میٹھے بیر تم نے کہیں اور بھی دیکھے ہیں۔ ایک ایک بیر ایک ایک آنہ کو بھی سستا ہے"۔
دُکاندار:۔ "یہ ٹھیک ہے بھیا۔ لیکن آخر ہے تو بیری"۔
سُلکھی:۔ "نہیں بھیا! یہ بیری نہیں ہے۔ میرے سوامی کی یادگار ہے۔ جو اپنے سوامی کی یادگار کو بیچ دے۔ اُس کو مر کر نرک بھی نہ ملے"۔
دُکاندار:۔ "اب اِس کا کیا جواب دُوں۔ پانسو روپیہ کم نہیں ہوتا۔ تیری ساری عمر سُکھ سے کٹ جائے گی"۔
سُلکھی:۔ "بھیا! جو سُکھ مجھے اِس کو پانی دے کر ہوتا ہے۔ وہ سُکھ یہ روپے لے کر کبھی نہ ہوگا"۔
دُکاندار:۔ "تو پانی دینے سے تجھے کون روکتا ہے؟ جتنا چاہے پانی دے۔ اگر تیرا ہاتھ پکڑ جاؤں۔ تو جو چور کی سزا۔ وہ میری سزا"۔

سُلکھی "مگر جو بات اب ہے۔ وہ پھر کہاں؟ اب اپنا ہے پھر پرایا ہو جائیگا۔ اب بیر سارے گاؤں میں بانٹتی ہوں پھر تو ہاتھ بھی نہ لگانے دے گا۔ گاؤں کے جن لوگوں کے پاس پیسے نہیں۔ وہ کیا کریں گے؟ بیروں کو دیکھیں گے اور آہ سرد بھر کر رہ جائیں گے۔ مجھے کوسیں گے۔ دل میں گالیاں دیں گے! اب سب کو مفت ملتے ہیں۔ پھر کسی کو بھی نہ ملیں گے۔ گاؤں کے چھوٹے چھوٹے بچے کہیں گے؛ کیسی ظالم ہے۔ چار پیسوں کی خاطر بیری بیچ دی! نہ بھائی! یہ کلنک کا ٹیکا نہ خریدوں گی۔ مَیں غریب ہی بھلی"۔

یہ کہہ کر سُلکھی بیری کے پاس چلی گئی۔ اور اُس کی ڈالیوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

اور یہ اُس عورت کا حال تھا۔ جس نے کسی پاٹ شالا میں تعلیم نہ پائی تھی۔ جس نے کرم دھرم پر کوئی لیکچر نہ سُنا تھا۔ جس کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ جو اپنے ججمانوں کے دان پر گزارہ کرتی تھی۔ مگر اس کا دل کتنا وسیع، کتنا پاکیزہ تھا! اُس نے پڑوسیوں کے فرائض و حقوق کو کس قدر صحیح سمجھا تھا۔ ایسی پاک نفس۔ نیک سرشت۔ سیر چشم دیویاں دُنیا میں روز روز نہیں پیدا ہوتیں۔

(۶)

کئی سال گزر گئے۔

جیٹھ کا مہینہ تھا۔ سُلکھی بیری کے تمام بیر بانٹ چکی تھی۔ اب بیری پر

ایک بیر بھی باقی نہ تھا۔ سُلکھی بیری کے پاس کھڑی اُس کی پھلوں سے خالی ڈالیوں کو دیکھتی تھی۔ اور خوش ہوتی تھی۔ کہ اِس سال کا فرض بھی پورا ہوگیا۔ اتنے میں اُس کے ایک ججمان ہاڑی رام نے آکر سُلکھی کو نمسکار کیا۔ اور بولا "پنڈتانی جی! ہمارے بیر کہاں ہیں؟"

سُلکھی کے سر پر جیسے بجلی سی گر پڑی۔ حیران تھی۔ کیا کہے۔ کیا نہ کہے۔ ہاڑی رام گاؤں میں سب سے بدمزاج جاٹ تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر جوش میں آجاتا تھا۔ اور مرنے مارنے کو طیار ہوجاتا تھا۔ اُس کی لال آنکھیں دیکھ کر سارا گاؤں سہم جاتا تھا۔ وہ مع اپنے بال بچوں کے دو ماہ سے کہیں باہر گیا ہُوا تھا۔ سُلکھی ایک دو مرتبہ اُس کے مکان پر گئی۔ اور دروازہ بند پاکر لوٹ آئی۔ اس کے بعد وہ اُس کے حافظہ سے اُتر گیا۔ اور بیر ختم ہوگئے۔ اور اب .... ہاڑی رام اُس کے سامنے کھڑا تھا +

سُلکھی نے اُس کی طرف خطاوارانہ نگاہوں سے دیکھا اور کہا۔ ججمان! "بیر تو ختم ہوگئے" +

ہاڑی رام نے قدرے تُرش رُو ہوکر کہا "واہ! ختم کیسے ہوگئے۔ ہمیں تو ملے ہی نہیں" +

سُلکھی "اب تم جانے کہاں چلے گئے تھے۔ دو مرتبہ تمہارے مکان پر لے کر گئی۔ دونوں مرتبہ دروازہ بند تھا۔ لوٹ آئی۔ اس کے بعد پھر مجھے خیال نہیں رہا" +

ہاڑی رام۔ (تیوریاں چڑھاکر) "خیال کیوں نہیں رہا۔ اتنی بچی بھی تو نہیں ہو" +

سُلکھی۔ (تحمل سے) "اب جھمان! تم سے بحث کون کرے۔ بھول ہو گئی۔ اگلے سال دُگنے بیر لے لینا"

ہاڑی رام "کھانا تو کبھی نہیں بھولتی ہو۔ نہ فصل پر غلہ مانگنا بھولتی ہو۔ ہمارے بیروں کا وقت آیا۔ تو بھول ہو گئی"

ہاڑی "بیری سے لگے رہنے دیتی۔ میں آتا۔ اُتار لیتا"

سُلکھی "اور جو پک کر گر جاتے۔ تو پھر۔ اب کسی کے مُنہ میں تو پڑ گئے۔ اُس حالت میں کسی کے بھی کام نہ آتے"

ہاڑی رام کی آنکھوں سے آگ کے شرارے نکلنے لگے۔ گرج کر بولا "میرے بیر جب میرے کام نہ آئے۔ تو مجھے کیا؟ خواہ رہیں۔ خواہ مٹی میں مل جائیں۔ میرے لئے ایک ہی بات ہے۔ تم دُوسروں کو دینے والی کون تھی؟"

اب سُلکھی کو بھی طیش آیا۔ قدرے تیز ہو کر بولی "بیری میری ہے۔ تُمہاری نہیں۔ جس کو چاہوں ایک بیر بھی نہ دُوں۔ جس کو چاہوں۔ سب کے سب دیدوں۔ بیری تمہارے ہاتھوں لگی ہوئی نہیں۔ تم بولنے والے کون ہو؟"

ہاڑی رام "اچھا! اب ہم کون ہو گئے؟"

سُلکھی۔ (اُسی طرح خفگی سے) "محنت میں کرتی ہوں۔ رات دن میں جاگتی ہوں۔ پھر سارے کے سارے بیر بانٹ دیتی ہوں۔ خود ایک بیر بھی نہیں کھاتی۔ اس پر بھی اِس قدر خفگی۔ آخر انسان کو کچھ تو

سوچنا بھی چاہیئے۔ جاؤ نہیں دیتے۔ نہ سہی۔ جو کرنا ہو کر لو"۔
ہاڑی رام دانت پیستا ہُوا چلا گیا۔ اِدھر سُلکھی بیری کے پاس جا کر اُس سے لپٹ گئی۔ اور بولی "بیٹی! اگر تمہارا باپ زندہ ہوتا۔ تو اس کی کیا مجال تھی۔ کہ یُوں میری بے عزتی کر جاتا"۔

اس سے تیسرے دن سُلکھی ایک ججمان کے ہاں ایک بیمار بچے کی تیمارداری کر رہی تھی۔ کہ ایک لڑکا دوڑتا ہُوا آیا۔ اور ہانپتا ہُوا بولا۔ "تمہاری بیری کو ہاڑی نے کاٹ دیا۔ کئی لوگوں نے منع کیا۔ مگر وہ کہتا تھا۔ مجھے سُلکھی نے گالی دی ہے"۔

(۷)

سُلکھی کو ایسا معلوم ہُوا۔ جیسے کسی نے گولی مار دی ہے۔ وہاں سے چلی۔ تو اُسے رستہ نظر نہ آتا تھا۔ اُس کے پاؤں تلے سے زمین نکلتی جا رہی تھی۔ اسوقت اُس کے جسم میں ذرا طاقت نہ تھی۔ پاؤں اس طرح لڑکھڑا رہے تھے۔ جیسے ابھی گر پڑے گی۔ وہ جلدی سے جلدی گھر پہنچ جانا چاہتی تھی۔ رستہ کے دونوں طرف گاؤں کے آدمی کھڑے اُس کو دیکھتے تھے۔ اور ہاڑی کو گالیاں دیتے تھے۔ اِس وقت اُنہیں سُلکھی کا خیال تھا۔ ہاڑی کا ڈر نہ تھا۔ وہ سُلکھی کے ساتھ اظہار ہمدردی کرنا چاہتے تھے اور اُنہیں سوائے ہاڑی کو گالیاں دینے کے اور کوئی طریقہ نظر نہ آتا تھا۔

اُدھر سُلکھی کا آنگن مردوں اور عورتوں سے بھرا تھا۔ اور درمیان میں بیری کٹی پڑی تھی۔ لوگ کہتے تھے۔ کتنا ظالم ہے۔ ذرا سی بات پر بیری

کاٹ دی۔ کاٹنے ہی پر اکتفا کیا ہوتا۔ تو بھی خیر تھی۔ اگلے سال پھر اُگ آتی۔ لیکن اُس نے تو جڑیں بھی اُکھاڑ دیں۔ آدمی کاہے کو ہے چنڈال ہے۔

معاً سُلکھی ایک چھوٹا سا گھونگٹ کاڑھے آئی۔ اور آنگن میں کھڑی ہو گئی۔ اُس نے بیری کے ڈالوں کو زمین پر پڑا دیکھا۔ تو اُس کے دل و جگر پر چھریاں چل گئیں۔ اُس کو ایسا معلوم ہوا۔ جیسے یہ درخت کی ڈالیاں نہیں۔ اُس کی اولاد کے ہاتھ پاؤں ہیں۔ اُس نے آگے بڑھ کر ایک ایک ڈالی کو گلے سے لگایا۔ اور رو رو کر بین کئے۔ اُن دل دوز بینوں کو سُن کر سبھی لوگ رونے لگے۔ سُلکھی کہتی تھی۔ ارے تُو نے مجھے بُلا کیوں نہ لیا۔ بچّہ! پتہ نہیں۔ جب تجھ پر ظالم کا کلھاڑا چلا ہو گا۔ تیرا دل کیا کہتا ہو گا۔ تڑپتا ہو گا۔ سوچتا ہو گا۔ ماں کاہے کو ہے۔ ڈائن ہے۔ یہ جلّاد میرے ہاتھ پاؤں کاٹ رہا ہے۔ وہ باہر گھوم رہی ہے۔ بچّہ! مجھے کیا معلوم تھا۔ تیرے سر پر موت کھیل رہی ہے۔ ابھی بھلا چنگا چھوڑ کر گئی تھی۔ ابھی ابھی تو بانہیں پھیلا کر کھڑا تھا۔ تجھے دیکھ کر جی خوش ہو جاتا تھا۔ اتنی جلدی تیاری کر لی۔ اب لوگ تیرے بیروں کو ترسیں گے۔ ایسے میٹھے بیر اور یہاں نہیں؟ تیرے باپ نے مرتے وقت کہا تھا۔ جب تک جیتی ہے۔ اس کی حفاظت کرنا۔ اور اس کے بیر لوگوں میں بانٹنا۔ آج یہ دونوں باتیں ناممکن ہو گئیں۔ اب میرا زندہ رہنا بیکار ہے۔ چل دونوں ایک ساتھ چلیں۔ وہاں تینوں مل کر رہیں گے۔

یہ کہہ کر اُسنے بیری کی ڈالیوں کی چتا سی چُنی۔ نیچے اُوپر خشک لکڑیاں ڈال کر اُس پر گھی ڈالا۔ اور آگ لگا دی۔ آگ کے شُعلے آسمان کو جانے

لگے۔ لوگ پیچھے ہٹ گئے۔ مگر سُلکھی اُسی جگہ جلتی ہوئی بیری کے پاس چُپ چاپ کھڑی اُس کی طرف دیکھ رہی تھی ÷

معاً وہ چِتا میں کُود پڑی۔ لوگوں میں ہلچل مچ گئی۔ وہ ہیں ہیں کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ لیکن آگ کے شعلوں نے اُن کا رستہ روک لیا۔ سُلکھی آگ میں بیٹھی ہوئی جل رہی تھی۔ لیکن اُس کے چہرے پر ذرا پریشانی ذرا گھبراہٹ نہ تھی۔ بلکہ رُوحانی جلال تھا۔ جیسے اُس کے لئے آگ آگ نہ تھی ٹھنڈا پانی تھا۔ اتنے میں شعلوں سے آواز آئی۔ میں مرتے وقت وصیّت کرتی ہوں میرے خاندان کے لوگ آئندہ دان نہ لیں ÷

مردوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ عورتیں پھُوٹ پھُوٹ کر رو رہی تھیں۔ لیکن سُلکھی مَوت کے گرجتے ہوئے شعلوں میں خاموش بیٹھی تھی۔ دیکھتے دیکھتے ماں بیٹا دونوں جل کر بھسم ہو گئے۔ کل دونوں زندہ تھے۔ آج کوئی بھی نہ تھا ÷

تھوڑی دیر بعد سُلکھی کا بھائی لچھمن اور گاؤں کے جاٹ لاٹھیاں لئے ہاڑی رام کو ڈھونڈتے پھرتے تھے وہ کہتے تھے آج اِس کو زندہ نہ چھوڑیں گے۔ پہلے ماریں گے پھر باندھ کر آگ میں جلا دیں گے ÷

لیکن ہاڑی رام جنگلوں اور بنوں میں سر چھپاتا پھرتا تھا۔ اس کے بعد اُسے کسی نے نہیں دیکھا۔ کب مرا؟ کہاں مرا؟ کیسے مرا؟ یہ کسی کو بھی معلوم نہیں ÷

دو دوست تھے

(۱)

تاج بہادر

جب مَیں سکول میں پڑھتا تھا، اُن دنوں مجھے سب سے زیادہ محبت مہتاب رائے سے تھی۔ ایسا شریف، ایسا ہونہار، ایسا محنتی طالب علم ہمارے درجہ میں دُوسرا نہ تھا۔ وہ کبھی کسی سے لڑتا جھگڑتا نہ تھا۔ نہ کسی کی شکایت کرتا تھا۔ نہ کبھی دیر میں سکول پہنچتا تھا۔ جھوٹ بولنا وہ جانتا ہی نہ تھا۔ شرارت سے کوسوں بھاگتا تھا۔ اپنے درجہ میں ہمیشہ اوّل رہتا تھا۔ اُس کے اِن اوصاف نے سارے اُستادوں کو اس کا مداح بنا دیا تھا۔ اُن سب کو یقین تھا کہ یہ لڑکا کسی دن بڑا آدمی بنے گا۔ بڑا آدمی بننے کے لئے جس قدر اوصاف کی ضرورت ہے اُس میں سبھی تھے۔ ۔ ۔ وہ غریب بھی تھا۔ بیچارے کا باپ مر چکا تھا۔ ماں لوگوں کے کپڑے سی کر گزارہ کرتی تھی اور اُسے پڑھاتی تھی۔ بیوگی اور ناداری کی اِس بھیانک تاریکی میں

مہتاب رائے ہی اس کے لئے اُمید و مسرت کا دیا تھا۔ جو اُسے بہت دور فاصلے پر ٹمٹماتا ہوا نظر آتا تھا۔ یہ دیا بظاہر کس قدر بے حقیقت تھا لیکن ماں کی نگاہوں میں اُس کی قیمت کوہ نُور ہیرے سے بھی زیادہ تھی۔

مگر مہتاب رائے میں ایک نقص بھی تھا۔ وہ جماعت کے دُوسرے لڑکوں سے زیادہ ملتا جلتا نہ تھا۔ عموماً اُن سے پرے پرے بھاگتا تھا۔ شاید اس کا باعث اُس کے دل کی فطری کمزوری ہو۔ دُوسرے لڑکے سمجھتے تھے یہ اپنی قابلیت کے زعم میں ہمیں حقیر خیال کرتا ہے۔ اس لئے اس سے نفرت کرتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ وہ تمام اُستادوں کا محبوب ہوتے ہوئے بھی اپنی جماعت کے طلبا میں اُچھوت بنا ہوا تھا۔ غریب کو کوئی پاس بٹھانے کا بھی روادار نہ تھا۔ جس کے پاس بیٹھتا وہی مُنہ دوسری طرف پھیر لیتا۔ قابلیت اور شرافت کی بے توقیری کا یہ منظر مجھ سے نہ دیکھا گیا۔ میں نے اُس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور اسے وقتاً فوقتاً روپے پیسے سے امداد دینے لگا۔ چند ہی مہینوں میں ہم آپس میں دوست بن گئے۔ سکول کے سب سے امیر اور سب سے غریب لڑکے میں بھی ایسی محبت ہوسکتی ہے؟ یہ لڑکوں کے لئے نئی بات تھی۔ وہ ہمارے روز بروز بڑھتے ہوئے تعلقات کو دیکھتے تھے اور حیران ہوتے تھے۔ اب میری کوئی چیز میری نہ تھی۔ مہتاب رائے کو جس چیز کی ضرورت ہوتی لے لیتا۔ میں کبھی اُس کا ہاتھ نہ پکڑتا تھا نہ مہتاب رائے کا وقت اس کا اپنا وقت تھا۔ میں جس مضمون میں کمزوری کا اظہار کرتا۔ اس میں وہ مجھے پڑھایا کرتا تھا۔ یہ بھی نہ سوچتا کہ اسے پاس کراتے کراتے کہیں

خود بھی فیل نہ ہو جائے۔ اس کا مکان ہمارے ہی محلہ میں تھا۔ اور مکان کیا تھا ایک ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی تھی۔ اسی میں اس کی ماں کھانا پکاتی تھی۔ اسی میں وہ لکھتا پڑھتا تھا۔ میرے کہنے سے وہ میرے مکان میں آکر پڑھنے لگا۔ مگر کھانا اپنے ہاں ہی کھاتا تھا۔ اور رات کو سونے کے لئے وہیں چلا جاتا تھا۔ میرے والدین اتنے دولت مند ہیں کہ مہتاب رائے کو کھانا کھلانا اُن پر ذرا بار نہ تھا۔ انہوں نے کئی مرتبہ اس سے کہا۔ تم کھانا کھانے گھر کیوں جاتے ہو۔ یہیں کھا لیا کرو۔ ہمارے لئے تاج بہادر اور تم دونوں برابر ہو۔ مگر مہتاب رائے کی خودداری نے یہ امر قبول نہ کیا۔ اس کے اس انکار سے اس کی عزت ہماری نگاہوں میں کئی گنا بڑھ گئی۔ روپے پیسے کا غریب تھا دل کا غریب نہ تھا۔

(۲)

اسی طرح سکول کی زندگی کے دس سال گزر گئے اور ہم نے انٹرنس کا امتحان پاس کر لیا۔ مہتاب رائے نے وظیفہ لیا۔ اور یونیورسٹی بھر میں اوّل رہا۔ مجھے وظیفہ تو نہ ملا لیکن پہلے درجہ میں آ گیا۔ اس کامیابی پر ہم دونوں خوش تھے میں اس لئے خوش تھا کہ مہتاب رائے یونیورسٹی میں اوّل رہا ہے۔ مہتاب رائے اس لئے خوش تھا کہ میں اوّل درجہ میں آ گیا۔ اور یہ سب اس کی محنتوں کا پھل تھا۔ ورنہ میرے جیسے کند ذہن طالب علم کے لئے پاس ہونا بھی آسان نہ تھا۔ اب ہماری محبت اور بھی ترقی کر گئی اور میرے والدین تو اسے اس طرح چاہتے تھے جیسے وہ بھی اُن کا اپنا بیٹا ہو۔ جب میں نینی تال جانے لگا تو میرا دل اُداس ہو گیا۔ خیال آیا مہتاب رائے کے بغیر کیسے

رہوں گا؟ اور پھر ایک دو دن کی بات نہ تھی۔ تین مہینے کا طول طویل عرصہ تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ والد صاحب نے کہا مہتاب رائے کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ گرمیوں میں یہاں رہ کر کیا کرے گا؟ جس طرح بجلی کا بٹن دبانے سے دیکھتے دیکھتے تاریکی میں روشنی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح میرے تاریک دل میں روشنی ہوگئی۔ دل کا کنول کھل گیا۔ دوڑا دوڑا اس کے گھر گیا۔ اور بولا "اسباب باندھو کل نینی تال چلیں گے"۔

مہتاب رائے نے میری طرف محبت کی نگاہوں سے دیکھا اور مسکرا کر جواب دیا "تم چلے جاؤ۔ ہماری قسمت میں لکھنؤ کی گرمیاں لکھی ہیں۔ ہم کہاں جا سکتے ہیں؟"

میں نے مصنوعی غصے سے کہا "واہ چلو گے کیوں نہیں؟ تمہیں باندھ کر بھی لے جاؤں گا"۔

مہتاب رائے "ہمیں وہاں سے دو چار سیر ٹھنڈی ہوا بھیج دینا ہمارے لئے وہی کافی ہے"۔

میں "دو چار سیر ٹھنڈی ہوا سے کیا بنے گا۔ چلو ٹھنڈی ہوا اور ٹھنڈے پانیوں کے دیس میں لے چلیں موٹے تازے ہو کر لوٹو گے"۔

مہتاب "تم موٹے ہو جاؤ گے تو میں سمجھوں گا۔ میں ہی موٹا ہو گیا"۔

میں "ایسے پُر لطف مناظر ہیں کہ دیکھ کر تمہارا دل خوش ہو جائیگا۔ تمہاری رُوح ناچنے لگے گی"۔

مہتاب۔ ایک ایک چیز کا حال لکھنا۔ تم جو کچھ وہاں جا کر دیکھو گے۔

ہم تمہاری آنکھوں سے یہاں گھر بیٹھے ہی دیکھ لیں گے۔"

مَیں :- ہمارے درجہ کے کئی اور لڑکے بھی جا رہے ہیں خُوب لُطف رہے گا!"

مہتاب :- ہمیں کسی سے کیا غرض؟ ہمیں تو یہ خوشی ہے کہ تم جا رہے ہو۔"

مَیں :- ارے تو کیا تم سچ مچ نہ جاؤ گے۔ صاف صاف کہو۔"

مہتاب رائے نے سنجیدگی اختیار کر کے کہا "نینی تال امیروں کی سیر گاہ ہے۔ غریبوں کی نہیں۔ اور ہم بدقسمتی سے اس طبقہ میں ہیں جسے عُرفِ عام میں غریب کہا جاتا ہے۔ نینی تال وہ جائے جس کے پاس روپیہ ہو!"

مَیں :- اِس طرف سے تُم بے فکر رہو۔ تمہارا ایک پیسہ بھی خرچ نہ ہو گا۔ بس تم صرف اسباب باندھ کر گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ اس کے بعد ہم جانیں اور ہمارا کام۔"

مہتاب رائے کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بولا "بھیّا تمہارے احسانوں سے پہلے ہی بہت دبا ہُوا ہُوں۔ اور نہ دباؤ۔"

مَیں :- معلوم ہوتا ہے۔ تم ہمیں ابھی تک غیر ہی سمجھ رہے ہو!"

مہتاب :- یہ تو اپنے دل سے پُوچھو۔ ہم سے کیا پُوچھتے ہو!"

مَیں :- بہت اچھا! تم نہ جاؤ گے تو ہم بھی نہ جائیں گے۔"

مہتاب :- ارے میرے یار! تُم تو خفا ہو گئے۔ تم نے تو وہاں مکان بھی ٹھیک کر لیا ہے۔"

مَیں :- اس سے تمہیں کیا۔ ہم بڑی آس لے کر آئے تھے۔ تم نے ہمارا دل توڑ دیا۔"

یہ کہہ کر مَیں باہر نکل آیا۔ مہتاب رائے نے پیچھے سے آواز دی
"ارے بھئی! ذرا ایک بات تو سُنتے جاؤ"۔

مَیں نے گردن پیچھے موڑ کر دیکھا، اور رکھائی سے کہا "کہو کیا کہتے ہو؟"
مہتاب "تم ہمارے بے نڑ کوٹ یہاں بیمار ہو جاؤ گے"! میں نے اُسے جلانے کے لئے جواب دیا "بیمار ہو جائیں گے تو تمہاری بلا سے"!
یہ تیر نشانے پر بیٹھا۔ مہتاب رائے نے آکر میرے گلے میں باہیں ڈال دیں اور مجھے منانے لگا۔ مگر مَیں نے صاف کہہ دیا "تم نہ جاؤ گے تو مَیں نہ جاؤں گا"۔

آخر مہتاب رائے کو ماننا پڑا۔ دوسرے دن ہم دونوں لکھنؤ سے روانہ ہو گئے۔ گرمیوں کے یہ تین مہینے ایسے دلکش، ایسے رنگین، ایسے پُرلطف تھے کہ آج بھی یاد آتے ہیں۔ تو دِل میں ہوک سی اُٹھتی ہے۔ ہائے افسوس وہ سُنہرے دن کہاں چلے گئے؟ محبّت کے رس میں سموئے ہوئے۔ بے فکری میں ڈوبے ہوئے ایسے دلچسپ جیسے پریوں کی کہانیاں ایسے میٹھے جیسے خواب کے نغمے۔ ایسے پاکیزہ جیسے بہن بھائیوں کا پیار۔ اِس وقت ہمارے دلوں میں محبّت کی شیرینی تھی۔ حسد کی تلخی نہ تھی۔

(۳)

لیکن افسوس! یہ تین مہینے ہماری زندگی کے آخری رنگین مہینے تھے جن کے بعد، ہم دونوں کو حقیقی امن و امان کا ایک دن بھی میسّر نہ ہوا جس طرح پُورن ماسی کا چاند اپنا انتہائی جمال دکھا کر پُورن ماسی کے بعد

گھٹنا شروع ہو جاتا ہے اسی طرح ہمارا اطمینانِ قلب بھی روز بروز کم ہونے لگا۔

مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے۔ جب ہم دونوں جو بلی کالج میں داخل ہوئے۔ اس دن میرا دل شباب کی امیدوں، اور مسرت کی روشنی سے معمور تھا۔ اور میرے سامنے مستقبل کا وہ رستہ کھلا تھا جس پر کامیابی کے پھول کھلتے ہیں، اور محبت کی دھوپ کھیلتی ہے! لیکن جب میں گھر لوٹا تو میرے دل میں امید کی جگہ یاس، خوشی کی جگہ فکر، اور محبت کی جگہ حسد کا زہر بھرا تھا۔ اور میرا مستقبل ابر آلود شام کی طرح دھندلا اور غیر یقینی تھا۔ اور اس کا باعث ایک لڑکی روپ رانی تھی۔ جو اسی دن کالج میں داخل ہوئی تھی۔ اے کاش! یہ لڑکی اس کالج میں نہ داخل ہوئی ہوتی۔ اس نے ایک لمحہ میں میرے دل کا چین، اور دماغ کی توجہ چھین لی۔ میں چاہتا تھا۔ میں اسے دیکھتا ہی رہوں وہ میری آنکھوں سے اوجھل نہ ہو۔ میں نے امیر گھرانے میں پرورش پائی ہے۔ میں فیشن پرست طبقہ کی عورتوں سے ملا ہوں۔ میں نے بہترین سنیما اور ناٹک دیکھے ہیں۔ لیکن ایسا حسن، ایسا جادو میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ اس نے جب پہلے پہل میری طرف اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے دیکھا۔ تو مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے چشم زدن میں ہزاروں دنیائیں دیکھ لی ہیں۔ ان دنیاؤں کے سامنے میں مع اپنی امیری کے کس قدر بے حقیقت، کتنا حقیر تھا!

لیکن رُوپ رانی نے میرا ذرا خیال نہ کیا۔ اور اس کے بعد ایک مرتبہ بھی میری طرف نہ دیکھا۔ بلکہ اُس کی ساری توجہ مہتاب رائے پر مرکوز تھی۔ وہ اور چند دُوسری طالبات سب سے پچھلے بنچ پر بیٹھتی تھیں۔ میں اور مہتاب رائے سب سے آگے ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ میں نے کئی مرتبہ بہانے بہانے سے پیچھے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اور اسے ہر مرتبہ مہتاب رائے کی پیٹھ کی طرف دیکھتے پایا۔ ایک مرتبہ وہ اپنے ساتھ والی لڑکی سے مہتاب رائے کی طرف اشارہ کر کے کچھ بات چیت بھی کر رہی تھی۔ ممکن ہے وہ کہہ رہی ہو یہ لڑکا یونیورسٹی بھر میں اوّل رہا ہے۔ ضرور یہی کہتی ہوگی۔ اور کچھ کہنے کا امکان ہی نہ تھا۔ ایک مرتبہ مہتاب رائے نے پچھلی سیٹ والے لڑکے سے کچھ کہنے کے لئے گردن موڑی۔ تو رُوپ رانی اور اُس کی آنکھیں چار ہوگئیں۔ رُوپ رانی نے فوراً سر جھکا لیا۔ اور مہتاب رائے کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ میں نے یہ دیکھا تو میرے دل میں جیسے کسی نے آگ سی جلا دی۔ اس وقت میں اور مہتاب ملے ایک دوسرے سے مل کر، بالکل پاس پاس بیٹھے تھے۔ بظاہر ہمارے درمیان کوئی تیسری شے نہ تھی۔ لیکن اس کے باوجود ہم ایک دُوسرے سے کس قدر دُور کس قدر پرے تھے۔ ہمارے درمیان رقابت کا ناقابلِ عبور سمندر حائل تھا۔ آج مجھے پہلی مرتبہ اس امر کا احساس ہُوا کہ جب دو دوستوں کے درمیان کوئی مہ جبیں عورت آ کر کھڑی ہو جاتی ہے تو وہ دونوں کتنی جلد پرائے بن جاتے ہیں۔ اُس دن مجھے مہتاب رائے کا وجود زہر معلوم

ہو رہا تھا۔ اُس دن اگر کوئی مجھ سے آکر کہتا۔ کہ مہتاب رائے کسی دوسرے کالج میں جانا چاہتا ہے۔ تو میں خوشی سے دیوانہ ہو جاتا۔ اُس دن اگر کوئی مجھ سے آکر کہتا کہ تم اپنے والدین کی تمام تر دولت اور جائداد دے کر یُونیورسٹی میں اوّل رہ سکتے ہو تو میں اِس سودے کو آنکھیں بند کر کے منظور کر لیتا۔ اور ڈِپ رائے کا منظورِ نظر بننے کے لیئے اپنا سب کچھ قُربان کر دیتا۔ لیکن افسوس یہ میرے بس کی بات نہ تھی۔ میں کسی طرح مہتاب رائے نہ بن سکتا تھا۔

(۴)

مہتاب رائے

میں کتنا ذلیل، کتنا گنہگار ہوں۔ جو اپنے محسن کی دل آزاری کا موجب ہو رہا ہوں۔ اگر میں کالج میں داخل نہ ہوتا، تو یہ نوبت کاہے کو آتی؛ وہ مجھے کتنا چاہتا تھا؛ مجھے دیکھ کر کیسا خوش ہو جاتا تھا؛ گرمیوں میں کس شوق سے مجھے نینی تال ساتھ لے گیا تھا؛ جب میں نے انکار کیا تو کیسا ملول ہو گیا تھا؛ اور آج ایسا معلوم ہوتا ہے۔ میری شکل سے بھی بیزار ہے۔ مجھے دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیتا ہے۔ پہلے دنوں میں کئی کئی مرتبہ میرے گھر آیا کرتا ہے۔ اب مہینوں گزر جاتے ہیں کبھی اِدھر کو رُخ ہی نہیں کرتا۔ اُس دن ماں جی نے پوچھا تھا۔ کیا تم سے اور تاج سے کچھ جھگڑا ہو گیا ہے؛ نہ تم اُس کے ہاں جاتے ہو۔ نہ وہ تمہارے ہاں

آتا ہے۔ یہ سوال نہ تھا میرے دل پر ہتھوڑے کی چوٹ تھی۔ کیا جواب دیتا! سر جھکا کر چپکا ہو رہا۔ اور اس کا باعث رُوپ رانی ہے نہ وہ مجھے چاہتی۔ نہ تاج مجھ سے خفا ہوتا۔ اب اس میں میرا کیا قصور ہے؟ اس سے کئی مرتبہ کہا ہے۔ میرا خیال چھوڑ دو۔ مگر وہ کہتی ہے میرے لئے مرنا آسان ہے۔ تمہارا خیال چھوڑنا آسان نہیں۔ مَیں کہتا ہُوں مَیں غریب ماں کا بیٹا ہوں۔ وہ کہتی ہے مجھے غریب ہی چاہیئے۔ کیا کروں؟ کوئی صُورت نظر نہیں آتی۔ کوئی رستہ نہیں سُوجھتا۔ رُوپ رانی کہتی ہے بیاہ کروں گی تو تمہیں سے کروں گی۔ ورنہ ساری عمر کنواری رہ کر گزار دوں گی۔ تاج سمجھتا ہے۔ مَیں نے اُس سے رُوپ رانی چھین لی ہے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ رُوپ رانی نے مجھ سے تاج چھین لیا ہے۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے۔ رُوپ رانی سے کہہ دوں میرا تمہارا بیاہ ناممکن ہے کبھی کبھی یہ بھی سوچتا ہُوں۔ کہہ دُوں۔ میرے بیاہ کا تو مدّت ہوئی فیصلہ بھی ہو چکا ہے۔ مگر بھگوان جانے جب وہ میرے سامنے آتی ہے تو مجھے کیا ہو جاتا ہے، سارے ارادے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ مُنہ سے بات ہی نہیں نکلتی۔ بعض وقت ایسا شُبہ ہوتا ہے کہ اگر میں نے اُس سے کوئی ایسی ویسی بات کہہ دی تو وہ خودکشی کرلے گی۔ اِس خیال ہی سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مَیں جانتا ہُوں میں اس کے قابل نہیں۔ اُسے کسی امیر کبیر سے بیاہ کرنا چاہیئے۔ کیا اُس کی شکل صُورت، اس کا رنگ، اس کی بول چال، اس کی قابلیت کے شایان

ہے۔ کہ وہ میرے جیسے مُفلس کے ساتھ اپنی زندگی وابستہ کر دے۔ میرے پاس تو اس کے قابل مکان بھی نہیں ہے۔ تاج بہادر البتّہ اس کے قابل ہے۔ اس سے بیاہ کر کے وہ تخت پر جا چڑھے گی، اُسے کسی شے کی کمی نہ رہے گی۔ محلوں میں بسے گی۔ پھولوں پر سوئے گی۔ میرے جیسے آدمی اس کا پانی بھریں گے لیکن سمجھ دار ہوتے ہوئے بھی پتہ نہیں یہ سیدھی سی بات بھی اس کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی؟ آنکھیں ہیں دیکھتی نہیں ہے میں جنم کا غریب ہُوں۔ مجھ سے ایسی خوش نصیبی نہ ٹھکرائی جائے تو مَیں قابلِ معافی ہوں مگر وہ مجھے ٹھکرا سکتی ہے۔ پھر ٹھکراتی کیوں نہیں؟ ہائے بھائی تاج بہادر! تُو خوش نصیب ہو کر بھی کتنا بد نصیب ہے! امیر ہو کر بھی کس قدر غریب ہے!!

(۵)

ایک دن ہم دونوں سنیما دیکھنے گئے۔ اُس دن رُوپ رانی ایسی خوش تھی جیسے کسی دیوتا نے اُس کی سب سے بڑی خواہش پُوری کر دی ہو۔ بات بات پر مُسکراتی تھی۔ اُس کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ چاروں طرف فاتحانہ انداز سے دیکھتی تھی۔ سنیما ہال میں پہنچے تو تماشہ شروع ہونے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ مَیں نے ایک کُرسی پر ٹوپی رکھ دی۔ کُرسیوں پر ہم دونوں بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ مَیں نے چھوٹتے ہی کہا۔ آج تو بڑی خوش معلوم ہوتی ہو۔ کیا بات ہے؟

رُوپ رانی نے مُنہ کو رومال سے پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ "سنیما

دیکھنے کی خوشی ہے؟"
میں "نہیں! سچ سچ بتاؤ"
رُوپ رانی نے دروازے میں داخل ہوتے ایک لڑکے کی طرف اشارہ کر کے کہا "ارے! آج ضرور بارش ہوگی۔ شونارائن سینما دیکھنے آیا ہے۔ ہمیں اکٹھے دیکھ کر کوئلہ ہی ہو جائیگا" میں نے ایک چھچلتی ہوئی نگاہ شونارائن پر ڈالی اور پھر رُوپ رانی کی طرف مخاطب ہو گیا "تم اِدھر اُدھر کی باتیں کیوں بناتی ہو۔ بتاؤ! کیا بات ہے۔ میرے دل میں ہلچل مچی ہوئی ہے"۔
رُوپ رانی۔ (دروازے کی طرف دیکھ کر) اے لو! شریواستو بھی آگیا۔ اس کو تو تماشہ دیکھے بغیر کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ مگر سکینہ کہاں ہے؟ سکینہ کے بغیر اسے تماشہ کا لُطف کیا خاک آئیگا؟
اتنے میں شریواستو نے ہم دونوں کو دیکھ کر ہاتھ اُٹھایا اور آداب عرض کہا۔ ہم نے بھی مُسکرا کر جواب دیا۔ رُوپ رانی اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "آج اکیلا ہی ہے!"
میں نے رُوپ رانی کے پاؤں پر اپنا پاؤں رکھ کر اسے دبایا اور کہا "بتاؤ، کیا بات ہے" رُوپ رانی نے مجھے دھکیل کر اپنا پاؤں چھڑا لیا۔ اور اُسے ہاتھ سے ملتے ہوئے بولی "چلو پرے ہٹو! میرا پاؤں زخمی کر دیا۔ بعض مرد پڑھ لکھ کر بھی وحشی کے وحشی ہی رہتے ہیں"۔
میں "اور نہ بتاؤ۔ اب کے دُوسرا پاؤں زخمی کروں گا"۔

رُوپ رانی "اچھا بڑے آئے ہیں زخمی کرنے والے! شور مچا دُوں گی تو ابھی مینیجر پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دے گا۔ ساری چوکڑیاں بھول جاؤ گے"۔

میں "میں نہ دُوں گا۔ پہلے اس نے میرے چٹکی لی تھی!"

رُوپ رانی "جھوٹ بولتے ہوئے شرم نہ آئے گی"۔

میں۔ (مسکرا کر) "شرم چہ کُتی است کہ پیش مرداں بیاید"۔

رُوپ رانی۔ (کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اپنی کلائی کی گھڑی دیکھ کر بولی۔ "تو تماشہ دیکھنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ ورنہ پھر پُوچھو گے۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے اس بات کا جواب نہ دے کر پھر وہی سوال چھیڑا۔ "بتاؤ آج کیا بات ہے"، رُوپ رانی نے چھت کے برقی پنکھے کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تماشے کے بعد بتاؤں گی"۔

میں "کوئی خاص بات معلوم ہوتی ہے"۔

رُوپ رانی "سُن کر خوش ہو جاؤ گے!"

میں "ایسی بات ہے!"

رُوپ رانی "زمین سے اُچھل پڑو گے"۔

میں۔ ابھی کیوں نہیں بتاتیں۔

رُوپ رانی "ابھی بتا دُوں تو تماشے کا سارا مزہ کرکرا ہو جائے"۔

میں "تماشے کا مزا تو اب بھی کرکرا ہو گیا۔ لوگ تماشہ دیکھیں گے

ہم من کے گھوڑے دوڑائیں گے۔ اور کیا؟"

رُوپ رانی نے مجھ سے اور بھی قریب ہو کر آہستہ سے کہا:"آج تاج بہادر کا فادر آیا تھا۔ پتاجی نے صاف انکار کر دیا"۔

لفظ صاف نہ تھے مگر مطلب بالکل صاف تھا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا مگر مَیں نے پھر بھی انجان بن کر پوچھا۔"کاہے سے انکار کر دیا"؟

رُوپ رانی نے شرما کر گردن جھکالی اور دائیں ہاتھ سے اپنے ریشمی رومال کو بائیں ہاتھ پر پیٹتے ہوئے رُک رُک کر کہا:"تاج بہادر کے لئے کہتے تھے۔ پتاجی نے جواب دیا"مَیں غریب آدمی ہوں۔ آپ سے ٹکّر نہیں لے سکتا"۔ مایوس ہو کر لوٹ گئے"۔ چلو! یہ خدشہ بھی دور ہوا۔ روپے کا حملہ بُرا ہوتا ہے"۔

مَیں چُپ چاپ بیٹھا رہ گیا۔ جیسے مجھ میں ہلنے جُلنے کی طاقت ہی نہ تھی۔ لیکن میرا چہرہ کانوں تک جل رہا تھا۔

رُوپ رانی نے سلسلۂ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا:"جب تاج بہادر کا فادر چلا گیا تو پتاجی نے ماں جی سے کہا۔ رُوپ تو مہتاب رائے کو چاہتی ہے۔ تاج بہادر سے بیاہ دوں تو اس کی زندگی ہی برباد ہو جائے۔ نہ بابا مَیں روپیہ نہ دیکھوں گا۔ لڑکا شریف اور لائق ہے۔ اپنے لئے اور رُوپ رانی کے لئے بہت کما لے گا"۔

اِتنا کہہ کر رُوپ رانی چُپ چاپ ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے

سر اُٹھا کر میری طرف فاتحانہ انداز سے دیکھا۔ اور پھر بولی "کیسی خبر ہے؟ کہو!"

لیمپ بُجھ گئے۔ اور تماشہ شروع ہو گیا۔ مگر میرا دھیان تماشے کی طرف نہ تھا۔ میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔

دُوسرے دن کالج میں تاج بہادر کو دیکھا، تو میرے دل میں جیسے بھالا سا چُبھ گیا۔ حسرت و یاس کی ایسی مُنہ بولتی تصویریں میں نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ نہ وہ کھِلے ہوئے ہونٹ تھے، نہ وہ ہنستی ہوئی آنکھیں جب تک کالج میں رہا۔ اُس نے سر نہیں اُٹھایا۔ نااُمیدی نے جرأت کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اب اس میں زندگی کی ذرا سی حرکت بھی دکھائی نہ دیتی تھی۔ مجھے اس کی حالت پر بے اختیار رحم آ گیا۔ فاتح کے ہزاروں دشمن ہیں۔ مگر مفتوح سے کون سنگ دل دُشمنی کرے گا؟ میں نے فیصلہ کر لیا کہ رُوپ رانی سے دست بردار ہو جاؤں گا۔ اُس سے کہوں گا مجھے تجھ سے محبّت نہیں۔ اس سے بے رُخی اختیار کر لوں گا۔ ہار کر میرا پیچھا چھوڑ دے گی۔ جو مزہ جیت کر ہارنے میں ہے، وہ جیت کر جیتنے میں کہاں؟

(۶)

رُوپ رانی

دونوں میں کتنا فرق ہے؟ تاج بہادر میری طرف دیکھتا ہے۔ تو

مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے میری طرف کوئی شعلہ بڑھا آرہا ہے۔ جو خود بھی جلتا ہے۔ دوسروں کو بھی جلاتا ہے۔ مہتاب رائے میری طرف دیکھتا ہے۔ تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے دو آنکھیں نہیں پریم رس کے دو کٹورے بھرے ہوئے ہیں۔ ایک میں حیوانیت ہے۔ دوسرے میں روحانیت۔ ایک میں پیار ہے دوسرے میں وحشت۔ لیکن ایک بات میں تاج بہادر مہتاب رائے سے بڑھا ہوا ہے ——— اُسے روپے پیسے کی کمی نہیں۔ حالانکہ مہتاب رائے انتہا درجہ کا غریب ہے۔ بچارے کی ماں محنت مزدوری کر کے پڑھا رہی ہے۔ مگر قابلیت میں تاج بہادر مہتاب رائے کا پاسنگ بھی نہیں۔ مہتاب رائے نہ پڑھاتا تو تاج بہادر پاس بھی نہ ہو سکتا۔ اِدھر مہتاب رائے یونیورسٹی بھر میں اوّل آئے ہیں۔ اُس دن ان کا ESSAY دیکھ کر پروفیسر صاحب دنگ رہ گئے تھے۔ زبان کتنی صاف ہے خیالات کس قدر پاکیزہ ہیں اور پھر طرز تحریر! جو دیکھتا ہے تعریف کرتا ہے۔ گزشتہ مہینے کے "پنجاب ریویو" میں ان کی نظم شائع ہوئی تھی۔ جسے پڑھ کر آدمی پر خود فراموشی کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ نظم کیا تھی؟ موتیوں کی مالا تھی اور یہ انگریزی ہی کا حال نہیں۔ سبھی مضامین میں یہی حال ہے۔ بی۔اے میں پھر اوّل رہیں گے۔ عجب کیا ہے ریکارڈ توڑ دیں۔ ایسے آدمی کو جو ہاتھ سے کھو دے۔ اس سے زیادہ بدنصیب کون ہو گا؟ پتاجی نے بہت اچھا کیا۔ جو تاج بہادر کے باپ کی درخواست نامنظور کر دی۔

ورنہ میری تو زندگی ہی برباد ہو جاتی۔ روپے پیسے کا کیا ہے۔ لائق ہیں۔ خود کما لیں گے۔ اور پھر شریف کیسے ہیں سارا کالج ان کی قسم کھاتا ہے۔ سارا شہر اُن کی تعریف کرتا ہے۔ آدمی کاہے کو ہے ہیرا ہے۔ جو غریبی کی دلدل میں پڑا ہُوا بھی چمک رہا ہے۔

سُنا ہے پہلے ان میں بڑا پیار تھا۔ دُودھ پانی کی طرح رہتے تھے مگر جب سے کالج میں آئے ہیں تب سے پھٹ گئے ہیں۔ یہ تو کچھ نہیں کہتے مگر تاج بہادر ہمیشہ ان کو ذلیل کرنا چاہتا ہے۔ اُس دن کی لڑکوں سے کہہ رہا تھا۔ مَیں امداد نہ کرتا تو حضرت انٹرنس کے امتحان میں بھی نہ بیٹھ سکتے۔ داخلہ مَیں نے دیا۔ کتابیں میں نے دیں۔ کپڑے مَیں نے دیئے۔ اب مجھی سے اکڑنے چلے ہیں۔ اتنا بھی نہیں سوچتے کہ ماں محلّے کا پانی بھرتی ہے۔ اُدھر سے مَیں آ رہی تھی۔ میرے کانوں میں ان الفاظ کی بھنک پڑ گئی۔ میرا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ جی میں آیا کہ ایسی گت بناؤں کہ حضرت کو ای ٹسٹی بھول جائے۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر غصّہ پی گئی۔ صرف اسی قدر کہا۔ ان کا احسان نہیں مانتے۔ وہ آپ پر محنت نہ کرتے تو آپ بارہ سال تک بھی انٹرنس سے باہر نہ نکلتے۔ ساری کتابیں دھری کی دھری رہ جاتیں۔ جو احسان آپ پر انہوں نے کیا ہے وہ آپ سے کیا اُترے گا؟ یہ سُن کر اُس کا مُنہ ذرا سا نکل آیا۔ ابھی پرسوں کا ذکر ہے تاج بہادر نے ساری کلاس کو ٹی پارٹی دی۔ صرف ان کو مدعو نہیں کیا۔ اور وجہ یہ بنائی کہ ان میں یہ ہمت کہاں؟ کہ کسی کو کوئی

پارٹی دے سکیں۔ جو کھلا نہیں سکتا وہ کھانے کا بھی مجاز نہیں ہے۔ اور پھر طُرّہ یہ کہ الفاظ مجھے سُنا کر کہے۔ شاید اس کو یہ وہم ہوگا، کہ اِس سفلہ پن سے ان کو میری نگاہوں میں ذلیل کر دے گا حالانکہ اثر اُلٹا ہُوا۔ میری نگاہوں میں تاج بہادر اور بھی ذلیل ہو گیا۔ جو روپے پیسے پر اِس قدر غرور کرے وہ آدمی نہیں حیوان ہے۔ میرے پاس آیا۔ تو مَیں نے صاف کہہ دیا کہ مَیں تمہاری پارٹی میں شریک نہیں ہو سکتی۔ تمہیں اتنا بھی شعور نہیں۔ کہ اپنے کلاس فیلو کی اِس طرح کھُلم کھُلا توہین نہیں کرنا چاہیئے۔ دُوسرے طلبا نے بھی میری تائید کی۔ حضرت کو جواب تک نہ سُوجھا۔ انہیں ذلیل کرنے چلے تھے۔ آپ ذلیل ہو گئے۔

(۷)

لیکن چند دنوں سے دیکھتی ہوں، ان کے تیور کچھ بدلے ہوئے ہیں۔ نہ وہ پیار محبّت کی نگاہیں ہیں۔ نہ وہ شوق و سرگرمیاں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ایک دم تبدیل ہو گئے ہیں۔ آنکھیں وہی ہیں۔ نگاہیں اَور ہو گئی ہیں۔ لاکھ کہتی ہُوں، میری سمجھ کا قصُور ہے۔ مگر دل نہیں مانتا۔ اُس دن کہا تھا۔ ذرا فلاسفی کی ایک دو باتیں سمجھا دو کہنے لگے۔ پروفیسر صاحب سے کیوں نہیں پُوچھ لیتیں؟ اِس بے رُخی پر مجھے زہر چڑھ گیا۔ لیکن اُن کے لئے جیسے کچھ ہُوا ہی نہیں۔ پھر ایک دن مَیں نے کہا آج بہت اچھی فلم آئی ہے۔ چلو گے؟ بولے افسوس ہے مَیں نہ جا سکوں گا اکیلی چلی جاؤ۔ مَیں نے کہا مجھ سے اکیلے تو نہ جایا جائیگا۔ جواب دیا

تاج بہادر کو لے جاؤ- اب اس کا کیا جواب دیتی ؟ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے- لیکن اِس ظالم کو ذرا رحم نہ آیا- مگر اس سے بھی زیادہ رنج مجھے اُس دن ہُوا- جب ان کو بخار ہو گیا- اور وہ کالج نہ آ سکے- مَیں دن بھر پڑھتی رہی- شام کو ان کے گھر پہنچ گئی- دیکھا تو کھری چارپائی پر لیٹے کراہ رہے ہیں- مَیں کچھ دیر کھڑی دیکھتی رہی- اس کے بعد بیٹھ گئی- اُنہوں نے مجھے دیکھا، مگر زبان سے کچھ نہ کہا- یہ بھی نہیں کہ تم نے بڑی تکلیف کی- مَیں ہی بے شرموں کی طرح بیٹھی رہی- تھوڑی دیر بعد بولی- "اب کیا حال ہے- جی کیسا ہے ؟"

اُنہوں نے آنکھیں کھول دیں- اور آہستہ سے کہا "اچھا ہے !"

مَیں نے اپنا ہاتھ اُن کی پیشانی پر رکھ دیا "کیا دوا پی ہے ؟ اور کس ڈاکٹر کا علاج ہے ؟"

وہ "کونین کھائی ہے- کل تک اُتر جائیگا"

مَیں "دودھ پیا ہے یا نہیں"

وہ "مجھے خطرہ ہے، اگر مَیں زیادہ بولا- تو بخار بڑھ جائے گا"

میرے سینہ میں اگر کوئی چھری بھی اُتار دیتا تو مجھے اس قدر رنج نہ ہوتا- جتنا اِس بات سے ہُوا- غصہ سے بولی "مجھ سے بڑی حماقت ہوئی، تمہیں دیکھنے چلی آئی"

اُنہوں نے بے پروائی سے مُنہ دیوار کی طرف پھیر لیا- اور کہا "مَیں تمہیں بُلانے نہیں گیا تھا"

نہلے پر دہلا پڑا۔ میں جوش سے کھڑی ہو گئی۔ آنکھوں کی پلکیں بھی جلتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ بولی "اب کیا تمہارے پاس آنے کے لئے بھی مجھے تم سے اجازت لینا ہو گی"۔

انہوں نے دیوار ہی کی طرف مُنہ کئے ہوئے جواب دیا "اب اس کا جواب میں کیا دوں؟ اپنے دل سے پوچھو"۔

میں جاتے جاتے رُک گئی "میرا دل بالکل صاف ہے۔ تمہارا ہی دل بدل گیا ہے"۔

وُہ "میں غریب ہوں۔ غریبوں کے دل ہوتا ہی کہاں ہے"۔

میں "تم تو لڑتے ہو"۔

وُہ "بڑے آدمیوں سے اور کیا اُمید کی جاسکتی ہے"؟

معاً میرے دل میں خیال آیا۔ بیماری میں آدمی چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ یہ اِن کا قصور نہیں بخار کا قصور ہے۔ سارا غصّہ آنِ واحد میں رفع ہو گیا۔ میں پھر چارپائی پر بیٹھ گئی اور ان کا مُنہ اپنی طرف کرتے ہُوئے محبّت کے غصّے سے بولی "ذرا آنکھیں تو ملاؤ۔ آج تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ لڑائی مُول لیتے ہو!"

میں نے ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے دیکھے اب وہ رو رہے تھے، اور پچھتا رہے تھے۔ اور ان میں مجھ سے آنکھیں ملانے کی ہمّت نہ تھی۔ غصّے کا مقابلہ ہر کوئی کر سکتا ہے مگر محبّت کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ یہ آنسو نہ تھے۔ میری فتح کے جیتے جاگتے ثبوت تھے۔ میں انہیں دیکھ کر

باغ باغ ہوگئی +

تھوڑی دیر بعد انہوں نے میرا ہاتھ لے کر اپنے سینہ پر رکھ لیا اور پُھوٹ پُھوٹ کر رونے لگے ؟

میرے دل میں رہ رہ کر خیال آتا تھا انہیں کیا ہو گیا ہے ؟ اِس خیال نے میرا صبر و قرار چھین لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی ہرے بھرے گلزار میں کسی نے آگ لگا دی ہے +

(۸)

تاج بہادر

میرا خیال غلط نکلا۔ مَیں مہتاب رائے کو شیطان سمجھتا تھا۔ مگر وہ فرشتہ نکلا۔ مَیں نے اس کے متعلق افترا پردازیاں کیں۔ مَیں نے اسے ذلیل کیا، گالیاں دیں، اُس کے خلاف سازشیں۔ وہ مجھ سے ملنے کے لئے میرے مکان پر آیا۔ تو مَیں نے اُس سے بات چیت نہ کی۔ مگر وُہ پھر بھی میرا وہی، پُرانا دوست مہتاب رائے بنا رہا۔ جو میری یہ حرکات بد دیکھتا تھا۔ اور مُسکراتا تھا۔ مَیں نے اُس کی آنکھوں میں کبھی نفرت و حقارت کے جذبات نہیں دیکھے۔ نہ کسی سے یہ سُنا، کہ اس نے میرے متعلق کوئی توہین کے کلمے کہے ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے عہد کر رکھا ہے، کہ میری ہر ایک خطا کو ہنس کر معاف کر دے گا۔ مگر مجھے اس کی شرافت بھی کمینگی نظر آتی تھی۔ جیسے یرقان کے مریض کو ہر ایک شے زرد نظر آتی

ہے۔ جیسے بیمار کو پُرسحر نغمہ بھی بُرا لگتا ہے ؛

رُوپ رانی کی طرف سے مایوس ہو کر میں اور بھی جھنجھلا گیا۔ میں چاہتا تھا بس چلے تو مہتاب رائے کی گردن کاٹ ڈالوں۔ ایک وہ دن تھا کہ اُس کے چہرے پر ذرا سی افسردگی دیکھ کر بھی میرا دل ڈوب جاتا تھا۔ یا اب یہ حالت تھی کہ اگر کوئی اس کی موت کی خبر سُنا دیتا تو میں جی جاتا لیکن اس کی قسمت میں موت کہاں؟ میری چھاتی پر مونگ دلتا تھا ؛

شام کا وقت تھا۔ میں گومتی کے کنارے بیٹھا اپنی قسمت کی تاریکی میں روشنی کی تلاش کر رہا تھا۔ ایسے ہی جیسے وہ مریض بھی جسے سارے ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہو۔ کبھی کبھی سوچتا ہے۔ شاید میں تندرست ہو جاؤں اُمید سخت جان سانپ کی طرح ہے۔ جو کچلی جانے پر بھی تڑپتی رہتی ہے۔ ذرا سی گرمی پہنچی اور وہ ہلنے لگی۔ معاً کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا!

میں نے چونک کر سر اُٹھایا اور مُڑ کر دیکھا۔ مہتاب رائے سامنے کھڑا تھا!

مجھے حیرت ہوئی۔ میں نہیں سمجھتا تھا وہ کبھی میرے ساتھ ہم کلام ہونے کی جُرأت بھی کر سکے گا۔ میں اُسے اپنی زندگی کا سب سے بڑا دشمن تصوّر کرتا تھا۔ اور میرا خیال تھا وہ بھی مجھے ایسا ہی سمجھتا ہو گا۔ لیکن اس وقت وہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ اور اُس کے چہرے پر ذرا غُصّہ ذرا ملال نہ تھا۔ اُلٹا مُسکرا رہا تھا ؛

مَیں گھبرا گیا۔ میرے مُنہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ مُسکرانا چاہتا تھا۔ مُسکرا نہ سکتا تھا۔ بولنا چاہتا تھا بول نہ سکتا تھا مگر مہتاب رائے نے میری مُشکل کو آسان کر دیا۔ بولا "کیوں بھائی! کیا رُوٹھے ہی رہو گے؟ تم میں یہ حوصلہ ہو گا۔ مجھ میں تو یہ حوصلہ نہیں"

مَیں نے جھُوٹی ہنسی ہنس کر جواب دیا "تم کو میری پروا کیا ہے؟ رُوپ رانی سلامت رہے۔ جب تک وہ نہ تھی تب تک ہم سب کچھ تھے۔ اب ہماری کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔ سب کچھ وہی ہے!"

مہتاب رائے نے کہا "یہ تمہارا وہم ہے۔ مَیں رُوپ رانی کی خاطر تُمہیں قُربان کرنے کو کبھی تیار نہیں۔ ضرورت ہو۔ تو اس سے دست بردار ہو جاؤں؟"

مَیں "ارے بھائی! ایسی باتیں کرنے سے کیا فائدہ؟ یہ باتیں کہنے کی ہیں۔ کرنے کی نہیں"

مہتاب رائے۔ (میری طرف منت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر) "تُم مجھے ایسا ذلیل سمجھ رہے ہو!"

مَیں "یہ تو تم اپنے مُنہ سے کہو۔ مَیں نہیں کہتا۔ نہ مجھے ایسا کہنے کا حق حاصل ہے"

مہتاب رائے "آخر تم کیا چاہتے ہو؟ مَیں کیا کروں؟ کہ تم خوش ہو جاؤ؟ اتنا بتا دو"

مَیں "مَیں تو اب بھی ناراض نہیں ہُوں!"

مہتاب رائے۔ (مُسکرا کر) "سچ کہتے ہو کیا؟"
میں (چڑھ کر) "جی نہیں، جھوٹ بول رہا ہوں۔ ہریشچندر تو سارے شہر میں صرف آپ ہیں۔ باقی سب جھوٹے ہیں!"
مہتاب رائے "لو دیکھ لو! یہ خفگی نہیں تو اور کیا ہے؟"
میں۔ (بے پروائی سے) "چلو! خفگی ہی سہی۔ اپنے دل کی خواہش ہے۔ جی چاہا خوش ہو گئے۔ جی چاہا خفا ہو گئے۔ اِس سے کسی کو کیا؟"
مہتاب رائے "یہ تم کہہ سکتے ہو۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ مجھ سے تو تمہارا ناراض چہرہ نہیں دیکھا جاتا۔ تمہیں اُداس دیکھتا ہوں۔ تو میرا دل رُکنے لگتا ہے"۔
میں "بڑی مہربانی آپ کی!"
مہتاب رائے "جہاں تک میں نے غور کیا ہے۔ تمہاری خفگی کی وجہ محض رُوپ رانی ہے۔ کیا میرا خیال ٹھیک ہے؟"
میں "فرض کیا۔ ٹھیک ہے۔ پھر!"
مہتاب رائے "میں نے اُس سے کہہ دیا ہے۔ کہ مجھے اس سے محبت نہیں ہے۔ اور میرا خیال ہے۔ کہ اس سے زیادہ میں اور کچھ نہ کر سکتا تھا۔ کہو اب بھی تم خوش ہوئے یا نہیں؟"
میں ششدر رہ گیا۔ مہتاب رائے یہاں تک کہہ جانے کو تیار ہو جائیگا۔ یہ مجھے گمان بھی نہ تھا۔ قسمت اور شام کے اندھیرے میں دُور امید کا ٹمٹماتا ہُوا دیا نظر آنے لگا۔ کیا یہ امر واقعہ تھا۔ یا مجھے اب بھی

قسمت سبز باغ دکھا رہی تھی؟

مہتاب رائے نے پھر کہا" اگر تم صفائی سے کہہ دیتے، کہ تمہیں اس سے محبت ہے۔ تو یہاں تک نوبت نہ پہنچتی میں پہلے ہی ایسا طرز عمل اختیار کرتا کہ اس کی حوصلہ افزائی نہ ہوتی۔ اور خواہ مخواہ تمہاری طرف متوجہ ہو جاتی۔ مگر تم نے مجھ سے نہ کہا۔ دل میں گرہ باندھ لی "

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے وہ سُنا جو میں سُننا چاہتا تھا۔ مگر جو سُننے کی مجھے امید نہ تھی۔ خیال آیا یہ شخص کتنا بلند، کتنا نیک، کتنا عالی حوصلہ ہے۔ جو میری خاطر رُوپ رانی سے دست بردار ہو رہا ہے۔ کیا مجھ میں بھی یہ ایثار، یہ بہادری، یہ جُرأت ہے؟ میں مہتاب رائے کے مقابلہ میں بہت چھوٹا، بہت حقیر تھا۔ مگر میں پھر بھی خوش تھا جیسے کسی ڈوبتے ہوئے کو ساحل مِل جائے۔ حالانکہ مجھے بچانے والا خود بھنور میں غوطے کھا رہا تھا۔

مہتاب رائے نے مُسکرا کر اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ مگر اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ اس کے ہونٹ اُس کے اختیار میں تھے آنکھیں اختیار میں نہ تھیں۔

تھوڑی دیر بعد ہم ایک دُوسرے کے گلے سے لپٹے ہوئے سِسک سِسک کر رو رہے تھے۔ ہمارے چاروں طرف شام کا اندھیرا پھیلا ہُوا تھا۔ اور ہمارے پاؤں تلے گومتی کا پانی شاں شاں کرتا ہُوا اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھا چلا جاتا تھا۔

(۹)

مہتاب رائے نے جو کچھ کہا تھا۔ کر کے دکھا دیا۔ اب وہ رُوپ رانی سے کبھی مخاطب نہ ہوتا تھا۔ مَیں نے کئی مرتبہ دیکھا۔ کہ رُوپ رانی اُس سے بات چیت کرنے کے لئے اُس کے پاس گئی۔ مگر اُس نے مُنہ پھیر لیا۔ ایک مرتبہ مَیں نے اپنے کانوں سے سُنا۔ مہتاب رائے کہہ رہا تھا۔ تُم مجھے بدنام کرو گی۔ رُوپ رانی نے توہین وحقارت کے یہ لفظ سُنے۔ تو اُس کا چہرہ آگ کی طرح سُرخ ہو گیا۔ اُدھر مہتاب رائے کا چہرہ لاش کی طرح زرد تھا۔ مجھ پر حقیقت کا انکشاف ہو گیا۔ وہ محض میرے لئے اپنے دل پر جبر کر رہا تھا۔ ایک دفعہ مہتاب رائے نے ایک لڑکے سے چاقو مانگا۔ اُس کے قریب ہی رُوپ رانی بیٹھی تھی۔ لڑکے کے پاس چاقو نہ تھا۔ رُوپ رانی نے اپنا چاقو نکال کر مہتاب رائے کی طرف بڑھا دیا گویا صُلح کی درخواست کی۔ مہتاب رائے نے ایسا ظاہر کیا گویا اُس نے یہ دیکھا ہی نہیں۔ اور ایک دُوسرے لڑکے کی طرف چلا گیا۔ صُلح کی درخواست نامنظور ہو گئی۔ اور بے پروائی سے رُوپ رانی نے سر جھکا لیا۔ اور اُداس سی ہو گئی۔ شاید سوچتی ہو گی۔ اب میں اتنی بُری ہو گئی کہ مجھ سے چاقو بھی نہیں لیا جاتا اس کے بعد سارے دن دونوں کے چہروں پر رونق نہیں آئی۔ مَیں یہ دیکھتا تھا۔ اور کڑھتا تھا ایک آدھ مرتبہ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ گُناہ ہے۔ سوچتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ مجھے اُن کے بیچ میں کھڑا ہونے کا کیا حق

ہے ؛ کبھی کبھی جی میں آتا تھا مہتاب رائے اتنا عالی ظرف ہے کیا میں بھی اُس کی پیروی نہیں کر سکتا ؟ میرے ایثار سے دو اُجڑے ہوئے دل بس جائیں گے۔ لیکن پاکیزگی اور دانشمندی کے یہ خیالات ادھر پیدا ہوتے تھے۔ اُدھر فنا ہو جاتے تھے۔ اندھیری کالی رات میں جگنو چمکتا ہے اور غائب ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بعد پہلے سے بھی زیادہ اندھیرا چھا جاتا ہے ؛

آخر ایک دن مجھے موقعہ مل گیا۔ رات کا وقت تھا۔ میں اور رُوپ رانی دونوں کانپور سے لکھنؤ لوٹ رہے تھے سٹیشن پر مُلاقات ہو گئی۔ میرے دل کی جو حالت تھی۔ وہ میں ہی جانتا ہوں۔ خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ رُوپ رانی کے پاس جا کر بولا " ہیلو ! مس سکسینہ کدھر جا رہی ہو ؟ "

رُوپ رانی نے میری طرف مُسکرا کر دیکھا اور لیڈر کا تازہ پرچہ تہ کر کے اپنے فر کے کوٹ میں رکھتے ہوئے بولی " نگم بابو ! خُوب ملے۔ میں صبح ایک سہیلی سے ملنے آئی تھی۔ اب لکھنؤ جا رہی ہوں۔ آپ کہاں جائیں گے ؟ "

میں " ہم بھی لکھنؤ جا رہے ہیں۔ تمہارے ساتھ سفر خُوب کٹے گا " ؛

رُوپ رانی۔ (اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھ کر) " اس میں کیا شُبہ ہے تُم نہ ملتے تو مجھے گاڑی میں جاہل عورتوں کے ساتھ بیٹھنا پڑتا۔ اب تمہارے ساتھ بیٹھوں گی تو کچھ لٹریچر کی باتیں ہوں گی۔

کچھ پالیٹکس ہوگی۔ مگر آپ تو سیکنڈ کلاس میں ہوں گے۔ میرا ٹکٹ انٹر کلاس کا ہے"۔

میرا دل باغ باغ ہو گیا۔ ان دو جنتی گھنٹوں کے لئے میں اپنی بہترین چیزیں نثار کر سکتا تھا۔ بولا "آپ کے ساتھ انٹر کلاس بھی سیکنڈ کلاس بن جائے گا!"

رُوپ رانی نے میری طرف دِل کو ٹٹول لینے والی نگاہوں سے دیکھا، گویا وہ جاننا چاہتی تھی کہ میرے اِن الفاظ کے کیا معنی ہیں؟ اتنے میں انجن نے سیٹی دی اور ہم دونوں اچک کر انٹر کلاس کے ایک کمرے میں سوار ہو گئے۔ خوش قسمتی سے کمرہ بالکل خالی تھا۔ گاڑی چلنے لگی۔ میں دروازے میں کھڑا اسٹیشن کے لمپوں کی لمبی قطار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جب گاڑی پلیٹ فارم سے نکل گئی۔ تو میں نے دروازے کو بند کر دیا اور رُوپ رانی کے سامنے والی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ اُس وقت میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

رُوپ رانی اخبار دیکھ رہی تھی۔ مجھے سیٹ پر بیٹھتے دیکھ کر بولی۔ "اسمبلی کا اجلاس شروع ہو گیا"۔

میرا دھیان اسمبلی کے اجلاس کی طرف نہ تھا۔ میں چاہتا تھا بھگوان نے موقعہ دیا ہے تو فائدہ اُٹھاؤں اور رُوپ رانی کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دُوں۔ اس سے اچھا موقع اور کہاں ملے گا؟ لوگوں میں چرب زبان مشہور ہوں۔ دیکھوں اس وقت میری چرب زبانی کچھ کام دیتی ہے یا

نہیں۔ تلوار وہ جو میدانِ جنگ میں کام آئے۔ ورنہ دیکھنے اور دکھانے کے لئے تو لکڑی اور لوہے کی تلواریں دونوں برابر ہیں ؂

مگر رُوپ رانی اخبار دیکھ رہی تھی اور گاڑی کسی بدنصیب کے ہاتھ میں آ کر نکل جانے والے وقت کی طرح اُڑی چلی جا رہی تھی۔ سوچتا تھا ایسا موقعہ ساری عُمر نہ ملے گا۔ رات کا وقت ہے تنہائی ہے۔ گاڑی کا سفر ہے۔ جو چاہوں کہہ لوں اُسے سُننا پڑے گا۔ نہ خود کہیں جا سکتی ہے نہ مجھے بولنے سے روک سکتی ہے۔ لکھنؤ میں ایسا موقعہ کہاں؟ یہ میری خوش نصیبی ہے جو یہ موقعہ ہاتھ آ گیا لیکن ———— وہ اب بھی اخبار دیکھ رہی تھی۔ میں تلملا اُٹھا۔ جی چاہتا تھا۔ اخبار چھین کر کھڑکی سے باہر پھینک دُوں۔ اور اپنا دردِ دل سُنا لوں۔ کتنی سنگ دل ہے۔ ہماری زندگی اور مَوت کا سوال درپیش ہے۔ وہ اخبار پڑھ رہی ہے"

آخر میں نے اُس کی طرف جُھک کر بلند آواز سے کہا "ہم نے سوچا تھا۔ تُم سے گپ شپ لڑے گی۔ تم اخبار لے بیٹھیں"؂

رُوپ رانی نے اسی طرح اخبار پڑھتے پڑھتے بغیر میری طرف دیکھے جواب دیا "آج کا لیڈنگ آرٹیکل بڑے زور کا ہے۔ ذرا اسے ختم کر لینے دو"؂

میں "واہ ہم گونگے کا گُڑ کھائے بیٹھے ہیں۔ تُمہیں لیڈنگ آرٹیکل کی پڑی ہے۔ چھوڑ دو!"

یہ کہہ کر میں نے رُوپ رانی کے ہاتھ سے اخبار چھین کر اپنی سیٹ پر

رکھ لیا۔ اور اُس کے مُنہ کی طرف دیکھا۔ کہ میری اِس جُرأت سے ناراض تو نہیں ہو گئی ۔

رُوپ رانی نے اخبار واپس لینے کی غرض سے اپنا چھوٹا سا گورا ہاتھ بڑھایا۔ اور دُوسرے ہاتھ سے ساڑھی کو سر پر ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔ "بس ایک ہی پیراگراف باقی ہے۔ دو چار منٹ میں ختم ہو جائیگا"۔
مَیں۔ "بھئی! چلتی گاڑی میں پڑھنے سے آنکھیں خراب ہو جاتی ہیں"۔
رُوپ رانی۔ "نہیں خراب ہوتیں۔ مجھے عادت ہے۔ لاؤ"۔

مَیں نے اخبار پر اپنا دایاں ہاتھ پھیلا کر رکھ لیا اور لمپ کی طرف دیکھ کر بولا۔ "روشنی بھی بہت کم ہے۔ مَیں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ دُشمن نہیں ہوں۔ اِس وقت تمہیں اخبار وُہ دے جو تمہارا دُشمن ہو"۔
رُوپ رانی۔ "یہ تو آپ کی سراسر زیادتی ہے"۔
مَیں۔ "خیر زیادتی ہی سہی۔ مگر اس وقت اخبار نہ ملے گا"۔

رُوپ رانی نے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا لیا۔ اور اپنا سر گاڑی کی چوبی دیوار کے ساتھ لگا کر بولی۔ "بہت اچھا صاحب نہ دیجئے۔ اب آپ سے جھگڑا کون کرے؟"

اب میرے لئے میدان صاف تھا۔ چند منٹ تک چُپ رہا اور سوچتا رہا۔ کہ بات چیت کہاں سے شروع کروں۔ آخر مجھے رستہ مل گیا۔ بولا۔ "یہ مہتاب رائے کو کیا ہو گیا؟ ہر کسی سے لڑتا ہے۔ سیدھی بات بھی کرو، تو کاٹنے کو دوڑتا ہے!"

رُوپ رانی نے دِل کو چھید ڈالنے والی نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور پھر آہ سرد بھر کر بولی " معلوم ہوتا ہے وہ مہتاب رائے ہی نہیں۔ پہلے کیسا ہنس مُکھ تھا بات بات پر مُسکراتا تھا۔ بات بات پر ہنستا تھا "

مَیں " اب چوبیس گھنٹے اُداس رہتا ہے۔ نہ کسی سے ہنستا ہے نہ بولتا ہے "

رُوپ رانی " بالکل بدل گیا "

مَیں۔ (ہمدردی کے انداز سے) " کچھ بیمار تو نہیں ہے؟ ضرور بیمار ہوگا ورنہ آدمی اتنی جلدی کیسے بدل جائے۔ اُس کی اِس تبدیلی پر سارا کالج حیران ہے۔ تُم سے بول چال ہے۔ یا تم سے بھی بند ہو گئی "

رُوپ رانی کے روشن چہرے پر افسردگی کے بادل سے چھا گئے۔ کچھ دیر چُپ چاپ گاڑی کے باہر اندھیرے کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کے بعد اُس نے ایسی آہ بھری جو سینے سے نہیں پیٹ سے اُٹھتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اور کہا " مجھ سے بھی نہیں بولتے "

اب گفتگو اس مقام پر پہنچ چکی تھی۔ جو نہایت نازک تھا۔ مَیں نے ایک ایک لفظ کو تول کر کہا " ہم نے تو سُنا تھا۔ کہ آپ کے والد صاحب نے..........

اِس کے آگے میری زبان نہ کھُل سکی۔ فقرہ نامکمّل رہ گیا لیکن مفہوم نامکمّل نہ تھا۔

رُوپ رانی کے چہرے پر ملال کے آثار ظاہر ہوئے فرش کی طرف دیکھتے ہوئے بولی " مسٹر نگم! میرا خیال ہے اس بات کو یہیں ختم

کر دیا جائے"۔
مَیں "مجھے بیحد افسوس ہے کہ آپ کو اس سے تکلیف ہوئی۔ مگر......
میں یہ کہنا چاہتا ہوں .... کہ ...... اگر آپ کو......
میرا مطلب ہے اعتراض نہ ہو تو میں ...... یعنی اپنے متعلق
...... کچھ ...... دو چار الفاظ عرض کروں"۔
رُوپ رانی نے اپنی رسٹ واچ کو کلائی پر ٹھیک کیا اور کہا۔
"فرمائیے!"
مَیں "(رُک رُک کر) آپ بُرا تو نہ مانیں گی؟"
رُوپ رانی "اب اِس کے متعلّق کیا کہوں —— اگر بات
بُرا ماننے والی نہ ہو گی تو بُرا نہ مانوں گی۔ مگر معلوم ہوتا ہے
کوئی خاص بات ہے!"
مَیں "خاص بات نہ ہوتی تو اتنی معذرت کی کیا ضرورت تھی؟"
رُوپ رانی نے جواب نہ دیا۔
مَیں "میری زندگی اور مَوت کا سوال ہے!"
رُوپ رانی نے اب کے بھی جواب نہ دیا۔
مَیں "تو اجازت ہے، عرض کر دوں"۔
رُوپ رانی کا چہرہ نسوانی حیا کی سُرخی سے تمتما رہا تھا۔ کانپتے ہوئے
ہونٹوں سے اُکتاتے ہوئے لہجہ میں بولی "اب ایک مرتبہ تو عرض کر دیا
کہ فرمائیے۔ کَے مرتبہ کہوں؟

مَیں نے اپنے دل میں لمبی چوڑی تقریر تیار کر رکھی تھی۔ سوچا تھا یہاں سے شروع کروں گا۔ پھر یہ کہوں گا۔ پھر وہاں پر پہلو بدلوں گا۔ اس کے بعد اپنی بے قراری بے چینی کا حال بیان کروں گا۔ اور اُس کے بعد اُس کے پاؤں پر سر رکھ دُوں گا۔ لیکن پرماتما جانے اُس وقت مجھے کیا ہو گیا؟ میرے مُنہ سے صرف یہی چار لفظ نکلے "مَیں تمہیں چاہتا ہوں"! طالب علم جانتا سب کچھ تھا۔ مگر ممتحن کے سامنے اُس کی زبان سے ایک ہی فقرہ نکل سکا۔

یہ لفظ کہتے کہتے میری نگاہیں نیچے جُھک گئیں، اور میرے گال، میرے کان، میری آنکھیں سب جلنے لگیں۔

تھوڑی دیر بعد مَیں نے سر اُٹھا کر رُوپ رانی کی طرف دیکھا۔ وہ میرے سر کے اُوپر، چوبی دیوار کی طرف ایسے ہی بغیر کسی مطلب کے دیکھ رہی تھی۔ لیکن اُس کے خیالات جانے کہاں تھے؟

اب میں نے اپنے دِل و دماغ کی ساری قوتوں کو جمع کیا اور جو کچھ پہلے ایک فقرہ میں کہہ چکا تھا۔ اب اس کی تشریح کرنے لگا۔ مَیں سوتا ہوں تو تمہارے خواب دیکھتا ہوں۔ جاگتا ہوں تو تمہارے متعلق سوچتا ہوں۔ کالج میں تم نظر آجاتی ہو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خزانہ مل گیا

. . . .

یکایک رُوپ رانی کھڑی ہو گئی اور بولی "مجھے افسوس ہے۔ مجھے تم سے محبّت نہیں"!

میرے دل پر کسی نے ہتھوڑا مار دیا۔ بلکہ اگر کوئی ہتھوڑا مار دیتا جب بھی مجھے اتنی تکلیف نہ ہوتی۔ جتنی رُوپ رانی کے جواب سے ہوئی۔ دیکھتے دیکھتے میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ناامیدی کے غصے سے بولا۔ "کیا میں مہتاب رائے سے بھی بُرا ہوں۔ آخر اُس میں کونسی خُوبی ہے جو مجھ میں نہیں"۔

اُس وقت جوش کی حالت میں یہ لفظ بک گیا تھا۔ لیکن آج سوچتا ہوں تو مجھے خود تعجب ہوتا ہے۔ کہ اس وقت مجھے کیا ہو گیا تھا؟ کہاں میں؟ کہاں مہتاب رائے؟ زمین آسمان کا فرق تھا وہ شرافت وہ قابلیت، وہ عالی ظرفی مجھے چھو بھی نہیں گئی۔ میں اُس کے سامنے کتنا کم بضاعت، کتنا حقیر، کتنا چھوٹا ہوں؟ لیکن اس وقت میں نے کہا۔ آخر اس میں کون خوبی ہے جو مجھ میں نہیں۔

رُوپ رانی میری کم نگاہی پر مسکرا کر بولی "ان میں ایک خوبی تو یہ ہے۔ کہ وہ اس مرتبہ یونیورسٹی بھر میں اوّل رہیں گے۔ تم شاید پاس بھی نہ ہو سکو"۔

میں "یونیورسٹی بھر میں اوّل رہنا خالہ جی کا گھر نہیں ہے۔ یوں کوئی لاف زنی کرتا پھرے تو اسے کون روک سکتا ہے؟ اپنے مُنہ سے جو کچھ چاہے، کہہ لے"۔

رُوپ رانی "کہتے ہیں اوّل نہ رہا تو نام بدل دینا"۔

میں "اُس وقت بغلیں جھانکنے لگیں گے۔ آنکھیں نہ ملائیں گے"۔

روپ رانی: "یہ تمہارا وہم ہے۔ اُن کے لئے یہ ذرا بھی مشکل نہیں۔ تم میں یہ ہمت ہے؟ کہو میں اوّل رہوں گا۔"

میں: "اگر تم اُمید دلاؤ تو میں بھی جان لڑا دوں۔ اوّل رہنا کیا مشکل ہے؟"

روپ رانی نے کچھ دیر سوچ کر کہا: "چلو اگر تم یونیورسٹی میں اوّل آ جاؤ تو مجھے انکار نہ ہوگا۔"

مجھے ایسا معلوم ہُوا جیسے سرزمینِ اُمید بالکل سامنے ہے۔ جیسے ایک ہی جست میں میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔ بولا: "تمہارے والد صاحب کو تو اعتراض نہ ہوگا؟"

روپ رانی مُسکرائی: "اب میں ان کی طرف سے کیا کہہ سکتی ہوں؟ لیکن خیر! اُن کو بھی منا لوں گی۔"

مَیں: "تو لکھ لو۔ یونیورسٹی میں میرا اوّل رہنا اُسی طرح یقینی ہے جس طرح رات کے بعد دن کا آنا۔"

ڈیڑھ گھنٹے کے بعد جب گاڑی لکھنؤ پہنچی۔ تو میری دُنیا ہی بدل چکی تھی۔ اب ہر ایک شے ہنستی مُسکراتی ناچتی ہوئی نظر آتی تھی۔

(۱۰)

لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد یہ ہنسنے مُسکرانے، ناچنے والی دُنیا دُور بھاگنے لگے گی۔ کتابیں لے کر بیٹھتا تو ایک سمندر سامنے آ جاتا۔ جو میرے اور میری اُمیدوں کے درمیان حائل تھا۔ کتنا بھیانک رکتنا وسیع؛ جہاں تک نگاہ جاتی تھی پانی ہی پانی تھا۔ اُمید کی سرسبز و شاداب

زمین کبھی بہت دُور بہت فاصلے پر دکھائی دیتی تھی۔ کبھی نا اُمیدی کے بے اتھاہ سمندر میں چھُپ جاتی تھی۔ چند مہینوں کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ میرا یُونیورسٹی میں اوّل رہنا خام خیالی ہے۔ بلکہ بعض وقت تو شُبہ ہوتا تھا کہ مَیں پاس بھی نہ ہو سکوں گا۔ رُوپ رانی جانتی تھی کہ یہ نالائق ہے۔ باتیں کر سکتا ہے۔ محنت نہیں کر سکتا۔ اسی لئے اُس نے میرے رُوبرو ایسی کڑی شرط رکھ دی مَیں بھی احمق تھا جو اس کی چال کو نہ سمجھا۔ دانا لڑکی ہے۔ کیسے سلیقے سے ٹال گئی ❖

اس کے باوجود مَیں نے ہمت نہ ہاری۔ اور محنت کرتا رہا۔ کنارا دُور تھا۔ ندی گہری تھی۔ دم پھُول گیا تھا لیکن تیراک پھر بھی ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ سوچتا تھا۔ شاید بچ جاؤں۔ شاید کوئی لہر کنارے کی طرف دھکیل دے۔ شاید کوئی سہارا مل جائے۔ زندگی اُمید کے کچے تاگے کے ساتھ بندھی رہتی ہے۔ اِس امر کا اس وقت احساس ہُوا۔ چند ہی دنوں میں میری حالت تبدیل ہو گئی اب مجھے کھانے پینے کا خیال نہ تھا۔ کھیلنے کُودنے کا خیال نہ تھا۔ نہانے دھونے کا خیال نہ تھا۔ اور اتنا ہی کیوں مجھے کپڑے بدلنے کا بھی خیال نہ تھا۔ دن رات پڑھتا رہتا تھا۔ ناممکن تھا کہ اِس قدر محنت کا اثر میری صحت پر نہ پڑتا۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئیں۔ چہرہ زرد ہو گیا۔ والدین نے یہ دیکھا تو ڈر گئے۔ وہ کہتے تھے تجھے پڑھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ تیرے کھانے کو بہت ہے۔ کالج چھوڑ دے اور پہاڑ پہ چلا جا۔ لیکن میرے سر پر تو دُوسری ہی

دُھن سوار تھی۔ اپنی صحت کو روز بروز خراب ہوتے دیکھتا تھا۔ اور پھر بھی صحت کا خیال نہ کرتا تھا۔ یہاں تک کہ مجھے ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا۔ لیکن میں نے پھر بھی پروا نہ کی۔ ایسی بے خوفی، ایسی جانبازی، ایسی مستقل مزاجی سے کوئی بہادر سپاہی بھی میدانِ جنگ میں نہ اُترا ہو گا۔ اپنی موت کو دھیرے دھیرے اپنی طرف بڑھتے دیکھتا تھا۔ اور گھبراتا نہ تھا۔ بلکہ اُلٹا مُسکراتا تھا۔ جیسے وہ موت موت ہی نہ تھی۔

آخر ایک دن مہتاب رائے نے مجھے ایک باغ میں آ پکڑا اور پُوچھا۔ "یہ تم نے مرنے پر کیوں کمر باندھی ہے؟ اگر اسی طرح پڑھتے رہے تو وہ دن دُور نہیں جب تم اپنے آپ کو تپ دق کی گرفت میں پاؤ گے"۔

جب جسم کمزور ہوتا ہے تو ہم میں کسی سے آنکھیں ملانے کی قوت نہیں رہتی۔ دُوسروں کی طرف دیکھتے بھی ہیں تو ندامت سے۔ جیسے ہم نے کوئی جُرم کیا ہے۔ جیسے ہمارا کوئی راز فاش ہو گیا ہے۔ ان دنوں میری بھی یہی حالت تھی۔ میں نے جھینپ کر مہتاب رائے کی طرف دیکھا۔ اور کتاب بند کر کے کہا "تپ دق کیوں ہو جائے گا؟"

مہتاب رائے "ذرا اپنا مُنہ آئینہ میں تو دیکھو۔ ہڈیاں نکل آئی ہیں"۔

میں "واہ! میں تو سمجھتا ہوں۔ میں موٹا ہو گیا ہوں۔ کہتے ہیں ہڈیاں نکل آئی ہیں!"

مہتاب رائے "رنگ بھی زرد ہو گیا ہے۔ وہ پہلی سُرخی کہاں؟" یہ کہتے کہتے وہ میرے پاس گھاس پر بیٹھ گیا۔ اور میری کتابوں کو

اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

مَیں "اب بھی محنت نہ کروں تو اور کب کروں گا؟ امتحان تو سر پر آ گیا۔ صحت کا کیا ہے؟ آج خراب ہے۔ کل ٹھیک ہو جائے گی"۔

مہتاب رائے نے میری کتابیں اُٹھا کر ایک طرف رکھ دیں اور میرے قریب کھسک کر بولا "محنت کرو اس سے تمہیں کوئی نہیں روکتا۔ مگر بھائی اپنی صحت کا بھی تو خیال رکھو۔ جتنی محنت تم کر رہے ہو اتنی سارے کالج میں کوئی نہیں کر رہا"۔

مَیں "یہ امتحان کی بازی نہیں محبّت کی بازی ہے اوّل نہ رہا۔ تو ساری عُمر روتا رہوں گا"۔

مہتاب رائے "ارے! تو کیا یہ سچ ہے۔ سُنا میں نے بھی تھا۔ مگر یقین نہ تھا۔ میں سمجھتا تھا کسی نے گپ اُڑا دی ہے"۔

مَیں "گپ نہیں۔ امر واقع ہے بھائی! اب تو بازی لگ گئی"۔

مہتاب رائے "یہ لڑکی تمہاری جان لے کر رہے گی۔ آج جا کر اس کی ایسی خبر لیتا ہُوں کہ یاد ہی کرے گی"۔

مَیں "کیا کہو گے؟"

مہتاب رائے "اب تمہیں کیا بتاؤں کیا کہوں گا۔ ایسا پھٹکاروں گا کہ اتنا سا مُنہ نکل آئیگا۔ رونے لگے گی۔ تمہارے پاس آ کر معافی مانگے گی۔ خود کہہ دے گی۔ تم اتنی محنت نہ کرو۔ یُونیورسٹی میں اوّل رہ کر کیا بناؤ گے چھوڑ دو!"

میں نے کچھ دیر سوچا خیال آیا۔ اگر یہ ہو جائے! تو کیا کہنا۔ جان چھوٹ جائے۔ مگر پھر خیال آیا۔ اب کیا بار بار اسی سے امداد لیتا رہوں گا۔ سوئی ہوئی خودداری بیدار ہو کر بیٹھ گئی۔ آہستہ سے بولا "تمہاری ہمدردی کا شکریہ! لیکن یہ بات مجھے پسند نہیں۔ اب تو جو بازی لگ گئی لگ گئی"۔

مہتاب رائے نے آہ سرد بھر کر میری طرف دیکھا اور پھر کہا "یہ کام جتنا آسان تم نے سمجھ رکھا ہے اتنا آسان نہیں ہے"۔

میں "لیکن آخر جو اوّل رہے گا۔ وہ بھی تو آدمی ہی ہو گا۔ کوئی آسمان کا فرشتہ تو نہ ہو گا"۔

مہتاب رائے کسی گہرے خیال میں غرق ہو گیا۔ سوچتا تھا کیا ہو سکتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس کے چہرے پر چمک سی ظاہر ہوئی مسکرا کر بولا "میں بھی کیسا بیوقوف تھا جو اتنی سی بات بھی نہ سوجھی۔ لو تم اتنی محنت کرنا چھوڑ دو۔ اور اپنی صحت کا خیال کرو۔ اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ پھر بھی تم یونیورسٹی بھر میں اوّل رہ جاؤ گے!"

میرا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا "وہ کیسے"؟

مہتاب رائے "اب یہ نہ پوچھو (مذاق سے) معجزہ ہو گا کوئی دیوتا آ کر تمہیں سب کچھ بتا جائیگا۔ یا تمہارا پرچہ خود بخود لکھا جائیگا۔ تمہیں معلوم بھی نہ ہو گا۔ کہ کیا ہو گیا۔ اور تم اوّل رہ جاؤ گے"۔

میں "مذاق کر رہے ہو مجھ سے!"

مہتاب رائے "تمہارے سر کی قسم مذاق نہیں کرتا۔ تم آج سے بے فکر ہو جاؤ"

میں "اور اگر امتحان میں فیل ہو گیا تو ——"

مہتاب رائے "مجھے گولی مار دینا"

میں "میں یونیورسٹی بھر میں اوّل رہنا چاہتا ہوں۔ اتنا سوچ لو۔ یہ میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا ہے"

مہتاب رائے "پرماتما بڑا کارساز ہے۔ اس پر بھروسہ رکھو"

میں "یہ نہیں۔ صاف صاف کہو۔ کیا کروگے؟"

مہتاب رائے نے میرے کان میں کچھ کہا اور پھر ہنسا۔ مگر میں سناٹے میں آگیا۔ وہ شریف ہے۔ میں یہ جانتا تھا۔ مگر میری خاطر یہاں تک جانے کو تیار ہو جائے گا۔ اس کا مجھے گمان بھی نہ تھا۔ خودداری نے اُٹھ کر آنکھیں ملیں۔ انگڑائیاں لیں اور پھر سو گئی۔

میں نے پڑھنا لکھنا چھوڑ دیا۔ اور بے فکر ہو گیا۔ جیسے مجھے امتحان سے کوئی غرض ہی نہیں ہے جیسے مجھے پاس ہونے کی پروا ہی نہیں ہے۔ شام کے آٹھ بجے سوتا تھا۔ صبح کے نو بجے اُٹھتا تھا۔ روپ رانی میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتی تھی۔ گویا زبان حال سے کہتی تھی۔ تم ضرور اوّل رہ جاؤ گے؟ بعض وقت مجھے بھی شبہ ہوتا تھا کہ فیل ہو جاؤں گا۔ مہتاب رائے عین وقت پر دغا دے گا۔ لیکن پھر خیال آتا وہ ایسا آدمی نہیں۔ اس کے یہ سوچنا بھی اس پر ظلم کرنا ہے۔ جو کہا ہے کر کے دکھا دے گا۔

پروفیسر کہتے تھے۔ بس! بڑے طمطراق سے محنت کرنے چلے تھے۔ چار ہی دن میں جوش سرد پڑ گیا۔ اجی جناب! ہم تو پہلے ہی جانتے تھے۔ کہ یہ روگ امیروں کے بس کا نہیں۔ جن کے باپ دادا کھانے کو چھوڑ جائیں انہیں دردسری کی کیا ضرورت ہے؟ لڑکے کہتے تھے تم نے بہت اچھا کیا جو وقت پر سنبھل گئے۔ نہیں کوئی روگ سہیڑ لیتے۔ روپ رانی تو تمہیں قتل کرنے پر تُلی ہوئی تھی۔ تمہارے لئے حسین لڑکیوں کی کیا کمی ہے۔ چاہو تو درجن بھر بیاہ کر لو۔ لیکن جب نتیجہ نکلا تو سب حیران رہ گئے

——— میں یونیورسٹی بھر میں اوّل تھا۔

سارے شہر میں شور مچ گیا۔ طلبا اور پروفیسر سنتے تھے اور تعجب کرتے تھے۔ کہتے تھے یہ تو معجزہ ہو گیا۔ کوئی آکر ہم سے کہتا کہ تاج بہادر یونیورسٹی بھر میں اوّل رہا ہے۔ تو ہم اعتبار ہی نہ کرتے۔ ممتحنوں نے اس کے پرچے میں غلطی کی ہے۔ بعض کہتے صاحب یہ تو چھپے رستم نکلے۔ ہمارا خیال تھا پاس بھی نہ ہونگے۔ یہ سب سے بڑھ گئے۔ مہتاب رائے پر سب کو امیدیں تھیں۔ وہ معمولی نمبر لے کر پاس ہوا۔ بلکہ چند نمبر اور کم ہوتے تو پاس بھی نہ ہوتا۔ بعض کہتے اُسے غرور کھا گیا۔ بعض کہتے پہلے قابل ہوگا۔ مگر اب تو روپ رانی کے روپ کا شکار تھا۔ ایک کام ہو سکتا ہے یا پڑھائی یا عاشقی معشوقی۔ دونوں کام ایک ساتھ کبھی نہیں ہوتے۔ میں یہ سنتا تھا اور کڑھتا تھا۔ مجھے رہ رہ کر اُس پر رحم آ رہا تھا۔ کبھی کبھی یہ بھی خیال آتا تھا۔ کہ سارا راز کھول کر رکھ دوں۔ اور اُس کی عزت بچا لوں۔ لیکن

پھر حوصلہ پست ہو جاتا تھا۔ سارا دن مبارکباد دینے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ کالج کے سبھی پروفیسر اور طالب علم آئے لیکن رُوپ رانی اور مہتاب رائے نہ آئے۔ حالانکہ میں انہیں کے لئے بیتاب تھا۔ بارے رات کے نو بجے۔ اور میں مہتاب رائے سے ملنے کے لئے اس کے گھر کی طرف چلا۔ گرتا ہُوا، لڑکھڑاتا ہُوا قدم قدم پر ہچکچاتا ہُوا ٭

مگر وہ مکان پر نہ تھا۔ اُس کی ماں تھی وہ رو رہی تھی۔ اور رُوپ رانی اُسے چُپ کرا رہی تھی میرے پاؤں کے نیچے جیسے جلتے ہوئے کوئلے آ گئے۔ اُلٹے پاؤں لَوٹ آیا۔ اور اپنے پلنگ پر گر کر رونے لگا ٭

(۱۱)

رُوپ رانی

میرا بیاہ ہو گیا۔ مگر میں خوش نہ تھی۔ وہ مجھے چاہتے تھے۔ میرے پاؤں تلے آنکھیں بچھاتے تھے۔ مجھ سے پُوچھے بغیر کوئی کام نہ کرتے تھے۔ اُن کے گھر جا کر مجھے کسی شے کی کمی نہ رہی۔ ناممکن تھا کہ میں کوئی چیز مانگوں اور وہ مجھے مہیا نہ ہو جائے۔ ساس سُسر دونوں میری بلائیں لیتے تھے۔ کہتے تھے یہ بہو نہیں دیوی ہے۔ ایسا آرام رانیوں کو راج محل میں بھی میسّر نہ ہوگا۔ انہوں نے موٹروں کی دُکان کھول لی تھی۔ ہزاروں کی آمدنی تھی۔ مگر میں پھر بھی خوش نہ تھی مجھے اب بھی رہ رہ کر مہتاب رائے کی یاد ستاتی تھی۔ بھگوان جانے کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ کیا کرتا

ہے؟ امتحان کا نتیجہ نکلنے کے بعد اُس نے کسی کو مُنہ نہیں دکھایا۔ سوچتا ہوگا لوگ کیا کہیں گے؟ اس کی بوڑھی ماں ہر وقت روتی رہتی تھی۔

اُنہوں نے اس کے بیس روپے مہینہ باندھ دیئے تھے۔ مجھ سے کہتے یہ میرے دوست کی ماں ہے۔ اب اس کی تعریفیں کرتے نہ تھکتے تھے۔ کہتے تھے میں نے اُسے بہت دیر میں پہچانا۔ ایک دن کہنے لگے مل جائے تو اسے اپنی دُکان کا منیجر بنا دوں۔ ہو اور روپیہ مہینہ مانگے جب بھی انکار نہ کروں۔ وہ آدمی نہیں، ہیرا ہے۔ مرتا مر جائیگا۔ ایک پیسہ کی بے ایمانی نہ کرے گا۔ ایسے آدمی اس دُنیا میں کہاں؟ میں یہ سُنتی تھی اور میرے سینہ میں اک دُھواں سا اُٹھتا تھا۔ ہائے جناب رائے تم کہاں چلے گئے؟ مجھے اتنا چاہتے تھے۔ جاتے وقت ایک بات بھی نہ کی۔ صرف اس لئے کہ امتحان میں اچھے نمبر نہ لئے کبھی خیال آتا کہ اب تو بھگوان کبھی اسے میرے سامنے نہ لائے۔ ورنہ میرا دل ڈانواں ڈول ہو جائیگا۔ اسی طرح کئی سال گزر گئے۔ اور میں ایک لڑکی کی ماں بن گئی۔

صبح کا وقت تھا۔ وہ میز پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ میں لڑکی کو گود میں لئے اُن کے پاس گئی۔ اور بولی "اب اس کا کچھ نام بھی رکھا جائے گا یا نہیں؟"

اُنہوں نے ٹوسٹ کا ٹکڑا مُنہ میں ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ کوئی خوبصورت سا نام سوچو"۔

میں "اب کیا بتاؤں؟ میرا بتایا ہُوا نام تو آپ کی پسند ہی نہیں آتا۔

کتنے نام بتا چکی۔ پربھا۔ کملنی۔ تارا۔ پھول وتی۔ پریما۔ چاند رانی۔ کسم "۔

وہ۔ (چائے کا گھونٹ پی کر) "یہ سب عام نام ہیں۔ کوئی اور سوچو! کوئی نیا سا نام!"

میں نے لڑکی کے سر پر رومال باندھتے ہوئے جواب دیا "اب تمہاری بیٹی کے لئے کوئی نام آسمان سے اترے گا۔ اور کیا؟"

یہ کہہ کر میں نے بیٹی کے پھولے ہوئے گال کو تھپتھپایا اور کہا "کیوں بیٹا! تیرا نام بلی رکھ دیں؟ بلی کی طرح دیکھتی ہے۔ وہ چائے پی کر اُٹھ بیٹھے اور ٹائی کی گرہ باندھتے ہوئے بولے "اچھا نام پسند کیا تم نے بلی! کوئی پیارا سا نام سوچو"

میں۔ (مصنوعی غصے سے) "مجھے معاف کرو بابا! اب میں کوئی نام تجویز نہ کروں گی۔ تم ہی بتاؤ۔ آنکھیں بند کر کے منظور کر لوں گی"

وہ "اگر تم ہاری مان لو۔ تو ہم بتا دیں"

میں "ہاں بتائیے! دیکھوں کیسا نام ہے۔ جس کے مقابلہ میں کوئی نام پسند ہی نہیں آتا شریمان جی کو"

انہوں نے چند لمحے میری طرف دیکھا اور رک رک کر، جیسے وہ اس نام کے اثر کو دوبالا کرنا چاہتے ہوں۔ کہا "اس۔۔۔۔ کا نام مہتاب کماری رکھ دو"

میرے دل جیسے کسی نے گھونسا مار دیا۔ بولی "اس نام میں کیا خوبی

ہے؟ مجھے تو یہ نام مردانہ سا معلوم ہوتا ہے۔ نہ شیرینی نہ لوچ نہ نفاست؟"

وہ ٹائی کی گرہ باندھ کر میرے قریب آ گئے اور اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھ کر منت آمیز لہجہ میں بولے "میں مہتاب رائے کے نام پر اس کا نام مہتاب کماری رکھنا چاہتا ہوں۔ وہ میرا سب سے بڑا محسن ہے"۔

میں نے انہیں پکڑ کر میز کے پاس ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ آپ ان کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گئی اور لڑکی کو کندھے سے لگا کر بولی۔ "اس نے آپ پر کیا احسان کیا؟ کوئی بھی نہیں۔ اُلٹا آپ نے اس پر احسان کیا ہے۔ اب بھی اُس کی ماں کی پرورش کر رہے ہیں"۔

وہ "نہیں رُوپ! اُس نے مجھے زندگی دی۔ اُس نے مجھے تیرا پیار دیا۔ اُس نے مجھے عزت دی۔ مجھ میں یہ طاقت کہاں کہ اُس کا احسان اُتار سکوں"۔

میرے دل میں ایک عجیب خیال پیدا ہوا۔ میں نے اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اور کہا "زندگی، میرا پیار، عزت، یہ کیونکر؟ ذرا کھول کر کہئے!"

لیکن اب وہ پچھتا رہے تھے کہ منہ سے کیا نکل گیا۔ وہ چاہتے تھے کسی طرح میں ان سے اس کے متعلق سوال نہ کروں۔ تاکہ جس راز کو وہ چھپا چھپا کر رکھنا چاہتے تھے۔ اور جو جوش کی حالت میں ان کے سینے سے باہر نکلنے کو بے قرار ہو گیا تھا۔ وہ سینہ کے اندر ہی چھپا رہے۔ لیکن میں ماننی نہ تھی۔ کہتی تھی "بتاؤ! ورنہ آج دکان پر نہ جانے دوں گی۔

میں نے کبھی تم سے کوئی بات نہیں چھپائی۔ تم کیوں چھپاتے ہو یا کہو تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں۔ یا جو بات ہے صاف صاف کہہ دو۔ اور کیا؟ ایک طرف چلو۔ یہ نہیں کہ اِدھر بھی اور اُدھر بھی "

وہ بولے " اب تم تو ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئیں "

مَیں " مَیں تمہاری بیوی ہوں۔ اگر اُس نے تم پر احسان کیا ہے۔ تمہیں زندگی دی ہے۔ تمہاری عزّت بچائی ہے۔ تو مجھے بھی اس احسان کا شکر گزار ہونا چاہیئے۔ یا نہیں۔ آپ نہ بتائیں گے تو ممکن ہے کبھی وہ مِل جائیں اور مَیں اُن کا شکریہ بھی ادا نہ کر دوں تو وہ اپنے دِل میں کیا کہیں گے؟ یہی کہ کیسی احسان فراموش ہے۔ مَیں نے اس کے شوہر کی زندگی بچائی تھی۔ اسے اس کی پرواہ ہی نہیں ہے۔ لو اب جھٹ سے بتاؤ تمہیں بھی دیر ہو رہی ہے "

وُہ " مجھے بتانے میں اعتراض نہیں۔ لیکن مجھے خطرہ ہے کہ تم مجھ سے نفرت کرنے لگو گی "

مَیں " یہ محض تمہارا وہم ہے۔ اور کچھ نہیں "

وہ " ممکن ہے، مَیں تمہاری نگاہوں میں ہمیشہ کے لئے ذلیل ہو جاؤں "

میں " دُنیا میں ایسی کوئی بات نہیں جو تمہیں میری نگاہوں میں ذلیل کر سکے "

وہ " میرا خیال ہے، تم مجھے گالیاں دینے لگو گی "

میں " اب پہلے کاغذ لکھوا لو کہ گالیاں نہ دُوں گی۔ پھر بتاؤ "

وہ "میری خواہش تو نہ تھی۔ کہ تم کو اس راز سے آگاہ کرتا۔ لیکن جب تم نہیں مانتی تو کیا کروں۔ لو سُنو:-

(۱۲)

مَیں نے نوکر کو بُلا کر لڑکی باہر بھیج دی اور خود ہمہ تن گوش ہو کر سُننے لگی ؛

انہوں نے کُرسی کے ساتھ پیٹھ لگالی اور قیمتی سگار سُلگایا۔ اس کے بعد کش لگا کر آہستہ آہستہ بولے: " رُوپا! تمہیں یاد ہے۔ تم نے کہا تھا۔ یُونیورسٹی میں اوّل رہو۔ تو مَیں تم سے بیاہ کروں گی۔ ورنہ نہیں۔ تمہیں یہ بھی یاد ہے۔ مَیں نے تمہیں حاصل کرنے کے لئے اٹھارہ گھنٹے پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ مَیں امیر تھا۔ میری طبیعت امیرانہ تھی۔ چند ہی دنوں میں بیمار ہو گیا۔ ڈاکٹر کہتے تھے اسے تپ دق ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ والدین کہتے تھے پڑھنا چھوڑ دو۔ لیکن مجھے یہ گوارا نہ تھا۔ مَیں جانتا تھا میری موت کے دن نزدیک آ رہے ہیں۔ مجھے مرنا منظور تھا۔ لیکن بے عزّت ہو کر اور تمہاری محبت سے ہاتھ دھو کر زندہ رہنا منظور نہ تھا۔ اور یُونیورسٹی میں اوّل رہنا میرے لئے اتنا ہی مشکل تھا۔ جتنا مونٹ ایورسٹ کی چوٹی پر چڑھنا۔ اُس وقت مَوت مجھے سامنے کھڑی دکھائی دیتی تھی۔ بچاؤ کا کوئی رستہ نہ تھا چاروں طرف اندھیرا تھا ؛

ایسے نازک وقت میں مہتاب رائے آگے بڑھا۔ چھ سال گزر گئے ہیں لیکن مجھے وہ دن ابھی کل کا دن معلوم ہوتا ہے۔ مَیں کالج کے ساتھ

جو باغ ہے۔ اس میں گھاس پر بیٹھا کتابوں کے ساتھ سر پھوڑ رہا تھا۔ مہتاب رائے آکر میرے پاس بیٹھ گیا اور بولا۔ یہ خودکشی کیوں کر رہے ہو۔ مَیں نے اپنی مشکلات کا ذکر کیا۔ مَیں نے کہا مَیں یا اوّل رہوں گا۔ یا اِس کوشش میں جان دے دُونگا۔ میرا عزم سُن کر اُسے دُکھ ہُوا۔ مَیں نے اسے کالج میں ذلیل کیا تھا۔ میں نے اسے گالیاں دی تھیں۔ نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ چاہتا تھا کسی طرح میری جان بچ جائے۔ آخر اُس نے کہا پڑھنا چھوڑ دو۔ تم پھر بھی اوّل رہو گے۔ مجھے حیرت ہوئی میں سمجھ نہ سکتا تھا۔ کہ یہ کیسے ہو جائے گا لیکن اس کا طریقہ کتنا آسان، کتنا سیدھا سادہ تھا۔ مہتاب رائے نے کہا۔ میں امتحان کے پرچوں پر تمہارا نمبر لکھ دُوں گا۔ تم میرا نمبر لکھ دینا۔ میرا دل اِس تجویز کے خلاف بغاوت کرتا تھا۔ میرا ضمیر مجھے مُلامت کرتا تھا۔ لیکن میں نے تمہارے لالچ میں پھنس کر اس تجویز کو منظور کر لیا۔ اور یہ ہے وُہ راز جسے آج تک میرے اور مہتاب رائے کے سوائے دُنیا کا کوئی تیسرا آدمی نہیں جانتا تھا۔ آج اس واقعہ کو یاد کرتا ہُوں تو میرا سر شرم سے جُھک جاتا ہے اگر وُہ یہ قربانی نہ کرتا تو اُس کے لئے محبّت، عزّت، شان شوکت سب کچھ تھا۔ لیکن اُس نے میری خاطر اپنا سب کچھ قُربان کر دیا۔ سچ مچ آدمی نہ تھا۔ کوئی دیوتا تھا۔ اور مَیں اُس کے مقابلہ میں حیوان تھا۔ بلکہ حیوان سے بھی بدتر! بھگوان جانے آج وُہ کہاں ہے؟ اگر وہ مجھے مل جائے تو سر آنکھوں پر بٹھالوں۔ لیکن ایسی خوش نصیبی

کہاں ؟"

یہ کہتے کہتے اُن کی آنکھوں میں آنسو آگئے ٭

ایثار و قربانی کی یہ بے عدیل کہانی سُن کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ مَیں مہتاب رائے کو قابلیت اور شرافت میں بڑا سمجھتی تھی لیکن وہ رُوحانیت میں بھی اتنا بڑا ہوگا۔ یہ خیال نہ تھا۔ میرے دل میں اس کی محبت سوگئی تھی۔ یہ کہانی سُن کر پھر بیدار ہوگئی۔ مَیں اُس کی محبت کے لئے سٹپٹانے لگی ٭

مجھے رہ رہ کر افسوس ہوتا تھا کہ مَیں ایسے عظیم الشان آدمی کی بیوی کیوں نہ ہوئی۔ اُن کے ساتھ مجھے پھوس کے جھونپڑے میں محل کا سا آرام ملتا۔ مَیں بھوکی رہ کر بھی خوشی سے چہچہاتی، ناچتی، گاتی پھرتی ٭

(۱۳)

اب میری نگاہوں میں اپنے شوہر کی ذرا بھی توقیر نہ تھی۔ مَیں سمجھتی تھی یہ آدمی نہیں قصائی ہیں۔ بلکہ اس سے بھی بُرے ——— وہ جانوروں کو ذبح کرتا ہے۔ اِنھوں نے ایک آدمی کو قتل کیا ہے۔ اور آدمی بھی وہ جو اِن کا دوست تھا۔ انہیں چاہتا تھا۔ اِن کی خاطر سب کچھ کرتا تھا۔ وہ میرے قریب آتے تو میرا جسم کانپ جاتا تھا۔ مَیں چاہتی تھی مَیں ان سے کہیں دُور بھاگ جاؤں۔ کسی ایسی دُنیا میں جہاں یہ نہ ہوں۔ مجھے اپنے فرائض کا احساس نہ رہا ہو۔ یہ بات نہ تھی۔ مَیں اپنے دل کو سمجھایا کرتی تھی۔ لیکن دل مانتا نہ تھا۔ مَیں کہتی یہ تیرے شوہر ہیں۔ دل

کہتا۔ اس سے کیا ہوتا ہے؟ انہوں نے جو گناہ کیا ہے۔ وہ کم نہیں ہے۔ مَیں کہتی بچپن میں ہر کسی سے بھول ہو جاتی ہے۔ دل کہتا یہ بھول نہ تھی دوستی تھی۔ کاش وہ مجھے یہ واقعہ نہ سناتے تو میرے کاشانہ دل میں آگ کیوں لگتی؟ اب وہ مجھ سے معافیاں مانگتے تھے۔ معذرت کرتے تھے۔ اپنے کئے پر پچھتاتے تھے۔ گویا میرے جلتے ہوئے دل پر پانی ڈالتے تھے۔ لیکن اس پانی سے آگ بجھتی نہ تھی۔ اُلٹا اور بھڑکتی تھی بول چال بھی بند ہو گئی۔ میرا مُنہ اِدھر اُن کا مُنہ اُدھر۔ دونوں ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ ایک ہی کمرے میں سوتے تھے۔ لیکن ایک دُوسرے سے بات چیت کئے ہفتوں گزر جاتے تھے۔ کبھی بولتے بھی تو براہِ راست نہیں ایک دُوسرے کو سُنا کر۔ مَیں نے بلند آواز سے کہہ دیا کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ بعد میں شکایت ہو گی کہ نوکر بے پروا ہو گئے ہیں۔ انہوں نے مجھے سُنا کر کہہ دیا۔ یہ کمبخت ناول تو پھر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ اتنا تو دیکھنا چاہیئے کہ سیر کا وقت ہو گیا ہے۔ شوفر ہارن بجا رہا ہے۔ یہاں کوئی سُنتا ہی نہیں۔ جب وہ دُکان کو چلے جاتے تو سوچتی۔ آج آئیں گے تو بُلا لوں گی۔ آخر ایسے کب تک نبھ سکتی ہے؟ لیکن جب وہ سامنے آتے تو پھر وہی زہر چڑھ جاتا۔ جی چاہتا شکل نہ دیکھوں اَوروں کی محبت مُنہ پر جاگتی ہے۔ میری محبت پیٹھ پر جاگتی تھی۔ اُن کے بشرے سے ظاہر ہوتا تھا وہ بھی بُلانے کے خواہشمند ہیں کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی بولیں گے۔ ابھی بُلائیں گے۔ لیکن پھر پتہ نہیں کیا سوچ کر چُپ رہ جاتے۔ شاید ڈرتے تھے کہ میں بولا تو کچھ سُنا دے گی۔ وہ

مجھ سے بولتے نہ تھے۔ لیکن میرا خیال اسی طرح رکھتے تھے۔ مجھے پھل ملے ہیں یا نہیں؟ مَیں ہوا خوری کو گئی ہوں یا نہیں؟ اس کی پوری پوری خبر رکھتے تھے۔ ایک دن دو سکھیوں کے ساتھ سینما دیکھنے گئی۔ جب تماشا ختم ہُوا اور مَیں باہر نکلی تو شوفر موٹر میں نہ تھا۔ ہمیں پانچ منٹ انتظار کرنا پڑا۔ وہ ذرا چائے پینے چلا گیا تھا۔ پتہ نہیں اُنہیں کس نے بتا دیا۔ بات معمولی تھی۔ لیکن دُوسرے دن انہوں نے شوفر کو اتنا ڈانٹا کہ یاد ہی کرے گا۔ وہ منتیں کرتا تھا۔ معافی مانگتا تھا۔ کہتا تھا پھر ایسی خطا نہ ہو گی۔ مگر وہ اس کی سُنتے ہی نہ تھے۔ کہتے تھے تُو موٹر چھوڑ کر چلا کیوں گیا؟ اب وہ تیرا انتظار کیا کریں گی! ان کی دو سہیلیاں ساتھ تھیں۔ وہ کیا کہتی ہوں گی؟ یہی کہ ان کے نوکر بھی خُوب ہیں۔ یہ ہارن بجاتی ہیں وہ نہیں سیر سپاٹے کرتا پھرتا ہے۔ تیرا کیا گیا؟ ناک ہماری کٹ گئی۔ نہیں بابا! مجھے تیرے جیسے آدمیوں کی ضرورت نہیں حساب چُکتا کر واور چلتے بنو تمہیں نوکریاں بہت ہمیں نوکر بہت"۔

مَیں کمرے میں بیٹھی سُن رہی تھی۔ جب وہ یہاں تک پہنچ گئے تو مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ آنگن میں آکر بولی "چلو! بچارہ معافی مانگ رہا ہے۔ اب کے بخش دو۔ (شوفر سے) پھر تو ایسی خطا نہ کرے گا۔ کانوں کو ہاتھ لگاؤ"

شوفر نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا "بی بی جی! پھر ایسی خطا ہو جائے تو کھال اُتروا لینا"۔

مَیں نے دُوسری مرتبہ پھر سفارش کی "لو اب تم بھی بخش دو۔ آدمی ہے خدا نہیں ہے۔ اب غلطی نہ کرے گا"۔

1

انہوں نے میری طرف دیکھا مگر آنکھیں نہ ملا سکے۔ آگ بجھ گئی تھی مگر ابھی تک راکھ گرم تھی۔ بولے "اب غلطی کرے گا تو ایک منٹ میں جواب دیدونگا چلو جاؤ!" میں پھر کمرے میں لوٹ آئی شوفر باہر چلا گیا۔ تو وہ بھی کمرے میں آ گئے۔ اور بولے "میرا جی چاہتا ہے۔ اس کو کچھ انعام دے دیا جائے۔ کیوں تمہاری کیا رائے ہے؟ بولو"

میں نے حیرت سے اُن کی طرف دیکھا۔ ایک دوسرے سے بولنے میں جو پس و پیش تھا۔ وہ آہستہ آہستہ دُور ہو رہا تھا ۔

وہ پھر بولے "یہ غلطی نہ کرتا تو رُوٹھی رانی کیونکر مانتی۔ اُس نے غلطی کی۔ ہمارا کام بن گیا"

میں نے مصنوعی غُصّہ سے کہا "چلو بھاگو یہاں سے! دکان کا وقت ہو گیا ہے"

لیکن وہ میرے بالکل قریب آ گئے ۔

پہلے آگ بجھی تھی۔ اب راکھ بھی ٹھنڈی ہو گئی ۔

(۱۴)

تاج بہادر

شام کے وقت ہم موٹر میں سیر کو نکلے۔ تو ایسے خوش تھے۔ جیسے کسی مریض نے برسوں کے بعد شفا پائی ہو۔ مزے مزے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ رُوپ رانی کا چہرہ بھی چمک رہا تھا۔ بات بات پر مُسکراتی تھی۔ کل تک اسی چاند پر خفگی

اور ہلال کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ کل تک معلوم ہوتا تھا دُنیا میں ہوا گُم ہوگئی ہے۔ آج معلوم ہوتا تھا میں کسی پہاڑ کی بلند چوٹی پر آگیا ہوں۔ کل تک سر پر ایک قسم کا بوجھ سا تھا۔ آج گویا ہوا میں تیر رہا تھا۔ کتنا سبک! کتنا خوش و خُرّم!! کل کی نسبت کس قدر جوان!!!

گومتی کے قریب پہنچ کر ہم موٹر سے اُتر آئے۔ اور آہستہ آہستہ ٹہلنے لگے۔ یہ وہی مقام تھا جہاں پانچ چھ سال پیشتر مہتاب رائے نے آکر میری طرف صُلح کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ میں یہاں اکثر آیا کرتا تھا۔ یہاں آکر میری پُرانی یادداشت ہری ہو جاتی تھی۔ یہاں مجھے مہتاب رائے کی عظمت زندہ نظر آتی تھی۔ یہاں اُس نے میرے لئے محبت کی باہیں پھیلائی تھیں۔ یہاں اُس نے اپنی محبت کو دوستی پر قُربان کیا تھا +

یکایک میں چونک پڑا۔ آج وہاں اس کی خیالی نہیں حقیقی، جیتی جاگتی تصویر موجود تھی۔ وہی چہرہ، وہی آنکھیں دیکھنے کا وہی فرشتوں کا سا پیارا انداز۔ میں نے ایک لمحہ اُس کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھا۔ دُوسرے لمحہ میں دَوڑ کر اس کے سینے سے لپٹ گیا۔ اور تیسرے لمحہ میں، ہم دونوں ہنس ہنس کر رو رہے تھے، اور رو کر ہنس رہے اور رُوپ رانی پتھر کے بُت کی طرح ہمارے سامنے کھڑی ہمیں دیکھتی تھی۔ مگر مُنہ سے بولتی نہ تھی +

تھوڑی دیر بعد جب دلوں کا غُبار نکل چُکا تو، ہم اسی جگہ بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے +

سب سے پہلے میں نے شکایت کی۔ کہا "بڑے سنگ دل ہو۔ ہمیں

اطلاع بھی نہ دی اور غائب ہو گئے - ارے میرے یار! کہاں تھے؟ کیسے تھے؟ کیا کرتے تھے؟ سب کچھ بتاؤ"۔

مہتاب رائے :- (مسکرا کر) پہاڑوں کی طرف چلا گیا تھا - بڑے مزے میں تھا - سیر سپاٹے کرتا تھا"۔

رُوپ رانی :- پہاڑوں پر جا کر آدمی موٹے تازے ہوتے ہیں یا دُبلے پتلے (اُن سے مخاطب ہو کر) ذرا شکل دیکھو یہ پہاڑ سے آ رہے ہیں - اندر دُھنسی ہوئی آنکھیں، پچکے ہوئے گال - جوانی میں بڈھے ہو گئے ہیں اور پھر کہتے ہیں، پہاڑی سیر کرتا تھا"۔

مَیں :- رنگ رُوپ ہی بدل گیا - کیا بیمار رہے ہو؟"

مہتاب رائے :- "بالکل نہیں - جو پہاڑوں میں رہتے ہیں وہ بیمار نہیں ہوتے - تم اپنی کہو - تمہارا کیا حال ہے؟"

مَیں :- ہم خوب مزے میں ہیں - دیکھ لو کیسے سُرخ و سفید ہو رہے ہیں! مگر بھئی! تم تو ہمیں بالکل ہی بھول گئے؟"

رُوپ رانی نے شکوہ آمیز نگاہوں سے مہتاب رائے کی طرف دیکھا اور کہا :- ہم تو حیران تھے کہ بھلا آدمی غائب کہاں ہو گیا؟ کیا ایک خط بھی نہ لکھ سکتے تھے - دونوں پہنچ جاتے اور زبردستی کھینچ لاتے"۔

مَیں نے تائید کی :- کوئی دن ایسا نہ جاتا تھا جب یاد نہ کرتے ہوں"۔

مہتاب رائے - بھائی جان! اب تم یقین کرو یا نہ کرو مَیں بھی تمہیں ہر روز یاد کرتا تھا"۔

رُوپ رانی نے بات کاٹ کر کہا۔ "بالکل جھُوٹ!"

بات معمولی تھی مگر مجھے بیحد بُری معلوم ہوئی۔ خیال آیا رُوپ رانی کو اس طرح بڑھ بڑھ کر باتیں بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ ہم بات چیت کر رہے ہیں، سُنتی جائے +

عتاب رائے۔ "اب آپ اگر میرے متعلق ایک رائے قائم کر ہی چکے ہیں۔ تو دوسری بات ہے۔ ورنہ حقیقت وہی ہے جو میں نے عرض کر دی"+

مَیں۔ "ارے یار! تُم نے اپنی ماں کا بھی خیال نہ کیا۔ ہمارا کیا خیال کروگے؟"

رُوپ رانی کے چہرے پر ناراضی کے آثار ظاہر ہوئے۔ مگر مَیں خوش تھا کہ مَیں نے اس پر ایسی چوٹ کی جس کا اُس کے پاس جواب نہیں +

عتاب رائے۔ "مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ آپ نے اُس کے کھانے پینے کا انتظام کر دیا ہے بے فکر ہو گیا۔" میرے حملے کا کیسا شریفانہ جواب تھا۔

مَیں اپنے دل میں کٹ گیا اور شرمندہ ہو کر بولا +

مَیں۔ "اچھا اب کیا ارادہ ہے۔ یہیں رہوگے نا؟"

رُوپ رانی۔ (مُسکرا کر) "رہیں گے کیسے نہیں؟ اب انہیں جانے کون دیتا ہے؟"

مجھے یہ بات پھر چُبھی +

عتاب رائے۔ "مجھے آپ کے پاس رہنے میں خوشی ہوتی لیکن کیا عرض کروں کلکتے میں ایک سیٹھ صاحب کے لڑکے کو پڑھانے کا کام لے بیٹھا ہُوں"+

رُوپ رانی نے میری طرف دیکھا، گویا زبانِ حال سے کہا "یہ ہماری خاطر وطن چھوڑے جاتے ہیں!"

مَیں "تمہیں نوکری کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہمارے پاس چلے آؤ"

مہتاب رائے "ارے بھائی! اس طرح کب تک گزارہ ہو گا۔ تمہارے درشن ہو گئے۔ یہی غنیمت ہے۔ اب جانے دو"

مَیں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "میری موٹروں کی دُکان ہے اس کا انتظام سنبھال لو۔ مجھے اکیلے سے سارا کام نہیں ہوتا"

مہتاب رائے کچھ دیر گومتی کے پانی کی طرف دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ کیا جواب دُوں۔ آخر بولا "نہیں بھائی جان! مجھ سے یہ موٹروں کا کام نہیں ہو سکے گا۔ اس سے تو کلکتہ کی نوکری اچھی ہے۔ ایک لڑکا ہے اُسے پڑھایا اور مزے سے گھر چلے گئے"

رُوپ رانی نے ایک آہ سرد بھری ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مہتاب رائے کے جواب نے اُس کا دل توڑ دیا ہے۔ اُس کے چہرے کا رنگ دیکھ کر مجھ پر ایک نئے راز کا انکشاف ہو گیا۔

اگر یہ راز مجھ پر نہ کھلتا تو مَیں مہتاب رائے کو باندھ کر بھی رکھ لیتا۔ لیکن اب میرے دل میں اُسے روکنے کی ذرا بھی خواہش نہ تھی۔ اپنے گھر کے آنگن میں زہر کا بیج کون بو دے گا؟

مَیں نے کہا "اچھا! کوئی اپنا کام شروع کرو۔ کلکتے میں، بمبئی میں، مدراس میں"

مہتاب رائے نے میری طرف دیکھا اور پھر مُسکرا کر جواب دیا۔ "روپیہ کہاں ہے؟"

مَیں نے جیب سے فونٹین پن نکالا اور بیس ہزار کا چیک کاٹ کر اُس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "روپیہ یہ ہے!"

رُوپ رانی تو میری اِس دریا دلی پر متعجب ہُوا۔ لیکن اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ مَیں اُسے لکھنؤ سے نکالنے کے لئے اس سے بھی زیادہ روپیہ خرچ کرنے کو تیار ہوں۔

مگر مہتاب رائے نے یہ چیک بھی لوٹا دیا اور کہا۔ "بھائی جان! تمہارا شُکریہ کس زبان سے ادا کروں۔ مگر میرا دماغ کاروبار میں نہیں چلتا۔ سارا روپیہ ضائع ہو جائے گا۔"

میرا سر شرم سے جُھک گیا۔ مَیں سمجھتا تھا۔ مہتاب رائے قابلیت اور شرافت ہی کے میدان میں مجھ سے پیش پیش ہے۔ لیکن اب معلوم ہُوا۔ کہ وہ دریا دلی میں بھی مجھ سے بڑھا ہُوا ہے۔ اُسے روپے کی پرواہی نہ تھی۔ اُس کے لئے روپے میں کوئی کشش ہی نہ تھی۔ اُس کے خیال میں روپے کی کوئی قیمت ہی نہ تھی۔ بیس ہزار روپے کی رقم کم نہیں ہوتی۔ اِتنی رقم کے لئے دُنیا بڑی سے بڑی قربانی کرنے کو تیار ہو جاتی ہے۔ مَیں نے دس دس روپے کی خاطر سگے بھائیوں کو آپس میں خُون خرابہ کرتے دیکھا ہے۔ مگر مہتاب رائے کو غریب ہونے کے باوجود بیس ہزار کی رقم بھی متزلزل نہ کر سکی۔ اُس نے ہر باب میں مجھ پر فتح پائی تھی۔ اِس باب میں کیونکر ہار جاتا۔

میں اُس کی عظمت اور بزرگی کا پورے طور پر قائل ہو گیا۔ اب میرے من میں ذرا بھی پس و پیش نہ تھا۔ خیال آیا کہ یہ آدمی مرتا مر جائیگا۔ مگر کسی کی عزت پر ہاتھ نہ ڈالے گا۔ یہ اس کے لئے ناممکن ہے۔ یہ اتنا نیچے نہیں جا سکتا۔ یہ آدمی نہیں، دیوتا ہے۔ بلکہ دیوتاؤں سے بھی بڑھ کر۔ حسن و شباب کا جادو نہیں ڈگمگا سکتا ہے۔ اسے نہیں ڈگمگا سکتا۔ اس نے اپنے من کو جیت لیا ہے۔ اس نے اپنی خواہشیں باندھ لی ہیں +

میں نے کہا معلوم ہوتا ہے۔ تم مجھے ابھی تک غیر ہی سمجھ رہے ہو +

شباب رائے۔ (مسکرا کر) اس کا ایک ثبوت تو یہی ہے کہ میں کلکتے سے تمہیں ملنے کو آیا ہوں۔ اگر اپنا سمجھتے تو اتنا سوچ بچار کبھی نہ کرتے! آدمی پس و پیش غیروں سے کرتا ہے۔ اپنوں کے مُنہ سے تو نوالہ چھین کر بھی کھا جاتا ہے۔ میں نے دو باتیں کہیں۔ تم نے دونوں نامنظور کر دیں۔ اس کا مطلب کیا ہے؟ کیوں رُوپ رانی؟

رُوپ رانی کے سر سے ساڑھی کھسک گئی تھی۔ اُس نے ہاتھ سے اُسے ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ انہیں اب یہاں ہمارے پاس رہنا ہوگا۔ اور ہم ان کا کوئی عذر نہ سُنیں گے۔ کل صبح کے وقت انہیں باندھ کر موٹر میں ڈالئے اور دُکان پر لے جا کر دفتر میں بٹھا دیجئے۔ جو آدمی سیدھی طرح نہ مانے۔ اُس کا یہی علاج ہے +

میں ”لاکھ روپے کی بات کہی تم نے۔ یہی ٹھیک ہے!“

رُوپ رانی ”اور کلکتے کے اُس سیٹھ کو لکھ دیجئے۔ کہ اب یہ نہ آئیں گے۔

اپنے لڑکے کے لئے کوئی اور گھر سے بھاگا ہُوا بُدھو ڈھونڈ لیں +
مہتاب رائے۔ ارے بھائی! کہیں یہ غضب نہ کر دینا۔ یہاں سے بھی جاؤں گا۔ وہاں سے بھی جاؤں گا +
رُوپ رانی۔ اُن کو ایسا بیوقُوف اور کون ملے گا؛ دو روٹیاں کھلا دیں سارا دن مُنہ چاٹتے رہے +
مَیں۔ جبھی تو یہ چپاتی سا مُنہ نکل آیا ہے +
رُوپ رانی۔ پردیس کے دھکّے بُرے ہوتے ہیں۔ اسی لئے تو بڑوں نے کہا ہے کہ پردیس کی ایک روٹی سے دیس کی آدھی بھی!
مہتاب رائے۔ (مسکرا کر) تو اِس کا یہ مطلب ہے کہ اگر کلکتے میں سیٹھ صاحب کے ہاں سے ایک روٹی ملتی تھی۔ تو اب تمہارے ہاں سے آدھی ہی ملے گی + نہ بھائی! آدھی میں میرا پیٹ نہ بھرے گا۔ اِس سے تو پردیس کے دھکّے ہی بھلے +
مَیں۔ مگر پردیس کے دھکّے وہ کھائے۔ جسے دیس میں جگہ نہ ملے۔ تمہارے لئے تو جان بھی حاضر ہے +
مہتاب رائے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ کلکتّے میں ایسی بات کہنے والا کوئی نہ تھا۔ یہ محبّت، یہ چاہ پردیس میں کہاں؟
رُوپ رانی۔ جبھی پھر وہاں جانا چاہتے ہو؟
مَیں۔ ارے بھئی! اب اس کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ آج سے یہ ہمارا قیدی ہے +

(۱۵)

مہتاب رائے

طاقت اور رُعب کا حکم ٹالنا آسان ہے۔ مگر محبت کا حکم ٹالنا آسان نہیں۔ مجبوراً مجھے ماننا پڑا اور تاج بہادر کی نوکری کرنا پڑی۔ مجھے خیال تھا۔ تاج بہادر کی آنکھیں چار ہی دنوں میں بدل جائیں گی۔ مالک لاکھ دوست ہو پھر بھی مالک ہے۔ کون جانے کس وقت دھونس جمانے پر اُتر آئے۔ اُسے مالک بننے میں صریح فائدہ ہے۔ دوست بننے میں سراسر نقصان۔ اور کاروباری آدمی نقصان نہیں چاہتا۔ مگر تاج بہادر پہلے دوست تھا۔ پیچھے بیوپاری۔ بلکہ جہاں تک میرا اور اُس کا تعلق تھا۔ وہ سولہوں آنے دوست تھا۔ میرے مقابلہ میں بیوپار کی اُسے ذرا بھی پروا نہ تھی۔ مَیں دُکان لُٹا دیتا۔ وہ جب بھی نہ بولتا۔ کب آتا ہوں کب جاتا ہوں؟ کیا کرتا ہوں؟ اِن باتوں سے اُسے کوئی سروکار نہ تھا۔ اُس کی کوشش یہ تھی۔ کہ میرا من مَیلا نہ ہو۔ مجھے یہ خیال نہ آئے۔ کہ مَیں کسی کی نوکری کر رہا ہوں۔ اُس کی اِن باتوں نے میرا من موہ لیا۔ مَیں نوکر ہو کر بھی نوکر نہ تھا۔ وہ مالک ہو کر بھی مالک نہ تھا +

مَیں اور میری والدہ ایک صاف سُتھرے مکان میں رہتے تھے۔ اور اپنی قسمت پر خوش تھے۔ مگر کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ میرے من میں چور ہے۔ وہ چور کبھی دلیر ہو جاتا تھا۔ اور میری آنکھوں میں آ بیٹھتا

تھا۔ کبھی ڈر جاتا تھا اور میرے دل کی تہ میں جا چھپتا تھا۔ اور یہی چور روپ رانی کے پیچھے بھی لگا ہُوا تھا۔ مَیں سوچتا تھا۔ کیا یہ دو چور ہماری زندگیوں کی خوشیاں تو نہ چرا لیں گے۔ مَیں ہر وقت ہوشیار رہتا تھا۔ لیکن اگر کسی وقت ذرا بھی غافل ہو گیا۔ تو چور چوری سے نہ رُکے گا +

مگر تاج بہادر بالکل کچھ نہیں سمجھتا تھا۔ نہ میری اور رُوپ رانی کی نگاہیں پہچانتا تھا۔ ہم پر اُسے ذرا شک نہ تھا اتنا بھی نہ سوچتا تھا۔ کہ کبھی نہیں ایک دُوسرے سے پیار تھا۔ اور وہ تباہی اور پیار اب بھی جاگ سکتا ہے مَیں کوشش کرتا تھا۔ کہ رُوپ رانی کے پاس زیادہ نہ بیٹھوں۔ مگر اُسے اس کی ذرا بھی پروا نہ تھی۔ سمجھتا ہو گا۔ اب جو کچھ ہونا تھا۔ ہو چکا۔ اب کیا ہو سکتا ہے خاوند بیوی صبح کو سیر کرنے جاتے تو مجھے زبردستی گھسیٹ لے جاتے۔ سینما کا پروگرام بنتا۔ تو مَیں ساتھ جاتا۔ چھُٹی کے دن کہیں باہر گھومنے نکلتے تو مجھے ساتھ لئے بغیر نہ جاتے۔ مجھے اُن کے ساتھ جانے میں عذر ہوتا تھا۔ اُن کو مجھے ساتھ لے جانے میں عذر نہ ہوتا تھا۔ جیسے مَیں اُن کے گھر کا آدمی تھا۔ جیسے اُن کی ہر ایک خوشی میرے بغیر ادھوری رہتی تھی +

اسی طرح دن گزرتے گئے، مَیں دُکان کا کام کرتا گیا۔ روپیہ کماتا گیا۔ اُن کے اندر دھنستا گیا۔ مگر میرا دل بے چین و بیتاب تھا۔ اور یہ بیچینی و بے تابی روز بروز بڑھتی جاتی تھی +

ایک دن مَیں تاج بہادر سے ملنے گیا۔ تو تاج بہادر گھر پر نہ تھا مَیں نے

لوٹنا چاہا۔ تو رُوپ رانی روک لیا۔ مجبُوراً مجھے رُکنا پڑا۔ لیکن میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اور دونوں کان جل رہے تھے +

رُوپ رانی نے مجھے صُوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور مُسکرا کر بولی۔ آپ ہمیشہ اُن سے ملنے آتے ہیں۔ کیا مَیں کوئی نہیں ہوں؟

میرا دل اَور بھی زور زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ مَیں نے کہا۔ یہ آپ کی زبردستی ہے! مَیں صرف اُن سے نہیں آپ دونوں سے ملنے آتا ہوں۔ ہاں جب کبھی اُن سے کام ہو تو دُوسری بات ہے +

رُوپ رانی۔ مَیں نے تو ہمیشہ یہی دیکھا ہے کہ جب آپ آئے اُن سے ملنے آئے۔ مجھ سے ملنے آج تک نہیں آئے +

مَیں۔ اب مَیں اِس کا کیا جواب دُوں؟

رُوپ رانی۔ آپ کھڑے کب تک رہئے گا۔ بیٹھ جائیے نا!

یہ کہہ کر رُوپ رانی میرے سامنے کے صُوفے پر بیٹھ گئی +

مَیں بھی مرے ہوئے دل سے بیٹھ گیا۔ اور بولا۔ بات یہ ہے کہ دُوکان پر کام بہت رہتا ہے۔ ملنے مِلانے کا وقت ہی نہیں مِلتا +

رُوپ رانی۔ ایک اسسٹنٹ اَور کیوں نہیں لے لیتے +

مَیں نے مُسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ اگر مَیں نے اسسٹنٹ مانگا۔ تو بھائی صاحب مجھے بھی جواب دیدیں گے۔ کہیں گے۔ چلتے بنو!

رُوپ رانی۔ اچھّا آپ نہ کہئے مَیں کہوں گی +

مَیں - یہ اَور بھی بُرا - وہ سمجھیں گے - مَیں نے آپ سے کہلوایا ہے +

رُوپ رانی - مَیں کہہ دوں گی - آپ نے مجھ سے نہیں کہا - کہوں گی! اتنا کام اکیلے آدمی پر چھوڑ رکھا ہے - کیا اُسے مار ہی ڈالنے کا ارادہ ہے یا آپ ساتھ کام کرو - یا ایک اَور آدمی دو +

مَیں نے گھبرا کر کہا - یہ اُس سے بھی بُرا - وہ سوچیں گے - آپ کو میری اتنی فکر کیوں رہتی ہے - بات سے بات نکلتی ہے اُن کے دل میں کتنی باتیں اُٹھ کھڑی ہوں گی - ذرا دُور تک سوچیے +

رُوپ رانی - تو اِس کا یہ مطلب ہے کہ آپ کو اپنی آنکھوں سے پِستے ہُوئے دیکھوں - اور چُپ رہوں +

مَیں اور کیا؟ ایسی حالت میں آدمی کو چُپ ہی رہنا پڑتا ہے +

رُوپ رانی - چُپ رہنے کا مطلب ہے بُزدلی +

مَیں نے بات کو اُڑانے کی غرض سے کہا - بُزدلی کا مطلب ہے عقلمندی اور قُربانی +

رُوپ رانی - (سُنی اَن سُنی کر کے) اگر آپ میری جگہ ہوں - اور مَیں آپ کی جگہ ہوں - تو آپ کیا کریں؟

مَیں - کچھ بھی نہیں - جو ہو رہا ہے ہونے دوں +

رُوپ رانی نے میری طرف عجیب نگاہوں سے دیکھا اور آہ سرد بھر کر سر جُھکا لیا - مجھے ایسا معلوم ہُوا جیسے وہ کہہ رہی ہے - تم اِتنے سنگ دل ظالم ہو گئے ہو - مجھے یہ اُمید نہ تھی - مَیں چاہتا تھا - اُس کے سامنے

اپنا سینہ چیر کر رکھ دوں۔ اُس سے صاف صاف کہہ دوں۔ کہ میری زندگی کس طرح برباد ہو گئی ہے۔ اور تمہارا خیال کس طرح میری راتوں کی نیند حرام کر رہا ہے۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو روک لیا اور چلنے کو اُٹھ کھڑا ہُوا ✦

رُوپ رانی نے کہا۔ ذرا بیٹھ جائیے مجھے آپ سے ایک بات پُوچھنا ہے۔ مَیں صُوفے کے ساتھ کھڑا ہُوا تھا یہ سُن کر پھر بیٹھ گیا ✦

رُوپ رانی نے فرش کے غالیچے کی طرف دیکھتے ہوئے رُک رُک کر پُوچھا۔ کیا اب بھی آپ کو میرا خیال ہے ✦

یہ سوال نہ تھا۔ میرے من کے وجود کو پاگل بنا دینے والی شراب تھی۔ میرا جی چاہتا تھا۔ اب سب کچھ کہہ دُوں۔ لیکن مَیں نے اپنے جی کی بات جی ہی میں دبالی اور کہا۔ بالکل نہیں ✦

رُوپ رانی بولی۔ مَیں بھی یہی چاہتی ہوں۔ کہ اب آپ میرا خیال چھوڑ دیں اور کسی اچھی سی لڑکی سے بیاہ کر لیں ✦

یہ کہتے کہتے اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور آواز گلے میں اٹک گئی ✦

میں نے رسٹ واچ کی طرف دیکھا اور کہا۔ تو اب مجھے اجازت ہے؟

رُوپ رانی نے سر ہلا کر جواب دیا۔ ہاں!

مَیں کھڑا ہو گیا۔ اور ساری طاقت جمع کر کے بولا۔ اگر آپ بُرا نہ مانیں۔ تو مَیں بھی ایک بات پُوچھوں ✦

رُوپ رانی نے اُسی طرح زمین کی طرف دیکھتے ہوئے سر کے اشارہ سے

کہا۔ پُوچھئے!

میں نے پُوچھا۔ آپ کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے +

رُوپ رانی نے اُسی طرح سر ہلا کر کہا۔ نہیں!

مَیں۔ گویا آپ اِس زندگی میں خوش ہیں +

(رُوپ رانی آہستہ سے) ہاں!

مَیں۔ آپ نے میرے سینہ پر سے بوجھ اُتار دیا ہے +

(۱۶)

لیکن یہ جُھوٹ تھا۔ میرے دل پر سے بوجھ اُترا نہ تھا۔ اُلٹا بڑھ گیا تھا۔ رُوپ رانی کو ضرور میرا خیال ہے۔ اگر نہ ہوتا۔ تو وہ یہ کیوں پوچھتی۔ کہ اب آپ کو میرا خیال تو نہیں ہے۔ لیکن میں بھی احمق نکلا۔ مجھے یہ پُوچھنے کی کیا پڑی تھی۔ کہ آپ اِس زندگی میں خوش ہیں یا نہیں۔ اس کے معنی صاف تھے۔ کہ مَیں تو خوش نہیں ہوں۔ دُوسرا مطلب یہ بھی تھا۔ کہ مجھے آپ کا خیال ہے۔ اور خیال بھی کم نہیں۔ اتنا زیادہ کہ میں نے مُنہ پھاڑ کر پُوچھا اور پھر یہ بھی کہہ دیا۔ کہ میرے سینہ سے بوجھ اُتر گیا ہے۔ رُوپ رانی سب کچھ سمجھ گئی ہوگی۔ پڑھی لکھی عورت ہے ایسی بات تو اَن پڑھ عورت بھی سمجھ جاتی ہے۔ اب کیا کروں۔ یہاں رہوں یا کہیں چل دوں۔ لیکن وقت یہ ہے۔ کہ مَیں چلنے کو طیار ہوتا ہوں تو دل نہیں مانتا۔ سَو سَو بہانے بناتا ہے۔ اور روک لیتا ہے پہلے تو مَیں ایسا کمزور کبھی نہ تھا۔ جانے کیا ہو گیا ہے۔ کبھی وہ دن تھے کہ مَیں دُوسروں سے بھی نہ

ڈرتا تھا۔ آج یہ حال ہے کہ اپنے سائے سے بھی ڈرتا ہوں۔ اور بدکتا ہوں ؎

اُدھر ماں جی کہہ رہی ہیں۔ بھئی بیاہ کر لو۔ کب تک کنوارے بیٹھے رہوگے۔ ساتھ کے محلہ میں کوئی لڑکی دیکھ آئی ہیں۔ اب ہر وقت اُسی کا بکھان کرتی رہتی ہیں۔ کہتی ہیں۔ ایسی خوبصورت لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ لڑکی کیا ہے چودھویں کا چاند ہے۔ دیکھ کر بھوک مٹ جاتی ہے۔ ہاتھ لگانے سے میلی ہوتی ہے۔ بیٹا اب سوچ بچار نہ کرو۔ تم ہاں کر دو۔ تو میں بھی طیاریاں شروع کروں۔ اُس دن میں مہتاب کماری کو گھر لے گیا تھا۔ اُسے دیکھ کر اور مچل پڑیں۔ کہ اب جلدی سے بیاہ کر لے۔ تو تیرے بال بچے بھی دیکھ لوں۔ بڑھاپے میں یہ بھوک بُری! میں نے کہا۔ چند دن اور ٹھہر جاؤ۔ یہ سُن کر وہ اُداس سی ہو گئیں۔ لیکن میرا کیا قصور۔ میرا دل ہی نہیں مانتا۔ چند دن ٹالتا رہا۔ آخر ایک دن ماں جی نے الٹی میٹم دے دیا۔ کہ یا میری پسند کی لڑکی سے بیاہ کر لے یا اپنی پسند کی لڑکی بتا۔ اب کنوارہ کب تک بیٹھا رہے گا۔ پھر آہستہ سے یہ بھی کہہ دیا۔ کہ اب دیپ رانی کا خیال چھوڑ۔ اُس کا بیاہ بھی ہو گیا۔ اولاد بھی ہو گئی۔ تیری ہوتی۔ تو تیرے نام پر بیٹھی رہتی۔ مگر اُس نے تو تیرا چار دن بھی انتظار نہ کیا۔ تو کہیں مارا مارا پھر رہا تھا۔ وہ اپنا بیاہ رچا بیٹھی ؎

میرا لہو سُوکھ گیا۔ تو کیا ماں جی کو بھی خیال ہے۔ کہ میں دیپ رانی کے باعث بیاہ نہیں کرتا۔ اُس رات میری آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ کروٹیں بدلتا تھا اور زندگی کی تاریکی میں اُمید کا رستہ ڈھونڈتا تھا۔ مگر رستہ

سُوجھتا نہ تھا۔ بیاہ کروں تو مشکل نہ کروں تو مشکل امّاں جی جانتی سب کچھ ہیں سمجھتی کچھ بھی نہیں۔ اگر سمجھتیں۔ تو اِس طرح تنگ نہ کرتیں۔ اسی اُدھیڑبن میں رات کے دو بج گئے ؛

یکایک کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ مجھے تعجب ہُوا۔ اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ تو رُوپ رانی! میری حیرت اَور بھی بڑھ گئی۔ بولا۔ خیر تو ہے۔ آپ اسوقت کیسے آئیں؟

رُوپ رانی نے کرسی پر بیٹھ کر جواب دیا۔ بتاتی ہوں ؛

اِس وقت وہ ہانپ رہی تھیں ؛

مَیں نے پُوچھا۔ آپ پیدل آرہی ہیں کیا؟

رُوپ رانی نے جواب دیا۔ ہاں پیدل آرہی ہوں ؛

مَیں سمجھ گیا۔ کوئی خاص بات ہے ؛

رُوپ رانی نے کہا۔ آج میں سارے بندھن توڑ آئی ہوں۔ چلو کسی ایسی جگہ چلے چلیں۔ جہاں ہمیں کوئی بھی نہ جانتا ہو ؛

مجھے کسی نے کاٹھ مار دیا۔ مری ہوئی آواز میں بولا۔ اِس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ یہ بھی جانتی ہو؟

رُوپ رانی۔ سب جانتی ہوں۔ بیوقوف نہیں ہوں ؛

مَیں۔ بڑی بدنامی ہوگی ؛

رُوپ رانی۔ بدنامی سے تو بڑے بڑے رشی منی بھی نہیں بچے ؛

مَیں۔ اگر جانتا۔ کہ میرے آنے کا یہ نتیجہ ہوگا۔ تو اِدھر کا کبھی رُخ بھی نہ

کرتا ۔

رُوپ رانی۔ تو میں سمجھتی۔ تُم صرف کتابیں پڑھنا جانتے ہو۔ آدمی کا دل پڑھنا نہیں جانتے ۔

مَیں۔ اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد بولا۔ تاج بہادر کیا کہے گا؟

رُوپ رانی۔ جب انہوں نے تمہاری گردن پر چھری پھیری تھی اُس وقت اُنہوں نے سوچا تھا۔ کہ تم کیا کہو گے۔ جب اُنہوں نے پیسے کے زور سے مجھے خریدا تھا۔ اُس وقت اُنہوں نے سوچا تھا۔ کہ یہ کیا کہے گی۔ تم شاید یقین نہ کرو۔ مگر میرے من میں اُن کے لئے ذرا پیار نہیں ہے۔ جب اُن کا بس چلا، اُنہوں نے ہمیں دھوکا دے لیا۔ اب ہمارا بس چلا، ہم نے اُنہیں دھوکا دے لیا۔ لینا دینا برابر ہو گیا ۔

مَیں نے بے بسی سے رُوپ رانی کی طرف دیکھ کر پُوچھا کیا تاج بہادر کو بتا کر آئی ہو؟

رُوپ رانی۔ جب اُنہوں نے تمہارے پرچے پر اپنا رول نمبر لکھا تھا۔ تو کیا مجھے بتا کر لکھا تھا؟

مَیں۔ اُنہوں نے غلطی کی۔ تو اِس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ ہم بھی غلطی کریں ۔

رُوپ رانی۔ یہ غلطی نہیں ہے۔ دھوکا ہے۔ اور دھوکا بھی ایسا جس کے خیال ہی سے بھلا آدمی کانپ اُٹھے۔ تم کہو گے۔ تم نے اپنی قربانی کی۔ مَیں کہتی ہوں۔ تم اپنی قربانی کر سکتے تھے۔ مگر تمہیں میری قربانی کرنے کا

کیا حق حاصل تھا۔ میں نے تمہارے بھروسے اپنی زندگی کی شرط لگائی تھی اور تم نے دھوکے سے میری زندگی ہرا دی۔ کیا یہ پاپ نہیں ہے اپنے لئے تم دونوں نیک ہو گئے۔ میرے لئے تم دونوں جعلساز ہو +

اب وہ رو رہی تھی۔ اور کانپ رہی تھی۔ اور اُس کے آنسو اُس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔ اور میرے من کا چور میری آنکھوں میں چلا آیا تھا! مجھے اُس چور کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے کی جرأت نہ تھی +

رُوپ رانی نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ آج میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ کہ اُس آدمی کے ساتھ نہ رہوں گی جس نے مجھے چھل سے جیتا ہے اور میری زندگی کو تباہ کر دیا ہے +

اس وقت مجھے ایسا معلوم ہُوا۔ کہ وہ عورت نہیں ہے۔ زمین کی مٹی پر پھینکا ہُوا رنگین پھول ہے۔ ابھی ابھی پھول ٹہنی پر جھومتا تھا۔ اور مسکراتا تھا۔ آج زمین پر پڑا تھا اور روتا تھا۔ میں نے اُسے حریص نگاہوں سے دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ اس میں تاج بہادر کا قصور نہیں۔ تمہارا رُوپ ہی ایسا ہے۔ کہ جو دیکھے۔ پاگل ہو جائے +

رُوپ رانی کے آنسو تھم گئے۔ اُٹھ کر میرے قریب آ گئی اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر منت بھرے لہجہ میں بولی۔ بھگوان کے لئے جلدی کرو۔ کوئی آ گیا۔ تو بڑی مشکل ہو گی۔ اب میرے لئے یہاں رہنا ناممکن ہے۔ اتنے دن دل سے لڑتی رہی ہوں۔ اب نہیں لڑا جاتا +

میرے سامنے شعر و نغمہ کی ایک روشن دُنیا آ کر کھڑی ہو گئی۔ جہاں پیار مُسکراتا ہے، جوبن کھیلتا ہے۔ حُسن ناچتا ہے۔ جی میں آیا۔ اِسے کلیجہ میں بٹھا لوں۔ اور کہیں بھاگ جاؤں +

رات کا وقت تھا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ میرے سامنے وہ تھی۔ جن کا خیال مجھے رات کو بھی سونے نہ دیتا تھا۔ اُس کے سامنے مَیں تھا۔ جس کے سامنے وہ دینُ دُنیا دونوں کو ہیچ سمجھتی تھی۔ مَیں نے اُس کے خوبصورت نازنین ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ لئے۔ اور اُسے اپنی طرف کھینچا +

یکایک باہر موٹر کا ہارن بجا۔ اور ہم وہیں رُک گئے۔ مَیں نے رُوپ رانی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چُپ کی زبان میں پُوچھا کیا یہ وہی ہے؟ اور اُس نے رنگے ہاتھوں پکڑے گئے چور کی طرح سہم کر جواب دیا۔ ہاں! وہی ہے۔ ہم دونوں گھبرا گئے کیا کہیں گے۔ کیا جواب دیں گے۔ آنکھوں سے آنکھیں کیسے ملائیں گے۔ اِن سوالوں کا جواب کوئی نہ تھا۔ اتنے میں موٹر کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی ——— تو وہ اب آ رہا تھا۔ میرے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ یکایک رُوپ رانی نے میرے قریب آ کر کہا۔ گھبرانے کی کیا بات ہے۔ مَیں صاف کہہ دُوں گی۔ میرا آپ کے ہاں نباہ نہیں ہو سکتا۔ کیا کریں گے؟

مگر مجھ میں یہ جُرأت نہ تھی۔ میں نے رُوپ رانی کے مُنہ پر ہاتھ رکھ کر اُسے بولنے سے روکا۔ اور ساتھ کے کمرہ میں دھکیل دیا +

(۱۷)

تاج بہادُر

مَیں نے ایک بار دروازہ کھٹکھٹایا۔ کسی نے جواب نہ دیا۔ دُوسری بار کھٹکھٹایا۔ کسی نے جواب نہ دیا۔ تیسری بار کھٹکھٹایا۔ تو مہتاب رائے نے کھڑکی سے جھانک کر پُوچھا۔ کون ہے؟

مَیں نے جواب دیا۔ مَیں!

مہتاب رائے۔ (ذرا چونک کر) کون تاج بہادُر +

مَیں۔ ہاں مَیں!

مہتاب رائے نے آکر دروازہ کھولا۔ اور گھبرا کر پُوچھا۔ خیر تو ہے۔ اتنی رات گئے ....

مَیں نے کہا۔ خیر ہوتی۔ تو اِس وقت کیوں آتا۔ اُوپر چلو۔ سب کچھ کہتا ہوں +

مہتاب رائے نے دروازہ بند کر لیا اور میرے آگے آگے چلا اُوپر جا کر ہم دونوں کُرسیوں پر بیٹھ گئے +

مَیں۔ مجھے افسوس ہے، مَیں نے تمہاری نیند خراب کی +

مہتاب رائے۔ بالکل نہیں۔ مَیں تو (میز پر پڑی ہوئی ایک کتاب کی طرف اشارہ کرکے) ایک ناول دیکھ رہا تھا۔ اچھّا اب کہو۔ کیا بات ہے؟

میں۔ مَیں نے تو یہ سوچا ہے۔ کہ اسی وقت لڑکی کو لے کر کسی دُوسری جگہ چلا جاؤں۔ اور مشہور کر دوں کہ رُوپ رانی میرے ساتھ گئی ہے۔ چار دن بعد تُم یہ خبر اُڑا دینا۔ کہ رُوپ رانی مر گئی ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہو گا۔ کہ کسی کو معلوم نہ ہو گا۔ اپنی نگاہوں میں گروں گا۔ دُنیا کی نگاہوں میں تو نہ گروں گا۔

مہتاب رائے کسی گہرے خیال میں غرق تھا۔ سوچتے سوچتے بولا۔

"ہُوں!"

مَیں۔ بھئی میرا تو خیال ہے۔ اب اَور کوئی راستہ نہیں!

مہتاب رائے۔ اگر ایک بار اَور کوشش کی جائے تو؟

مَیں۔ بالکل بیکار! جانے کہاں ہو گی؟

مہتاب رائے۔ تم ذرا یہیں بیٹھو اور سگرٹ پیئو۔ مَیں ابھی آتا ہوں۔

مجھے تعجب ہُوا۔ مگر مہتاب رائے نے کپڑے پہنے اور باہر چلا گیا۔

ایک گھنٹہ مَیں وہیں بیٹھا رہا اور اپنے دل ہی دل میں روتا رہا۔ اور سوچتا رہا۔ کیا تھا۔ کیا ہو گیا۔ معاً ایک نوکر ایک چٹھی لے کر آیا۔ اور بولا "بابُوجی نے دی ہے"۔

مَیں نے چٹھی پڑھی۔ لکھا تھا:۔

رُوپ رانی ساتھ کے کمرے میں ہے۔ اُس پر اعتماد کرو۔ اور اُسے اپنے گھر لے جاؤ۔ اور مجھے بھُولنے کی کوشش کرو۔ اب اِس زندگی میں پھر مُلاقات نہ ہو گی رُوپ رانی اگر میری خوشی چاہتی ہے۔ تو اپنے گھر

میں خوش رہے۔ میں اور میری ماں جا رہے ہیں۔ دیس چھوٹا ہے، پردیس بڑا ہے۔ پردیس میں سبھی سما جاتے ہیں بھگوان سب کا بھلا کرے۔

میں سب کچھ سمجھ گیا۔ اِس سے پہلے ایک مرتبہ مہتاب رائے نے میری جان بچائی تھی۔ آج عزّت بچا گیا۔ ایسے شریف دوست اِس خود غرض دُنیا میں کہاں؟

میں نے اُٹھ کر ساتھ کا کمرہ کھول دیا۔ رُوپ رانی چُپ چاپ آ کر میرے پاس کھڑی ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں مہتاب رائے کی چٹھی پڑھ رہے تھے اور رو رہے تھے——— اور ہمارے چاروں طرف رات کا اندھیرا اور سنّاٹا چھایا ہُوا تھا۔

———

جب دولت آتی ہے!

(۱)

ایک غریب، تباہ حال مزدور سارا دن محنت و مشقت کرنے کے بعد شام کے وقت دو آنے کے پیسے اپنی چادر کے کونے میں باندھ کر شہر سے نکلا۔ اور مزدوروں کی بستی کی طرف روانہ ہُوا۔ دُور، فاصلے پر اُس نے اپنے جھونپڑے کے دھوئیں کو آسمان پر چکّر کاٹتے ہوئے دیکھا۔ اور آن واحد میں سمجھ گیا کہ ماں میرے لئے کھانا پکا رہی ہے ÷

وہ ننگے پاؤں، ننگے سر جا رہا تھا۔ اُس کے گھر میں سوائے اس کی بُوڑھی، کمزور ماں کے اور کوئی نہ تھا۔ لیکن وہ پھر بھی خوش تھا۔ اُس کی چادر کے کونے میں دو آنے کے پیسے تھے ÷

سامنے سے ایک بارات آ رہی تھی۔ مزدور نے اُسے دیکھا۔ اور مستقبل میں اپنی شادی کا تصوّر کیا اور سڑک پر تن کر چلتا رہا۔ اور شادی کا ایک گیت گاتا رہا ÷

بارات کے آگے چلنے والے مُلازموں نے اُس سے کہا "سڑک کے ایک طرف ہو جاؤ"۔ لیکن اُس نے جواب دیا "کیوں۔ سڑک صرف

تمہارے لئے نہیں بنی ہے۔ اِس پر چلنے کا حق مجھے بھی حاصل ہے"۔
بارات کے آگے آگے چلنے والے مُلازموں نے اُسے پکڑ کر اُس کی چادر اُتار لی اور اُسے اُٹھا کر سڑک کے کنارے جھاڑیوں پر پھینک دیا۔
بارات گزر گئی۔ اُس کے باجوں کا شور آہستہ آہستہ دُور ہو کر شہر کی روشنی میں تحلیل ہو گیا۔
مزدُور کا جسم لہو لہان ہو گیا تھا۔ اُس کی چادر اور چادر کے کونے میں بندھے ہوئے دو آنے کے پیسے چھن چکے تھے۔ اُس کا دل مجروح تھا اُس کے چاروں طرف رات کا سناٹا اور یاس کا اندھیرا تھا۔ وہ زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اشکبار آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھا کر بولا:۔
"اے خدا! ہمارے پاس نہ روپیہ پیسہ ہے نہ عالیشان مکان۔ نہ خوبصورت بیویاں۔ نہ خدمتگار۔ پھر تُو نے ہمیں کیوں پیدا کیا ہے؟ کیا صرف اِس لئے کہ امیروں کے لوگ آئیں اور ہمیں اُٹھا کر سڑک کے ایک طرف پھینک دیں۔ آخر دُنیا کو ہماری کیا ضرورت ہے؟"

(۲)

کئی سال بیت گئے۔
مزدُور نے دن رات محنت کی جسم کا آرام فروخت کیا۔ شطرنج کی سی چالیں چلیں۔ فریب، مکر دھوکے سے روپیہ کمایا اور امیر بن گیا۔
اب وہ مزدُور نہ تھا۔ اُس کے صندوقوں میں روپے اور اشرفیاں تھیں۔ اُس کے رہنے کو عالیشان مکان تھے۔ کام کاج کو نوکر تھے۔

ایک دن وہ شام کے وقت ہاتھی پر سوار اپنے مکان کو لوٹ رہا تھا۔ کہ اُس کا ہاتھی یکایک رُک گیا۔ اُس نے پُوچھا "کیا ہے؟"

"حضور مزدُوروں کی بارات آ رہی ہے"۔

"ڈنڈے مار کر بھگا دو پاجیوں کو اُن کو کیا حق حاصل ہے کہ سڑک کو روک کر ہم لوگوں کو تکلیف دیں"۔

ڈنڈے برسنے لگے۔ مزدُور چیخیں مار کر اِدھر اُدھر بھاگنے لگے اُن کی کرخت آوازوں سے امیر کی طبیعت خراب ہو گئی۔ اس نے کہا "مجھے ہاتھی سے اُتار دو"۔

خدمتگاروں نے سڑک کے کنارے غالیچے بچھا دیئے اور اپنے آقا کو آرام سے بٹھا دیا۔

اُس کا جسم اپنے امیرانہ لباس میں گرم تھا۔ اُس سے کچھ فاصلہ پر اُس کے فرمانبردار مُلازم ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ شہر میں اُس کے عالیشان محل کا آہنی دروازہ اِس کے لئے کھُلا تھا۔

وہ اپنے غالیچہ پر بیٹھ گیا اور اپنی نشہ دولت میں مخمور آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھا کر بولا:-

"اے خدا! ان غریب مزدُوروں کے پاس نہ روپیہ پیسہ ہے نہ خوبصورت بیویاں، نہ خدمتگار۔ پھر تُو نے انہیں کیوں پیدا کیا ہے؟ کیا صرف اِس لئے کہ یہ امیروں کے جلوس کے رستے میں آ کھڑے ہوں اور اُن کا قیمتی وقت ضائع کریں ——— آخر دُنیا کو ان کی کیا ضرورت ہے؟

کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ

(۱)

لالہ سرجن مل تھکے ہوئے اپنے ڈرائنگ روم میں آئے۔ اور صوفہ پر بیٹھ کر سستانے لگے۔ حقہ پیتے جاتے تھے! اور سامنے دیوار کے ساتھ لٹکی ہوئی اپنی بیٹی اوشا دیوی کی تصویر دیکھتے جاتے تھے۔ اسے دیکھ کر ان کے بحرِ دل میں مسرت و انبساط کی ایک لہر سی اُٹھتی ہوئی معلوم ہوئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا۔ جیسے اِس لہر کے اُوپر ایک کالی سی گھٹا چھا رہی ہے۔ خوشی یہ تھی۔ کہ بیٹی کا بیاہ ہو رہا ہے اپنے گھر جائے گی۔ انہوں نے اپنے کئی متموّل دوستوں کی تعلیم یافتہ اور حسین لڑکیوں کا بیاہ معمولی لڑکوں کے ساتھ ہوتے دیکھا تھا اور حسرت و افسوس کی سرد آہیں بھری تھیں۔ والدین مانتے تھے کہ وہ بر اُن کی لڑکیوں کے اہل نہیں۔ مگر کچھ نہ کر سکتے تھے۔ جوان لڑکیاں گھر میں کب تک بٹھا رکھیں؟ لیکن لالہ سرجن مل نے گہرا ہاتھ مارا تھا۔ انہوں نے جو لڑکا اوشا دیوی کے لئے پسند کیا تھا وہ ہر لحاظ سے اس کے قابل تھا۔ تندرست۔ خوبصورت۔ تعلیم یافتہ۔ عالی خاندان۔

حال ہی میں ولایت سے لوٹا تھا اور آتے ہی باپ کے اثر و رسوخ سے معقول مشاہرہ پر مُلازم ہو گیا تھا۔ لالہ سرجن مل کے لڑکے کے باپ سے دیرینہ تعلقات تھے۔ ورنہ ایسے لڑکے کہاں ملتے ہیں۔ جو سُنتا تھا۔ کہتا تھا۔ صاحب! آپ کی بیٹی کے ستارے زبردست ہیں۔ جو ایسا بَر مل گیا۔ اس میں خُوبیاں سبھی ہیں۔ عیب ایک بھی نہیں۔ لڑکی ساری عُمر راج کرے گی۔ لالہ سرجن مل کو اطمینان تھا۔ کہ پڑھا لکھا بَر ہے لڑکی کی عُمر خراب نہیں ہو گی۔ لیکن رنج اِس بات کا تھا کہ بیٹی کے جُدا ہونے کی ساعت آ گئی۔ آج تک اپنی تھی۔ آج پرائی ہو جائے گی۔ آج تک گھر کا تمام و کمال اسی کے ہاتھ سونپ رکھا تھا۔ جو چاہتی تھی۔ کرتی تھی۔ اور جو کہتی تھی ہوتا تھا۔ ناممکن تھا جو اس کے کام میں کوئی دخل دے جائے۔ ایک مرتبہ ماں نے بیٹی کی کوئی بات ٹال دی تھی۔ تو اس نے رو رو کر آنکھیں سُجا لی تھیں۔ اور لالہ سرجن مل نے اسے بڑے جتنوں سے منایا تھا۔ اور آج —— وہ اِس گھر کو سدا کے لئے چھوڑ کر اپنا نیا گھر بسانے جا رہی ہے۔ لالہ سرجن مل کی آنکھوں میں پگھلا ہُوا پیار لہرانے لگا۔ آج ان کے گھر سے بیٹی نہیں جا رہی۔ ان کے گھر کی رونق اور روشنی جا رہی ہے۔ ان کے آنگن کی بہار اور برکت جا رہی ہے جس کو انہوں نے بھگوان سے مانگ کر لیا تھا۔ جس کو انہوں نے پیار سے سینچا تھا جس پر انہوں نے جان چھڑکی تھی ÷

(۲)

معاً اُن کی بیوی جمنا آ کر ان کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اور ہانپتے

ہوئے بولی "دینا ناتھ آپ سے ملنے آیا" سرجن مل ذرا نہ سمجھے۔ کون دینا ناتھ آیا ہے؟ انہوں نے بے پروائی سے حقے کا دھواں ہوا میں چھوڑا اور پوچھا "کون دینا ناتھ؟" جمنا نے بے بسی کے انداز سے جواب دیا "اب یہ بھی پوچھنے کی بات ہے۔ یہ دیکھ لیجئے"۔ یہ کہتے کہتے اس نے نوارڈ کے نام کا کارڈ شوہر کے ہاتھ میں دے دیا۔ اور خود پاس رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی ÷

لالہ سرجن مل نے کارڈ دیکھا۔ تو ذرا چونکے۔ اور حقہ کی نے پرے ہٹا کر بولے "اس کے کیا معنی؟ یہ تو اپنا دینا ناتھ آ گیا۔ مگر بیاہ سے پہلے وہ میرے گھر میں کیونکر آ سکتا ہے؟"

جمنا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "کیا کہوں۔ مجھے تو کچھ اور ہی شبہ ہو رہا ہے!"

لالہ سرجن مل اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اور باہر جاتے جاتے بولے۔ "تم تو ذرا ذرا سی بات میں گھبرا جاتی ہو۔ اتنا بھی نہیں سمجھتی کہ آجکل کے لڑکے اپنی ریت رسمیں نہیں جانتے۔ ولایت سے آیا ہے۔ سمجھتا ہو گا یہاں بھی ویسی ہی آزادی ہے۔ ملنے کے لئے چلا آیا۔ اور کیا؟ اس کی بلا جانے کہ یہاں بیاہ سے پہلے سسرال میں جانا معیوب سمجھا جاتا ہے"÷

یہ کہہ کر وہ لپکے ہوئے باہر آئے۔ دروازے پر دینا ناتھ کھڑا تھا۔ لالہ سرجن مل کو دیکھتے ہی اس نے سر سے اپنی انگریزی ٹوپی اُتاری

اور ہاتھ باندھ کر نمستے کی ۔

سرجن مل نے نمستے کا جواب دے کر اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا اور آہستہ سے کہا ”برخوردار۔ کیا کروں! سماج کے قاعدے مجھے اجازت نہیں دیتے کہ بیاہ سے پہلے تمہیں گھر کے اندر لے چلوں۔ اِس لئے مَیں ہی باہر چلا آیا ہوں۔ کہو کیسے آئے؟ کوئی خاص بات تو نہیں ہے؟“

دینا ناتھ نے جیب سے ریشمی رومال نکال کر مُنہ پونچھا اور ہچکچاتے ہوئے جواب دیا ”بات تو خاص ہی ہے۔ ورنہ مَیں آپ کو تکلیف نہ دیتا۔ ویسے بات معمولی ہے۔ کم از کم مَیں تو اسے معمولی ہی سمجھتا ہوں ۔

سرجن مل قدرے فکرمند ہو گئے ”تو بھئی! جلدی کہہ ڈالو مجھے وحشت ہوتی ہے“۔

دینا ناتھ کچھ دیر چُپ چاپ کھڑا رہا۔ وہ سوچتا تھا۔ یہ تو بالکل پُرانے خیال کے آدمی نکلے۔ ورنہ اتنا بھی کیا تھا کہ مجھے گھر کے اندر لے جاتے ہوئے بھی گھبراتے۔ گویا اس وقت مَیں شیر بھیڑیا ہوں۔ دو گھڑی کے بعد آدمی بن جاؤں گا۔ دُنیا سینکڑوں اور ہزاروں کوس آگے نکل گئی۔ یہ ابھی تک وہیں پڑے کروٹیں بدل رہے ہیں۔ وہ سمجھتا تھا سُسر بڑا آدمی ہے۔ ہزار روپیہ تنخواہ پاتا ہے۔ انگریزی لباس پہنتا ہے۔ صاحب لوگوں سے ملتا ہے۔ ضرور آزاد خیال ہو گا لیکن یہاں آیا تو ایک ہی بات نے ساری اُمید تہ کر کے رکھ دی۔ دینا ناتھ جو کہنا چاہتا تھا، وہ حلق میں اٹکتا ہُوا۔ زبان پر رُکتا ہُوا۔ ہونٹوں پر جمتا ہُوا معلوم ہُوا۔

سرجن لال نے پھر کہا "معلوم ہوتا ہے۔ کوئی ایسی بات ہے جسے کہتے ہوئے بھی ہچکچاتے ہو۔ لیکن بیٹا! جب یہاں تک چلے آئے ہو۔ تو اب کہہ بھی ڈالو۔ تم پس و پیش کرتے ہو۔ میرے دل میں ہول اُٹھتا ہے"۔

دینا ناتھ نے رُک رُک کر جواب دیا "میں لڑکی دیکھنے آیا ہوں"۔

سرجن لال کے سر پر جیسے کسی نے کلہاڑا مار دیا۔ دو منٹ تک تو ان کے مُنہ سے بات ہی نہ نکل سکی۔ وہ دیوار سے ایک فٹ کے فاصلہ پر کھڑے تھے یہ سُن کر دیوار کے ساتھ لگ گئے۔ گویا اب ان میں کھڑا رہنے کی بھی طاقت نہ تھی۔ چہرے پر ہوائیاں اِس طرح اُڑ رہی تھیں۔ جیسے ابھی زمین پر گر پڑیں گے۔

دینا ناتھ نے زخم پر مرہم لگاتے ہوئے کہا "میں نے لڑکی کی بے حد تعریف سُنی ہے۔ میری بھابی کہتی ہے۔ ایسی بہو ہمارے گھر میں آج تک نہیں آئی۔ بابو جی بھی اس کی تعریف کرتے نہیں تھکتے۔ لیکن پھر بھی آپ جانتے ہیں۔ اپنی اپنی آنکھ ہے۔ اپنی اپنی پسند ہے کل کو اگر نہ بنے تو دونوں کی زندگی برباد ہو جائے۔ ایسی مثالیں ہمارے شہر میں سینکڑوں ہیں۔ اِدھر لڑکے اپنی قسمت کو رو رہے ہیں۔ اُدھر لڑکیاں اپنے باپ کے گھر بیٹھی ہیں۔ اِس لئے میرا تو یہی خیال ہے کہ آدمی پہلے سوچ لے تاکہ بعد میں پچھتانا نہ پڑے۔ اور اس میں کوئی حرج بھی تو نہیں۔ حرج جب تھا۔ جب پردہ تھا۔ اور اب پردہ کہاں؟ آپ کے ہاں بھی تو نہیں"۔

سرجن لال نے اپنے دل و دماغ کی بکھری ہوئی قوتوں کو جمع کیا اور

بولے "تم آج تک کہاں سوئے ہوئے تھے؟ اگر پہلے کہتے تو مجھے ذرا بھی عُذر نہ ہوتا اسی وقت دکھا دیتا۔ لیکن اب تو ساعت بھی مقرر ہو گئی۔ برات بھی آ گئی۔ سارے انتظام بھی مکمّل ہو چکے۔ اِس وقت تین بجے ہیں آٹھ بجے بیاہ کی لگن ہے۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟ فرض کیا میں نے تمہیں لڑکی دکھا دی اور تم نے اسے ناپسند کر دیا۔ تو کیا بیاہ رُک جائے گا؟ تم کہو گے اس میں حرج ہی کیا ہے؟ تمہارے لئے حرج نہ ہو گا۔ مگر ہماری تو ناک کٹ جائیگی۔ کہیں مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔ اِس لئے یہ خام خیالی چھوڑ دو۔ اور چُپ چاپ جنواسے لوٹ جاؤ۔ غنیمت یہی ہے کہ تمہیں یہاں کوئی پہچانتا نہیں ہے۔ ورنہ اِس وقت سارا محلّہ یہاں جمع ہو گیا ہوتا"۔

مُردینا ناتھ پر اس تقریر کا ذرا اثر نہ ہُوا۔ رُکھائی سے بولا "میرے خیال میں تو کوئی حرج کی بات نہ تھی"۔

سمرجن مل "تمہارے خیال میں نہ ہو گی۔ میرے خیال میں تو ہے"۔

دینا ناتھ "ایک مرتبہ اور سوچ لیجئے"۔

سمرجن مل "بیٹا کیا باولوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ ذرا اپنے آپ کو میری حالت میں رکھ کر دیکھو۔ اور پھر بتاؤ۔ اگر تمہاری بہن کا بیاہ ہو اور تمہیں ایسی ہی صُورت پیش آ جائے تو کیا کرو؟"

دینا ناتھ "میں تو فوراً دکھاؤں"۔

سمرجن مل "شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں نے وہ تعلیم نہیں پائی۔ جو تم نے پائی ہے۔ مجھے دُنیا کا بھی مُنہ رکھنا پڑتا ہے"۔

دینا ناتھ نے قدرے سکوت کیا۔ اس کے بعد فیصلہ کُن لہجہ میں کہا "بہرکیف میں بھی آپ کو اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ میرا یہ فیصلہ ہے کہ چاہے اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو جائے۔ مگر میں لڑکی کو دیکھے بغیر بیاہ نہیں کروں گا"۔

سرجن مل کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اِس اندھیرے سے باہر نکلنے کا کوئی رستہ نہ تھا۔ سوچتے تھے۔ اِس لونڈے نے بُری جگہ گھیرا ہے نہ "ہاں" کرتے بنتی ہے نہ "نہ" کرتے۔ بد دماغ آدمی تھے۔ انہوں نے آج تک کبھی ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دی تھی۔ انہوں نے کبھی کسی کی ٹیڑھی آنکھ نہ دیکھی تھی۔ کوئی اَور ہوتا تو اُسے کان سے پکڑ کر باہر نکال دیتے۔ مگر آج ——— وہ بیٹی کی خاطر وہ سُن رہے تھے۔ جو آج تک کبھی نہ سُنا تھا۔ بیٹے اور بیٹی میں آج انہیں پہلی مرتبہ فرق دکھائی دیا۔ آج اُن کی خودداری میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی طاقت نہ تھی۔ آج اُن کے سامنے بے عزتی کھڑی للکار رہی تھی +

یکایک انہیں ایک رستہ نظر آیا۔ بولے "تو ایک کام کرو۔ میں نے تمہارے والد صاحب کو ثالث مانا۔ وہ جو کچھ کہہ دیں گے۔ مجھے منظور ہو گا۔ میرے دوست ہیں، تمہارے والد ہیں۔ میرے حق کی بات جبھی کہیں گے۔ جب سچائی میری طرف ہوگی۔ کیوں ؟"

مگر دینا ناتھ نے بھی ولایت کا پانی پیا تھا۔ فوراً بھانپ گیا کہ بڈھے بڈھے ایک طرف ہو جائیں گے۔ میرا داؤ نہ چلے گا۔ اس نے اپنی ٹوپی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا "میرے لئے آپ اور وہ دونوں برابر ہیں۔

اِس معاملہ میں اُن کی بھی نہ سُنوں گا"۔
اب سرجن مل بالکل مایُوس ہو گئے۔ ڈوبتے ہُوئے تنکے کا سہارا لیا تھا۔ وُہ تنکا بھی ٹوٹ گیا۔ اب کیا کریں؟ اِس وقت اگر کوئی ان کا دِل چیر کر دیکھتا۔ تو وہاں اسے ایک آواز سُنائی دیتی۔ بھگوان کسی کو بیٹی نہ دے۔

(۳)

دم کے دم میں یہ خبر گھر کے کونے کونے میں پھیل گئی۔ بیاہ کے دن تھے۔ سارے رشتہ دار آئے ہوئے تھے۔ اِن کو ایک شوشہ مل گیا۔ چاروں طرف کانا پھوسیاں ہونے لگیں۔ دولت مند کے رشتہ دار اس کی بدنامی سے جس قدر خوش ہوتے ہیں۔ اُس قدر دُشمن بھی خوش نہیں ہوتے۔ کسی میں مُنہ سے بولنے کی جُرأت نہ تھی۔ لیکن دِل میں سبھی خوش ہو رہے تھے۔ کہ چلو اچھا ہُوا۔ چار پیسے پا کر اس کی آنکھوں میں چربی چھا گئی تھی۔ اب ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔
اُدھر اُوشا دیوی شرم و حیا سے مری جا رہی تھی۔ لیکن کچھ کر نہ سکتی تھی۔ ہندو گھر میں کنواری کنیا کے لئے ایسے معاملات میں زبان کھولنا پاپ سے کم نہیں۔ دیکھتی تھی۔ کہ میری وجہ سے باپ کا سر نیچا ہو رہا ہے۔ مگر دم نہ مار سکتی تھی۔ دِل ہی دِل میں کُڑھتی تھی۔ اور چُھپکے چُھپکے روتی تھی۔ اتنے میں اس کی ماں نے آکر مری ہوئی آواز میں کہا۔ "تجھے تیرا باپ بُلا رہا ہے"۔

اوشا دیوی نے ماں سے کوئی سوال نہ کیا۔ چُپ چاپ باپ کے ڈرائنگ روم کی طرف چلی گئی ڈرائنگ روم کے دروازے پر پہنچ کر اس کے پاؤں ذرا رُکے۔ مگر دوسرے لمحہ میں اس نے اپنا من مضبوط کر لیا۔ اور کمرے میں داخل ہوگئی۔ وہاں پر لالہ سرجن مل کے علاوہ ایک اور نوجوان بھی بیٹھا تھا۔ اوشا دیوی نے اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا اور باپ کے پاس جا کر کھڑی ہوگئی ٭

سرجن مل نے کہا "بیٹی! بیٹھ جاؤ۔ اپنے ہی آدمی ہیں"٭

اُوشا دیوی نے سر نہ اُٹھایا۔ اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ مگر اس حال میں کہ اسے دین و دُنیا کی خبر نہ تھی دینا ناتھ نے دیکھا۔ لڑکی شکل و صُورت کی بُری نہیں ہے۔ اور بُری کیا۔ خوبصورت ہے۔ بلکہ خوبصورتی سے متعلق ان کا جو معیار تھا۔ اُوشا دیوی اُس سے بھی بڑھ کر نکلی دینا ناتھ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ بالکل ایسے ہی جیسے ہم کسی شے کو خریدنے سے پہلے دیکھتے ہیں۔ اِس کے بعد آہستہ سے بولا "آپ نے انگریزی بھی پڑھی ہے؟"

اُوشا دیوی بیوقوف نہ تھی۔ فوراً سمجھ گئی۔ کہ یہی میرا ہونے والا شوہر ہے۔ مگر وہ کیا کرے؟ شوہر کی بات کا کیا جواب دے؟ مُنہ میں زبان تھی زبان میں بولنے کی طاقت نہ تھی۔ جس طرح بیٹھی تھی۔ اسی طرح بیٹھی رہی۔ بلکہ ذرا اور بھی دبک گئی ٭

دینا ناتھ نے سرجن مل کی طرف دیکھا۔ سرجن مل بولے "بیٹی! بولتی

کیوں نہیں؟ کیا پوچھتے ہیں؟"

اُوشا دیوی نے مسکرا کر آہستہ سے جواب دیا" پڑھی ہے"۔

دیناناتھ نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اور لپک کر میز پر سے اُس دن کا اخبار اُٹھا لیا۔ اس کے بعد اُوشا دیوی کے پاس جاکر بولے" ذرا پڑھو تو"

یہ کہہ کر اس نے اخبار اُوشا دیوی کے ہاتھ میں دے دیا۔ ایک نوٹ کی طرف اشارہ کیا۔ اور خود پتلون کے جیب میں ہاتھ ڈال کر کرسی کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

اُوشا دیوی چند لمحے سوچتی رہی۔ اس کے بعد اس نے سارا نوٹ پڑھ کر سنا دیا۔

دیناناتھ کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ اس کی اپنی بہن بھی انگریزی پڑھتی تھی۔ مگر اس میں تو یہ روانی نہ تھی۔ چار لفظ پڑھتی تھی اور رُکتی تھی۔ پھر زور لگاتی تھی۔ اور پھر رُک جاتی تھی۔ جیسے بیل گاڑی دلدل سے نکلنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اور پھر اس کا انگریزی پڑھنے کا لب و لہجہ بھی نہایت قابلِ اعتراض تھا۔ مگر اُوشا اِس دریا کی مچھلی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے یہ اس کے لئے بدیشی زبان نہ تھی مادری زبان تھی دیناناتھ کی تسلی ہو گئی۔ سرجن مل کی طرف دیکھ کر بولا" ان کا پرونن سی ایشن بیحد صاف ہے۔ کس سے پڑھتی رہی ہیں؟"

سرجن مل" ایک یورپین عورت مل گئی تھی"۔

دیناناتھ" بس بس! یہی راز ہے۔ اگر کسی ہندوستانی سے پڑھتیں۔

تو یہ بات کبھی نہ پیدا ہوتی۔ اِن کا لب و لہجہ بالکل انگریزوں کا سا ہے۔ انہیں پردے میں بٹھا کر کہئے بولیں۔ باہر کوئی انگریز کھڑا ہو۔ صاف دھوکا کھا جائے گا اُسے ذرا شبہ نہ ہوگا کہ کوئی ہندوستانی لڑکی بول رہی ہے"۔

سُرجن مل پر نشہ چھا گیا۔ اس وقت انہیں ایسی ہی خوشی ہو رہی تھی۔ جیسے زندگی کی ہاری ہوئی بازی جیت لی ہو۔ بلکہ اِس سے بھی زیادہ۔ وہ سمجھتے تھے۔ دینا ناتھ کو جو کچھ دیکھنا تھا۔ دیکھ چُکا۔ اور جو کچھ پُوچھنا تھا۔ پُوچھ چکا۔ اتنے میں دینا ناتھ نے دُوسرا سوال کر دیا "اِنہوں نے کچھ گانا بھی سیکھا ہے؟"

سُرجن مل سنجیدہ ہو گئے۔ بولے "ہاں! گندھرو مہا ودیالہ کے پرنسپل صاحب روزانہ دو گھنٹے کے لئے آتے ہیں"۔

دینا ناتھ "جب تو بہت اچھا گاتی ہوں گی۔ اگر حرج نہ ہو۔ تو کہئے۔ ایک آدھ چیز سُنائیں"۔

سُرجن مل کا مُنہ حیرت سے کھُلا رہ گیا۔ لڑکی کو گا کر بھی سُنانا ہوگا۔ یہ انہوں نے ابھی تک نہ سوچا تھا لڑکی دکھا دی۔ گھر سے باہر کسی کو کیا معلوم! اِس نے انگریزی پڑھ کر سُنا دی۔ اِس کا بھی کسی کو کیا پتہ؟ مگر جب لڑکی اپنے بیاہ کے دن زور زور سے گا کر سُنائے گی۔ تو دُنیا کیا کہے گی؟ اُن کے سر کے بال سفید ہو گئے تھے۔ مگر انہوں نے ایسی بات آجتک نہ سُنی تھی۔ لیکن کوئی چارہ نہ تھا۔ آہ سرد بھر کر بولے "بیٹی سُنا دو"۔

اور دُوسرے لمحہ میں اُوشا کی نازنین اُنگلیاں ہارمونیم بجا رہی تھیں۔ اور اس کا دلکش نغمہ کمرہ میں گُونج رہا تھا۔ اور دینا ناتھ والہانہ انداز سے جھوم رہا تھا +

مگر سُرجن مل حزن و ملال سے مرے جا رہے تھے۔ اور کمرے سے باہر ان کی رشتہ دار عورتیں کھڑی ان کی بے غیرتی (؟) پر خوش ہو ہو کر افسوس کر رہی تھیں۔ اور کلجگ کو گالیاں دے رہی تھیں +

گانا ختم ہونے پر دینا ناتھ نے سیگرٹ کیس سے سیگرٹ نکالا۔ اور اُسے سلگانے کے لئے دیا سلائی جلاتے ہوئے بولا "ونڈرفل!"

سُرجن مل کا جی چاہتا تھا۔ دینا ناتھ کا مُنہ نوچ لیں۔ مگر غُصّے کو دبا کر بولے "کوئی اور بات پُوچھنا ہو۔ تو وہ بھی پُوچھ لو" +

اُوشا دیوی کا مُنہ شرم سے لال ہو گیا۔ اور کان انگاروں کی مانند جلنے لگے +

دینا ناتھ نے سیگرٹ سلگا کر دیا سلائی کو ہاتھ کے جھٹکے سے بُجھاتے ہوئے جواب دیا "اور کوئی بات نہیں۔ مجھے لڑکی پسند ہے +

سُرجن مل نے اطمینان کا سانس لیا +

(۴)

یکایک اُوشا دیوی اپنی کُرسی سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اور دینا ناتھ کی طرف دیکھ کر آہستہ سے مگر فیصلہ کُن لہجہ میں بولی "لیکن مجھے تم پسند نہیں ہو" +

دیناناتھ کے لئے ایک ایک لفظ بندوق کی ایک ایک گولی سے کم نہ تھا۔ مُنہ کا سیگرٹ مُنہ ہی میں رہ گیا۔ مگر بیشتر اس کے کہ وہ کچھ بولے۔ یا سرجن مل کچھ کہیں۔ اُوشا نے پھر سے کہنا شروع کر دیا:۔

"اگر تم لڑکوں کو یہ حق حاصل ہے۔ کہ بیاہ سے پہلے لڑکی کو دیکھو۔ اُس کا امتحان کرو۔ اور اس کے بعد اپنا فیصلہ سُناؤ۔ تو یہ حق ہم لڑکیوں کو بھی ہونا چاہیئے۔ کہ تمہیں دیکھیں۔ اور تمہیں پرکھیں۔ اور اس کے بعد تمہیں اپنا فیصلہ سُنائیں اور میرا فیصلہ یہ ہے۔ کہ میں تمہارے ساتھ کسی حالت میں بھی بیاہ کرنے کو تیار نہیں ہو سکتی"۔

سُرجن مل دیناناتھ کو نیچا دکھانا چاہتے تھے مگر اُن میں یہ ہمّت نہ تھی۔ اُوشا دیوی کا خوددارانہ جذبہ دیکھ ان کے دِل کا کنول شگفتہ ہو گیا۔ بیاہ نہ ہوگا۔ تو کیا ہوگا؟ دُنیا کیا کہے گی؟ اور وہ کیا جواب دیں گے؟ اِس وقت ان میں سے ایک بات بھی ان کے سامنے نہ تھی۔ ان کے سامنے صرف ایک بات تھی۔ جس نے میری بے عزّتی کی تھی۔ میری لڑکی نے اس کے مُنہ پر طمانچہ مار دیا۔ اس نے میری ذِلّت کا بدلہ لے لیا۔ یہ بھی کیا یاد کرے گا؟

دیناناتھ شرم سے پانی پانی ہُوا جاتا تھا۔ مگر چُپ رہنے سے شرم گھٹتی نہ تھی اور بڑھتی تھی۔ کھسیانہ ہو کر بولا "مگر تم نے تو میرا امتحان لینے سے پہلے ہی فیل کر دیا"۔

اُوشا دیوی نے اَور بھی زور سے وار کیا "مجھے تمہارا امتحان لینے کی

ضرورت ہی کیا ہے؟ مَیں اتنا ہی سمجھ گئی ہوں۔ کہ تمہارے اور میرے خیالات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مَیں سولھوں آنے ہندی ہوں۔ تم سولھوں آنے بدیشی ہو۔ مَیں بیاہ کو رُوحانی رشتہ مانتی ہوں۔ تمہارے نزدیک میری خوُبی یہ ہے۔ کہ میرا مُنہ خوبصورت اور میری آواز میٹھی ہے۔ کل کو اگر مجھے چیچک نکل آئے یا کسی اور بیماری سے میرا گلا خراب ہو جائے۔ تو تمہاری آنکھیں مجھے دیکھنا بھی گوارا نہ کریں گی۔ تم کہتے ہو۔ مَیں نے تمہارا امتحان نہیں لیا۔ مَیں کہتی ہوں۔ تمہاری دو باتوں سے مَیں نے تمہیں تول لیا۔ جس کی پسند ایسی اوچھی اور کچّی بُنیادوں پر کھڑی ہو۔ اُس کا کیا اعتبار؟ تم میں کتابی قابلیت ہوگی مجھے اس سے انکار نہیں۔ لیکن تم میں آدمیت کا مادہ ذرا بھی نہیں ہے۔ میرے بابوجی آج سے تمہارے بھی رشتہ دار تھے۔ تم نے ان کا ذرا بھی خیال کیا؟ ان کے قلب و جگر پر چھُریاں چل رہی تھیں۔ اور تم اپنی جیت پر پھُولے نہ سماتے تھے۔ تمہیں صرف اپنا خیال ہے۔ دُوسرا ذلیل ہوتا ہے تو ہُوا کرے۔ ذرا سوچو۔ اگر یہی ناروا سلوک مَیں تمہارے باپ کے ساتھ کرتی۔ تو تمہارا کیا حال ہوتا؟ آنکھوں سے آگ نکلنے لگتی۔ خوُن کھولنے لگتا۔ عجب نہیں مجھے گھر سے نکالنے کو بھی تیار ہو جاتے ایسے پست خیال، تنگ دل، غیر مُنصف مرد کے ساتھ جو عورت اپنی زندگی باندھ لے۔ اُس سے بڑا احمق کون ہوگا؟"

یہ کہتے ہی اُوشا باہر نکل گئی +

دینا ناتھ کا مُنہ اتنا سا نکل آیا۔ تقدیر کا پانسہ اِس قدر جلد بھی

پلٹ سکتا ہے۔ یہ اس کے لئے پہلا تجربہ تھا۔ سوچتا تھا۔ کیا بولوں؟ اُوشا دیوی کی باتوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ چُپ چاپ اپنے پاؤں کی طرف دیکھتا تھا۔ اور اپنی حماقت پر پچھتاتا تھا۔ مگر اب پچھتانے سے کچھ بنتا نہ تھا۔ اِدھر سُرجن مل کی آنکھیں فتح کی روشنی سے جگمگا رہی تھیں۔ وہ سوچتے تھے ایسے کم ظرف آدمیوں کے ساتھ جتنی بھی ہو کم ہے۔ اب بچہ جی کو سبق مل جائیگا۔ وہ دُنیا اور دُنیا کی زبان سے بہت ڈرتے تھے۔ مگر اس وقت انہیں اس کی ذرا بھی پروا نہ تھی۔ چند منٹ پہلے دینا ناتھ کی خفگی ان کے لئے خدائی قہر تھا۔ اس وقت اِس خفگی کی ان کے لئے ذرا بھی حقیقت نہ تھی۔ آج پُرانے جگ نے اپنی آنکھیں نئے جُگ میں کھول لی تھیں۔ آج اُن کے سامنے خودداری اور بے خوفی کا نیا رستہ کھل گیا تھا آج ان کی دُنیا تبدیل ہو گئی تھی +

سرجن مل اُٹھ کر دھیرے دھیرے دینا ناتھ کے پاس گئے۔ اور ظاہر داری کے طور پر بولے "مجھے بیحد افسوس ہے۔ لیکن مَیں کچھ کر نہیں سکتا۔ جب لڑکی ہی نہ مانے۔ تو کوئی کیا کرے؟"

دینا ناتھ کی رہی سہی اُمید بھی جاتی رہی۔ سمجھ گیا۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ تھوڑی دیر جب باہر نکلا۔ تو زمین و آسمان گھوم رہے تھے۔ اور دُنیا میں کہیں بھی روشنی نہ تھی +

(۵)

لیکن ماں کو لڑکی کی اس بیحیائی پر زہر چڑھ گیا۔ غصہ میں بھری ہوئی

اِس کے کمرے میں جا کر بولی" اب دیکھتی ہوں تُجھے بھی شہر کا پانی لگ گیا۔ جو ٹرٹر بولنے لگی۔ لڑکے نے دو باتیں پُوچھ لیں، تو کونسا غضب ہو گیا۔ جواب دیتی۔ اور چلی آتی۔ اب جب برات لَوٹ جائے گی۔ اَور گھر گھر میں ہماری باتیں ہوں گی۔ تب تو ہماری عزّت رہ جائے گی نا۔ جس لڑکی کی برات لَوٹ جائے۔ اُس لڑکی کا مر جانا بھلا۔ شریف گھروں میں، تو یہ ہوتا نہ تھا۔ ڈُوم چماروں میں ہوتا ہو۔ تو پتہ نہیں ":

اُوشا دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ مگر کچھ بولتی نہ تھی۔ چُپ چاپ ماں کی طرف دیکھتی تھی۔ اور سر جُھکا کر رہ جاتی تھی:

اِتنے میں سُرجن مل نے آکر اُوشا کو گلے سے لگا لیا۔ اور بیوی کی طرف شرر بار نگاہوں سے دیکھ کر بولے " خبردار! اگر میری بیٹی سے کچھ کہا۔ اس نے وہی کیا ہے۔ جو ایک خُود دار اور بہادر لڑکی کو کرنا چاہیئے تھا۔ اور جو کرنے کی ہم میں جُرأت نہیں۔ مگر ہم اس کی تعریف بھی نہ کریں۔ تو یہ ڈُوب مرنے کا مقام ہوگا۔ باقی رہ گیا سوال اس کے بیاہ کا۔ اس کی مجھے ذرا بھی پروا نہیں۔ میری بیٹی کے لئے لڑکے بہت مل جائیں گے ":

یہ کہتے کہتے انہوں نے اُوشا کی پیشانی چُوم لی ؛

ثروت کا نشہ

(۱)

مہابیر کہار نے اپنی بیوی کے سر پر ہاتھ پھیر کر پوچھا "اب کیا حال ہے؟"

گنگا نے آنکھیں کھول کر بے بسی کی نگاہوں سے غریب شوہر کی طرف دیکھا۔ اور آہ سرد بھر کر جواب دیا "اب حال کیا ہو گا؟ چل چلاؤ کی تیاریاں ہیں۔ انت کال آ پہنچا ہے۔"

مہابیر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اپنی میلی دھوتی کے پھٹے ہوئے کونہ سے آنکھیں پونچھ کر بولا "ایسا کیوں چھوڑتی ہو۔ مجھے اکین ہے۔ تم ایک دو دن میں اُٹھ کھڑی ہو گی۔ بکھار کم ہو رہا ہے۔ کل اس بکھت پنڈا اتنا گرم تھا۔ کہ چھوا نہ جاتا تھا۔ آج (گنگا کی پیشانی پر ہاتھ پھیر کر اطمینان سے) کل سے بڑا پھرک ہے۔ دھیرج رکھو۔"

گنگا نے قدرے مسکرا کر کہا "جو پھرک ہے۔ وہ مجھے تم سے جیادہ مالم ہے۔ کھیر (کچھ دیر کے بعد کروٹ بدل کر) گاؤں میں تو کھوب تیاریاں

ہوں گی"۔

مہابیر:۔ "کیا کہنا۔ سب گلی بجار سیسے کی طرح چمک رہے ہیں۔ جمیندار کا حکم ہے۔ کہ اگر کسی کے در وجّے پر پتّا بھی نجر آ گیا۔ تو لہو پی توں گا۔ سب دُکانیں سج رہی ہیں۔ جمیندار ساب کھُد گھوم رہے ہیں"۔

گنگا:۔ "برات کل آئے گی؟"

مہابیر:۔ "سُنا ہے۔ اُدھر بھی بڑے جوروں کی طیاریاں ہیں۔ کئی سَو برانی آئیں گے"۔

گنگا۔ (پُرمسرّت نگاہوں سے مہابیر کی طرف دیکھ کر) "ہمیں بھی دکھاؤ گے نا؟ ایسا موکا روج روج تھوڑا ملتا ہے"۔

مہابیر:۔ "ایسری کے مکان کی چھت پر سے چلیں گے۔ اُدھر ہی سے تو برات نکلے گی۔ (یکایک چونک کر) دوا لاؤں۔ بکھت تو ہو گیا ہے"۔

گنگا اتنی بات چیت ہی سے نڈھال ہو گئی تھی۔ اس نے تھک کر آنکھیں بند کر لیں۔ مہابیر نے ایک پُڑیا کٹوری میں گھول لی۔ اور گنگا کو پلا دی۔ دوا کڑوی تھی۔ گنگا کے مُنہ کا ذائقہ خراب ہو گیا۔ مُنہ بنا کر بولی:۔ "اتنی کڑوی دوا لاتے ہو۔ ہجم بھی نہیں ہوتی۔ پھانک کیا کھاک ہو گا؟"

مہابیر:۔ "مُنہ بند رکھو۔ تو ہجم ہو جائے گی۔ بَید کہتا تھا۔ یہ دوا نہیں رام بان ہے۔ جرا رسّا بنا لوں۔ لچھمی نرائن کہتا تھا۔ آج ہی جرورت ہے۔ چار پیسے مل جائیں گے"۔

گنگا۔ (کراہ کر) "اور آج کچھ کھاؤ گے نہیں۔ ذرا ستوا ہی کھالو۔ پھر رسّا بھی بنا لینا۔ بھوکے رہو گے۔ تو کام کیا ہو گا۔ تم بھی لیٹ جاؤ گے۔"

مہابیر "نہ بھئی! پہلے رسّا۔ پھر کچھ اور۔ رسّا نہ بنا۔ تو رات کو دیا جلنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ اور کیا؟"

گنگا "تمہاری مرضی۔ جو چاہو کرو۔"

مہابیر رسّا بٹنے لگا۔ صبح بھوکا پیاسا گھر سے نکلا تھا۔ گٹی گھروں میں پانی بھرا۔ تھک کر چُور چُور ہو گیا۔ دو گھڑی لیٹ جاتا۔ تو ذرا کمر سیدھی ہو جاتی۔ ذرا تازہ دم ہو جاتا۔ کچھ کھا پی لیتا۔ تو چہرہ پر رونق آ جاتی۔ لیکن وہ مزدور تھا۔ اُس کی قسمت میں آرام کہاں؟ بھوکا پیاسا رسّا بنانے لگا۔ ایسی محبّت سے جیسے کسی دیوتا کی پُوجا کر رہا ہو۔ ایسی محنت اور تن دہی سے جیسے اسی پر اُس کی زندگی کا انحصار ہو۔ وہ اس میں سرتاپا منہمک تھا۔ کہ گنگا گھبرائی ہوئی اُٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گئی +

مہابیر نے رسّا بنانا بند کر دیا۔ اور گنگا کے قریب جا کر بولا "کیوں کیا ہوا؟"

گنگا نے کھدر کی چادر سر پر کھینچ لی۔ اور بولی "کے ہو جائے گی۔"

یہ کہہ کر اُس نے اپنا مُنہ زور سے بھینچ لیا۔ مہابیر بھاگ کر نمک کی ڈلی لے آیا۔ اور بولا "لو اسے چاٹ لو۔" مگر قے ہو گئی۔ ساری دوا نکل گئی۔ مہابیر نے گنگا کی چارپائی پر بیٹھ کر اس کو سنبھال لیا۔ اور اُس کی

چادر سے اُس کا منہ صاف کر کے کہا۔ "یہ دوا ہجم ہو جاتی۔ تو تمہارا بکھار آج ہی اُتر جاتا"۔

گنگا نے ہانپتے ہوئے اپنا ہاتھ اپنے سر کے نیچے رکھ لیا۔ اور کہا۔ "بڑی کڑوی تھی۔ ساری نکل گئی۔ اِس پر تھوڑی سی راکھ نہ ڈال دو"۔

مہابیر۔ (راکھ ڈال کر) "ہم جرا بید کی طرپھ ہو آئیں۔ سائد کوئی اور دوا دے۔ کھبردار رہنا"۔

گنگا۔ "جاؤ۔ پر جرا جلدی آ جانا۔ بہت جاڑا لگ رہا ہے"۔

مہابیر۔ "پرمیسر کا دھیان کرو۔ وہ کُسل کرے گا"۔

(۲)

مہابیر باہر نکلا۔ مگر ابھی وید کے مکان تک پہنچا بھی نہ تھا۔ کہ زمیندار کے منشی صاحب بابو رام آتے دکھائی دیئے۔ مہابیر چاہتا تھا کہ نظر بچا کر نکل جائے۔ مگر بابو رام نے دیکھ لیا۔ اور تحکمانہ لہجہ میں کہا۔ "ابے ذرا ٹھہر۔ کدھر منہ اُٹھائے چلا جاتا ہے؟"

مہابیر کے پاؤں وہیں رُک گئے۔ ہاتھ باندھ کر بولا "منسی جی! اِس بکھت نہ روکئے۔ مہری بہت بیمار ہے۔ جرا بید جی کی طرپھ جا رہا ہوں"۔

بابو رام۔ "بڑے حرامی ہو۔ جب کام کا وقت آتا ہے۔ کوئی نہ کوئی بیمار ہو جاتا ہے۔ یہ حیلے ہمیشہ نہیں چل سکتے"۔

مہابیر۔ "نہیں مائی باپ۔ تم خود چل کر دیکھ لو۔ کوئی دو ہپھتے سے بیمار ہے۔ چاہے آس پاس والوں سے پُوچھ لو۔ کئی دن سے باہر ہی

نہیں نکلی"۔

بابو رام "میرے پاس اتنا وقت کہاں؟"

مہابیر "مگر منشی جی!"

بابو رام۔ (ڈانٹ کر) "میں کچھ نہیں سُننا چاہتا۔ تمہیں اِس وقت سنسار پور جانا ہو گا۔ صُبح برات آ رہی ہے۔ انہوں نے آٹھ آدمی مانگے ہیں۔ اسباب کے ساتھ ساتھ آنا ہو گا۔ بیل گاڑیوں کا اِنتظام کر دیا گیا ہے"۔

مہابیر کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ منت آمیز لہجہ میں بولا "منشی جی! آج ما بھی مِل جائے۔ مہری کو بہت بُخار ہے۔ گھر میں کوئی اِتنا بھی نہیں۔ جو پانی کا گھونٹ ہی دیدے۔ سچ کہتا ہوں سرکار! اِس میں جرا جھوٹ نہیں ہے"۔

بابو رام۔ (بے پروائی سے) "مجھے اِس سے کوئی سروکار نہیں۔ زمیندار صاحب نے مجھے حکم دیا۔ میں نے تُم سے کہہ دیا۔ اب جاؤ نہ جاؤ یہ تمہاری مرضی"۔

مہابیر "جمیندار صاحب کا حکم سر آنکھوں پر! اب ہجور! بڑی مُشکل آن پڑی ہے۔ آپ ہی بتائیں"۔

بابو رام "چلے جاؤ۔ ایک ہی دِن کی تو بات ہے"۔

مہابیر۔ (جل بُھن کر غصّہ سے) "اور جو مہری مر جائے۔ تو......

بابو رام "تو دُنیا تاریک نہ ہو جائے گی"۔

مہابیر۔" اب ہجور! یہ تو اُسی بکھت مالم ہو۔ جب اپنی گھروالی بیمار ہو۔ پرائے کی تکلیپھ کو کون سمجھتا ہے؟"

بابو رام کے دل میں جیسے تیر سا چُبھ گیا۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولے۔ یہ کیا کہا تُو نے۔" ذرا پھر تو کہہ"۔

مہابیر بھی سہم گیا۔ بولا "اب سرکار! آپ ہی بتائیں۔ گھر میں گھروالی بیمار ہے۔ کیسے اکیلے چھوڑ جاؤں؟"

بابو رام"۔ تیرے باپ کو بھی جانا ہوگا۔ کم ذات حرامی! سمجھتا ہے شریف آدمی ہے کیا کرے گا؟ مگر اس خیال میں نہ رہنا گاؤں سے نکلوا دوں گا"۔

مہابیر۔" بہت اچھا منشی جی! نکلوا دیجئے۔ نکل جائیں گے۔ گریب آدمی کا امیر ہے جو رہی کیا ہے؟"

بابو رام۔" اور آج سنسار پور نہ جاؤ گے"۔

مہابیر۔" (فیصلہ کُن لہجہ میں) کبھی نہ جاؤں گا"۔

بابو رام"۔ یہاں تک مجال؟"

مہابیر۔" جب کوئی اُجر نہ سُنے۔ تو کیا کروں؟"

یہ کہہ کر مہابیر وید کی طرف چلا گیا۔ اس طرح جیسے اُسے کسی کا خوف ہی نہ ہو۔ جیسے اُسے کسی کی پرواہ ہی نہ ہو۔ اُدھر منشی بابو رام زمیندار کے پاس پہنچے۔ زمیندار نے منشی صاحب کو دیکھتے ہی پُوچھا" کہاروں کا انتظام ہو گیا ہے یا نہیں۔ دیکھئے اُن لوگوں کو ذرا بھی تکلیف نہ ہو"۔

بابو رام کو موقعہ ملا۔ سر جھکا کر بولے" سرکار! یہاں آدمیوں کا

انتظام ہونا تو مشکل ہے۔ کہئے دُوسرے گاؤں سے جاکر آدمی بھیج دُوں؟
زمیندار کی بھویں تن گئیں۔ بولے "کیوں؟"
بابُو رام "جس سے کہتا ہوں۔ وہی کوئی نہ کوئی عُذر پیش کر دیتا ہے
زیادہ زور دُوں۔ تو گالیاں تک دینے کو تیار ہو جاتے ہیں"
زمیندار "میرے گاؤں میں تو ایسا خودسر آدمی کوئی نہ تھا"
بابو رام "ابھی مہابیر سے جھگڑا ہو گیا۔ اگر میں طرح نہ دے جاتا۔
تو ہاتھا پائی تک نوبت آگئی تھی"
زمیندار "کیا کہتا ہے آخر وہ؟"
بابُو رام "کہتا ہے زمیندار کی بیٹی کا بیاہ ہے۔ زمیندار خود جاکر اسباب
اُٹھائے۔ ہم کسی کے دبیل نہیں۔ چھاتی پھاڑ کر کام کرتے ہیں۔
روٹی کھاتے ہیں۔ پھر بھی ہر وقت کی دھونس کے کیا معنی؟ ہم
نہیں جائیں گے۔ ہماری مہری بیمار ہے۔ اُس کی دوا کریں یا
زمیندار کی خدمت کریں؟"
زمیندار کا خُون کھولنے لگا۔ جوشِ غضب میں ہونٹ چبا کر بولے۔
"اور آپ یہ سب کچھ سُنتے رہے؟"
بابو رام "میں نے کہا۔ ایسا شریف زمیندار ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔
اور لڑکی کے بیاہ میں تو پرائے بھی امداد کرتے ہیں۔ اِس پر بکنے
لگا۔ حضور! مجھے بھی طیش آگیا۔ میں نے کہا۔ سرکار چاہیں۔ تو
تجھے خاک میں ملا دیں۔ تیری ہستی ہی کیا ہے؟"

زمیندار ؎" پھر کیا بولا ؟"
بابو رام " کہنے لگا۔ جو چاہیں کر لیں۔ پر سنسار پور تو نہ جاؤنگا۔ میں نے کہا تیرا باپ بھی جائے گا"
زمیندار " مجھے خیال نہ تھا۔ کہ یہ ایسا کمینہ ہے"
بابو رام " چار جوتے لگ جائیں۔ تو ہوش آ جائے"
زمیندار " ہم رحم کرتے ہیں۔ یہ سر پر چڑھے جاتے ہیں"
بابو رام " اگر اسے سنسار پور نہ بھیجا۔ تو سارا گاؤں سرکش ہو جائیگا۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے"

زمیندار نے اُسی وقت آدمی بھیج کر مہابیر کو بلوایا اور جوتے لگوائے۔ غریب کو اپنی صفائی کا بھی موقعہ نہ دیا تھوڑی دیر بعد جب چراغ میں بتی پڑی۔ تو وہ سات دُوسرے کہاروں کے ساتھ سنسار پور کو جارہا تھا۔ وَید کی دوا دینے کی نوبت ہی نہ آئی۔ البتہ اپنی بیوہ بہن جمنا سے کہہ گیا۔ گنگی تیرے حوالے ہے۔

(۳)

رات کا وقت تھا۔ گنگا اپنے جھونپڑے میں بے سُدھ پڑی تھی۔ جمنا اُس کے سرہانے بیٹھی تھی۔ اور زمیندار کو گالیاں دیتی تھی۔ کہتی تھی۔ "کیسا بے درد ہے؟ گھر میں مہریا بیمار پڑی ہے۔ پتی کو باہر بھیج دیا۔ دولت نے اندھا کر دیا ہے۔ دیا دھرم سُوجھتا ہی نہیں ہے۔ لیکن گریبوں کی ہائے بُری ہوتی ہے۔ کُتّے کی موت مرے گا۔۔۔۔

پرمیشر کرے۔ بدن میں کیڑے پڑ جائیں اُس بھگت یاد آئیگا۔ کہ کسی کا من دُکھایا تھا" معاً کسی نے دروازہ پر دستک دی۔ جمنا نے چونک کر پُوچھا "کون ہے؟"

باہر سے منشی بابو رام کی آواز آئی "ہم ہیں۔ دروازہ کھول دے۔ زمیندار صاحب نے بھیجا ہے"۔

جمنا ڈر گئی۔ اس نے سوچا۔ کہیں اِس نے سُن نہ لیا ہو۔ پاجی آدمی ہے۔ جا کر ایک کی چار لگائے گا۔ دروازہ کھول کر بولی۔ اِس بھگت کیسے آئے مہاراج!"

بابو رام "تمہیں بہت دیر سے ڈھونڈ رہے ہیں۔ زمیندار صاحب نے بُلایا ہے۔ فوراً چلو ورنہ بگڑ جائیں گے"۔

جمنا کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ بولی "کیا کام ہے اِس بھگت؟"

بابو رام "بیسن پیسنا ہے۔ اور سب کہاریاں آگئی ہیں۔ ایک تُو باقی ہے ایک دگنگا کی طرف اشارہ کر کے) یہ۔ اِس کے جانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے کہہ دیا ہے وہ بیمار ہے۔ اب کیا حال ہے؟"

جمنا "بے ہوش ہے تن بدن کی سُدھ نہیں۔ گھر میں مالک ہوتا۔ تو دوڑ دھوپ کرتا۔ میں عورت جات! کیا کر سکتی ہوں۔ پاس بیٹھی رو رہی ہوں"۔

بابو رام "دوا دی ہے یا نہیں؟"

جمنا "دوا تو دی ہے مگر کیے ہو گی"۔

بابورام "یہ تو بُری سُنائی تم نے۔ پھر دو شائد ہضم ہو جائے"۔

جمنا۔ دُوسری پھا پھردی تھی۔ پھر بھی کے ہو گئی۔ اب تو بکھار بھی بڑھ گیا ہے۔ بولتی چالتی بھی نہیں۔ جمیندار کے ہاں گئی۔ تو یہ اکیلی ہے۔ جانے کیا ہو جائے؟"

بابورام "کسی کو پاس بٹھا جا؟"

جمنا "کہاریاں سب جمیندار ساب کے یہاں گئی ہیں۔ کہار سنسا۔ پور گئے ہیں۔ کس سے کہوں؟ ہمارا یہاں کون ہے؟"

بابورام "مگر زمیندار صاحب تو بگڑ رہے ہیں۔ کہتے ہیں سب کو بلاؤ۔ جو نہ آئے۔ اُس کا مکان پھونک دو۔ کل برات آ رہی ہے۔ ان کے لئے دہی پکوڑیاں نہ بنیں تو میری ناک کٹ جائے گی"۔

جمنا۔ (چمک کر) "پہلے کہاں سو رہے تھے؟ جواب پوچھتے ہیں۔ ایسی چیزوں کا کھیال پہلے سے کیا جاتا ہے"۔

بابورام "عین وقت پر معلوم ہوا۔ کہ بیسن کم ہے"۔

جمنا "تو اس میں ہماری کیا کھتا ہے؟ میں تو نہ جا سکوں گی"۔

بابورام۔ (نرمی سے) "سوچ لو۔ زمیندار صاحب بگڑے ہوئے ہیں۔ دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر رکھنا ٹھیک نہیں"۔

جمنا "پر اس کے پاس کون رہے گا؟ پہلے پُت کو بھیج دیا۔ اب مجھے بلا رہے ہیں۔ کیا انھوں نے اسے مارنے کا پھیسلہ ہی کر لیا ہے؟ آدمی کو اتنا بے درد بھی نہ ہونا چاہیئے"۔

بابو رام "اب میں کیا جانوں۔ جو انہوں نے حکم دیا۔ وہ تم سے کہہ دیا"۔
جمنا "بہت اچھا کیا۔ اب جا کر اُن سے کہہ دو۔ میں ضرور آجاتی۔ مگر گنگی بیمار ہے۔ عجب نہیں رات ہی میں چل بسے اس لئے مجھے چھما کریں۔ میرا آنا مشکل ہے"۔

بابو رام نے یہ سب باتیں جا کر زمیندار سے کہہ دیں۔
زمیندار صاحب پہلے ہی خفا تھے۔ یہ سُن کر اور بھی بگڑ گئے۔ بولے۔ "بیمار ہے تو ہُوا کرے۔ مجھے اس کی پروا نہیں۔ اُسے آنا ہو گا۔ ایک گھر کی دو عورتیں ہیں۔ دونوں غیر حاضر۔ غضب خدا کا۔ ان لوگوں کو مروت تو چھُو بھی نہیں گئی ہے۔ پُورے طوطا چشم ہیں۔ عین وقت پر کوئی نہ کوئی بہانہ بنالیں گے۔ صاف جواب دیدیں گے۔ ہم تو ان سے عاجز آ گئے۔ جائیے۔ دو آدمی لے جائیے زبردستی گھسیٹ لائیے"۔
زمیندار صاحب کے پاس دو آدمی بیٹھے تھے۔ ایک بولا۔ "ان کا یہی علاج ہے"۔

دُوسرے نے کہا "اتنا بھی نہیں سوچتے۔ کہ بیٹی کا بیاہ ہے"۔
لیکن بابو رام میں ہمت نہ تھی۔ سوچتے تھے۔ مہابیر بھی گھر میں نہیں۔ اب جمنا بھی چلی آئی۔ تو مریضہ کی خبر گیری کون کرے گا۔ اُن کا ضمیر ابھی بالکل نہ مر گیا تھا۔ ابھی اُس میں کچھ جان باقی ہے۔ آہستہ سے بولے۔ "مہابیر بھی گھر میں نہیں ہے"۔
زمیندار کو ایسا معلوم ہُوا۔ جیسے بابو رام بھی جمنا کے ساتھ مل کر اُن کی

نافرمانی کرنے پر آمادہ ہے۔ کڑک کر بولے "تم مجھے مشورہ دینے والے کون؟ میں نے حکم دیا ہے۔ تم اُس کی تعمیل کرو۔ ایسے ہی رحم دل ہو۔ تو اُس کی جگہ تم چکّی لے کر بیٹھ جاؤ۔ کیوں؟"

بابو رام چُپ چاپ باہر نکل آئے۔ اور گنگا کے گھر کی طرف چلے۔ اُن کا ضمیر پہلے اُن کی طرف دیکھتا تھا اب بآواز بلند چلّانے لگا۔ اب اُس میں کتنی طاقت تھی کتنی جان! انہیں ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ضمیر انہیں پھٹکار رہا ہے۔ جیسے کہتا ہے۔ تم کتنے ذلیل ہو۔ جو زمیندار تمہاری بات نہیں سُنتا۔ تم ایک واجب بات کہتے ہو وہ اُس کی تحقیر کرتا ہے۔ اِس مُلازمت سے تو بیکاری بھلی۔ آدمی ہو تو اِس نوکری پر لات مار دو۔ ایک مریض کو موت کے مُنہ میں کیسے دھکیل دو گے۔ تم منشی ہو۔ قصائی نہیں ہو۔

انہیں خیالات میں محو گنگا کے مکان میں جا پہنچے۔ اور بولے۔ "جمنا! زمیندار صاحب نہیں مانتے۔ کہتے ہیں۔ زبردستی پکڑ منگواؤ۔ بولو کیا ارادہ ہے۔ چلتی ہو یا آدمی بلواؤں؟"

جمنا نے سکون کے ساتھ پُوچھا "تم نے کہا نہیں۔ کہ گنگی بیمار ہے۔ اکیلی کیسے رہے گی"۔

بابو رام "وہ کچھ نہیں سُنتے"۔

جمنا "اُس کا بخار اور بھی بڑھ گیا ہے۔ جانے کیا بک رہی تھی۔ اب مجھے پہچانتی بھی نہیں۔ میں تو بید جی کے یہاں جانے کو تھی"۔

بابو رام "اب ویدجی کے یہاں نہ جاؤ۔ زمیندار صاحب کے یہاں چلو۔ ورنہ انرتھ ہو جائے گا"۔

یہ سن کر جمنا کو بھی غصہ آگیا۔ ذرا تیز ہو کر بولی "کیا انرتھ ہو جائیگا؟"

بابو رام "آدمی بلانے پڑیں گے۔ زبردستی پکڑ کر لے جائیں گے"۔

جمنا۔ ارے تم یہاں تک کر گجرو گے۔ آدمی ہو یا کسائی؟ کیا تمہارے دل میں جرا بھی دھرم کا کھیال نہیں"۔

بابو رام۔ بہتر یہی ہے۔ چپ چاپ چلی چلو۔ ورنہ ہمیں بھی پیسو گی۔ بے عزتی بھی کراؤ گی"۔

اس وقت بابو رام کی آنکھوں میں جیسے خون چھا گیا تھا۔ جیسے وہ دیوانہ ہو گیا تھا۔ جمنا نے یہ دیکھا۔ تو خوف زدہ ہو گئی۔ اُس نے گنگی کی طرف بے بسی کی نگاہوں سے دیکھا۔ اور دروازہ بند کر کے باہر نکل گئی۔ اب گنگی کے پاس سوائے ایک ٹمٹماتے ہوئے چراغ کے اور اور کوئی بھی نہ تھا۔ مگر اس چراغ کی بقا بھی کے گھڑیاں تھی۔

(۴)

جمنا ساری رات چکی پیستی رہی۔ دوسری کہاریاں ہنستی تھیں۔ ایک دوسرے سے مذاق کرتی تھیں۔ دیہاتی گیت گاتی تھیں۔ کبھی کبھی چکی چھوڑ کر سستا بھی لیتی تھیں لیکن جمنا کے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکلا نہ اُس کے ہاتھ ایک لمحہ کے لئے بھی رکے۔ گویا وہ جیتی جاگتی عورت نہ تھی۔ لوہے کی بے جان مشین تھی۔ جو نہ بولتی ہے۔ نہ تھکتی ہے۔ صرف کام کئے جاتی ہے۔

رات کو دس بجے بیٹھی تھی۔ صُبح چھ بجے تک چکّی پیستی رہی۔ زمیندار نے اُس کا بیسن دیکھا۔ تو سنّاٹے میں آ گئے۔ اُنہیں تعجّب سا ہُوا۔ جمنا کا بیسن سب سے زیادہ تھا۔ کماریوں میں کئی جوان اور مضبوط لڑکیاں بھی تھیں۔ لیکن جتنا بیسن جمنا نے پیسا تھا۔ اُتنا اور کسی نے بھی نہ پیسا۔ زمیندار صاحب بولے "جمنا! تیرا بیسن سب سے زیادہ ہے"۔

کسی دُوسرے موقعہ تعریف و ثنا کے یہ لفظ سُن کر جمنا خوشی سے جھُومنے لگتی۔ لیکن اِس وقت اُس پر ذرا اثر نہ ہُوا۔ کچھ دیر چُپ چاپ زمیندار کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر کہنے لگی "کوئی اَور کام ہو۔ تو وُہ بھی بتا دیجئے۔ لگے ہاتھوں کرتی جاؤں ——"

یہ لفظ نہ تھے۔ زہر میں بُجھے ہوئے تیر تھے۔ زمیندار صاحب کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ کھسیانے سے ہو کر بولے "نہیں جمنا! اب اَور کوئی کام نہیں۔ جاؤ جا کر گنگی کو دیکھو۔ بیچاری رات بھر اکیلی رہی ہے"۔

جمنا پہلے آہستہ آہستہ چلی۔ پھر دوڑنے لگی۔ اور گھر کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ اُس کے ساتھ ہی اُس کے جگر خراش نالے ہوا میں گونجنے لگے چارپائی پر گنگا نہ تھی۔ گنگا کی لاش تھی۔ اڑوسی پڑوسی آ کر جمع ہو گئے۔ اور اظہار افسوس کرنے لگے۔ عورتیں اندر چلی گئیں۔ مرد باہر بیٹھ گئے۔ گنگا کی باتیں یاد کرتے تھے اور روتے تھے۔ اِسی طرح دو گھنٹے گزر گئے۔ تب ایک پڑوسی نے دروازہ کے قریب جا کر کہا "جمنا! رونا دھونا بند کرو۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب کفن کی تیاری کرو۔ دیر ہو رہی ہے"۔

لیکن جمنا کیا کرتی؟ اُس کے پاس چار پیسے بھی نہ تھے۔ پڑوسی کی بات سُن کر اُس کا دِل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ کیا کرے کیا نہ کرے؟ کہاں جائے؟ کس کے رُوبرو دست سوال دراز کرے؟ اِس سیاہ بختی کے موقعہ پر اُن کی امداد کون کرے گا؟ جمنا نے چاروں طرف دیکھا مگر اُسے کوئی بھی ایسا ہمدرد نظر نہ آیا۔ مہاجن سے غرض پُوری ہو سکتی تھی۔ مگر چند دن پہلے اُس سے اور اُن سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ اِس لئے اُس سے بھی اُمید نہ تھی۔ جمنا نے آہ سرد بھری۔ اور جواب دیا "بھیا آ لیں۔ تو انتجام کریں۔ مَیں کیا کر سکتی ہوں؟"

تین بجے کے قریب مہابیر لوٹا۔ تو ایسا خوش تھا۔ جیسے اُسے دیوتا سے بروان مِل گیا ہو۔ جیسے کئی برسوں کی خواہش پُوری ہو گئی ہو۔ اُسے سنسار پور میں ایک حکیم نے دوا دی تھی۔ اور کہا تھا۔ ناممکن ہے۔ کہ اس سے تیری کمہاری کا بخار نہ اُتر جائے۔ حکیم کی یہ بات مہابیر کے دِل میں بیٹھ گئی تھی۔ اُسے یقین تھا۔ کہ حکیم کا یہ قول پتھر کی لکیر ہے۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ دوا نہ تھی امرت تھا۔ وہ چاہتا تھا۔ پَر ملیں تو اُڑ کر گاؤں پہنچ جائے۔ اور گنگا کو دوا کھلاوے۔ مگر گاڑیوں کے بیل دھیرے دھیرے چلتے تھے۔ اور انہیں مہابیر کی بے قراری اور گنگا کی بیماری دونوں کی پروا نہ تھی +

آخر گاڑیاں گاؤں کے قریب پہنچیں۔ مہابیر کا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ اُس نے اپنی گاڑی ایک دُوسرے کہار کے سپرد کی۔ اور آپ جلدی جلدی

قدم اُٹھاتا ہُوا آگے بڑھا۔ دیکھتے دیکھتے وہ بہت دُور نکل آیا۔ اب گاؤں سامنے دکھائی دے رہا تھا۔ وہ مندر کا کلس تھا وہ زمیندار کا مکان۔ مہابیر کے پاؤں میں گویا پَر لگ گئے تھے۔ وہ اُڑا چلا جاتا تھا۔ اِس وقت اس کی رفتار گھوڑے سے کم نہ تھی۔ راہ میں ایک دو آدمی ملے۔ مگر مہابیر اُن سے مخاطب نہ ہُوا۔ اور اپنے گھر کے سامنے جا پہنچا۔ مگر یہ کیا——— کچھ آدمی اُس کے دروازے پر بیٹھے تھے اور اندر جمنا رو رہی تھی۔

مہابیر جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ جس طرح ہم خواب میں بعض وقت چلنا چاہتے ہیں۔ اور نہیں چل سکتے۔ اِس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا کسی نے پاؤں میں سیسہ بھر دیا ہے۔ گویا پاؤں کو زمین نے پکڑ لیا ہے۔ ان میں چلنے کی سکت نہیں رہی۔ مہابیر کی بھی یہی حالت تھی۔ اُمید سینکڑوں کوس کا فاصلہ طے کر سکتی ہے۔ مگر مایوسی کے لئے ایک قدم چلنا بھی دوبھر ہو جاتا ہے۔ مہابیر کا سر چکرانے لگا۔ زمین آسمان سب گھومتے ہوئے دکھائی دیئے۔ پڑوسی اس سے اظہار افسوس کرتے تھے۔ کہتے تھے۔ گنگی جیسی نیک عورت سارے گاؤں میں نہیں۔ وہ عورت نہ تھی۔ دیوی تھی۔ کیسی ہنس مکھ۔ کیسی محنت پسند۔ تجھ پر تو جان دیتی تھی۔ اُس کے مرنے سے تیرے بھاگ پھُوٹ گئے۔ مگر مہابیر نے جیسے یہ لفظ سُنے ہی نہیں وہ سوچتا تھا۔ کیا وہ سچ مچ مر گئی؟ اُسے کبھی کبھی شُبہ ہوتا تھا۔ جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہے۔ ابھی آنکھ کھُل جائے گی۔ ابھی وہ آنکھیں ملتی ہوئی اُٹھ کر بیٹھ

جائے گی۔ وہ چاہتا تھا۔ اِس خوفناک خواب کا قاتل سلسلہ ٹوٹ جائے۔ لیکن ہائے افسوس! یہ خواب وہ خواب نہ تھا۔

اتنے میں جمنا نے آکر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور روتے روتے آہستہ سے کہا۔ رونے کو تو ساری عمر پڑی ہے۔ اس وقت کہیں سے دس روپے مانگ لاؤ۔ تو ارتھی اُٹھے۔ اب مہابیر کو یقین ہُوا۔ کہ یہ خواب نہیں ہے۔ درحقیقت میری دُنیا برباد ہو گئی ہے۔ دیکھتے دیکھتے وہ جا کر گنگا کی لاش سے لپٹ گیا۔ اور رونے لگا۔ مگر رونے سے کام نہ چلتا تھا۔ گھر میں لاش پڑی تھی۔ اور اس کے لئے کفن وغیرہ کا انتظام کرنا تھا۔ اور گھر میں ۵ روپے بھی نہ تھے۔

(۵)

شام کے وقت اِدھر ارتھی اُٹھی۔ اُدھر برات کا جلوس نکلا۔ گاؤں کے درمیان میں چوک تھا۔ وہاں دونوں کا سامنا ہو گیا۔ ایک طرف بیاہ کے باجے بجتے تھے۔ دُوسری طرف "ہری کا نام ست ہے" کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ اُدھر ابتدا تھی۔ روشن، شاداں اور متحرک! اِدھر انتہا تھی۔ تاریک، سرد اور پُرحسرت۔ براتیوں کا دماغ ویسے ہی آسمان پر ہوتا ہے۔ وہ سمجھتے تھے۔ یہ کہار ہیں۔ خود بخود ایک طرف ہٹ جائیں گے۔ ہمیں مُنہ سے کہنے کی نوبت نہ آئے گی۔ اُدھر کہاروں کا یہ خیال تھا۔ کہ ہم ارتھی لئے جا رہے ہیں۔ ان کو رستہ چھوڑنا چاہیئے۔ براتی ہیں تو کیا ہُوا؟ کیا اب اتنی مروّت بھی نہ کریں گے۔ نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ دونوں اَڑ گئے۔

نہ یہ ہٹتے نہ وہ۔ راستہ بند ہو گیا۔ برات کے لوگ چند منٹ خاموش کھڑے انتظار کرتے رہے۔ اِس کے بعد اُن میں سے ایک نوجوان نے چلّا کر کہا " ارے ایک طرف کیوں نہیں ہٹ جاتے؟ دیکھتے نہیں ہو۔ برات آرہی ہے" ؛

کہار چُپ چاپ کھڑے دیکھتے رہے۔ گویا اُن سے کسی نے کچھ کہا ہی نہیں۔ گویا اُنہوں نے کچھ سُنا ہی نہیں ؛

براتی نے پھر کہا " ہم کہتے ہیں۔ ایک طرف ہٹ جاؤ۔ یہ زمیندار کی برات ہے۔ ہمیں گزر جانے دو" ؛

کہار اب کے بھی چُپ رہے۔ مہابیر نے اپنی بے رونق، اُداس، پُرنم آنکھیں اُوپر اُٹھائیں۔ اور آہ سرد بھر کر پھر زمین کی طرف دیکھنے لگا ؛

تیز مزاج نوجوان نے تیسری مرتبہ پھر کہا " ارے تم آدمی ہو یا جانور۔ سُنتے نہیں۔ ہم کیا کہہ رہے ہیں؟ ہٹو رستے سے۔ ورنہ جُوتے مار کر بھگا دیں گے" ؛

برات کے دو بُوڑھے آدمیوں نے نوجوان کو روکنے کی کوشش کی۔ کہا یہ موقعہ دھونس جمانے کا نہیں۔ ہم ہی ایک طرف ہو جائیں گے۔ تو عزت نہ گھٹ جائے گی ؛

مگر نوجوان پر اس نصیحت کا ذرا بھی اثر نہ ہُوا۔ وہ اور بھی تیز ہو کر بولا " سالے مُنہ دیکھتے ہیں۔ ایک طرف نہیں ہٹتے۔ ہم کہتے ہیں۔ تم سُنتے ہو یا نہیں؟"

اب کہار بھی طیش میں آگئے۔ ایک نے جواب دیا "بابو صاحب جرا جبان سنبھال کر بولو۔ گالی دمی۔ تو ٹھیک نہ ہوگا۔ہم گریب ہیں۔ تو اس سے کیا۔ تم ہمیں گالیاں دینے والے کون ہوتے ہو؟ جمیندار کی دھونس ہے۔ تو جاؤ۔ جمیندار سے کہو۔ہم سے تم سے کوئی مطلب نہیں"۔

ایک اور براتی نے قدرے نرمی سے کہا "لڑتے کیوں ہو بھئی! ذرا ایک طرف ہو جاؤ"۔

کہار "کیوں ہٹ جائیں؟ تمہاری کھوسی ہو ہٹ جاؤ۔ ہم کبھی نہ ہٹیں گے"۔

براتی "ارے یار میرے! خواہ مخواہ جھگڑے کو طول دے رہے ہو۔ بات کچھ بھی نہیں ہے"۔

کہار "مُردے کی تو انگریج بھی عجت کرتے ہیں۔ سہر میں کئی دپھا دیکھا ہے۔ جا رہے ہیں۔ رستہ میں ارتھی آگئی۔ جھٹ ٹوپی اُتار کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پیر گاڑی پر جا رہے ہوں۔ تو پیر گاڑی سے اُتر آتے ہیں۔ تم ان سے بھی بڑھ گئے۔ اتنا گرور بھی کیا؟ ہم گریب ہیں۔ پر کیڑے مکوڑے نہیں ہیں"۔

براتی "ضد کر رہے ہو"۔

کہار "جد ہی سہی۔ مُدا رستہ نہ دیں گے"۔

مہابیر نے کہاروں کی طرف یاس کی نگاہ سے دیکھا! ورمنت آمیز لہجہ میں کہا "چلو، ہم ہی ہٹ جائیں ہمیں کون سا راج مل جائے گا؟ ان کی بات رہ جائے۔ یہ کھوس ہو لیں"۔

ایک کہار نے چڑھ کر کہا "ہم پہلے ہی بہت دبے ہوئے ہیں اور دبنے لگے۔ تو یہ ہمیں چندہ ہی نکل جائیں گے"۔

دُوسرا "ٹھیک تو ہے ہم جتنا دبتے ہیں۔ یہ لوگ اتنا ہی اور دباتے ہیں۔ بھلمنسی کا جمانہ ہی نہیں ہے"۔

مہابیر "جمیندار کی برات ہے؟"

کہار "کھوب جانتے ہیں!"

مہابیر "وہ سُنیں گے تو کتنے کھپا ہوں گے!"

کہار "گنگی بیمار پڑی تھی۔ جمنا کو چکی پر لگا دیا۔ اس کا ہتیارا جمیندار ہی ہے"۔

مہابیر۔ (بے بسی سے) "وہ بڑے آدمی ہیں۔ جو چاہیں کریں"۔

کہار "آدمی کا ہے کو ہیں۔ پُورے راچھس ہیں۔ کہنے لگے۔ بڑے آدمی ہیں۔ ارے بھائی! کیا بڑے آدمیوں کی یہی باتیں ہیں؟"

مہابیر "گاؤں سے نکال دیں گے"۔

کہار "بڑی کھوسی سے نکال دیں۔ یہاں کون سے سونے کے کور کھا رہے ہیں۔ یہاں سے نکلیں گے سہر میں جا رہیں گے۔ یہاں بھی محنت مجوری کرتے ہیں۔ وہاں بھی محنت مجوری کریں گے۔ بلکہ وہاں کسی کی دھونس نہ ہوگی۔ کوئی ہر بکھت سر پر سوار نہ رہے گا"۔

مہابیر نے آہ سرد بھری اور سر جُھکا لیا۔ کہاروں نے ہری کا نام ست ہے۔ چلاّنا شروع کر دیا۔ برات میں جو نوجوان تھے۔ اُنہوں نے

باجے والوں کو اشارہ سے کہا۔ خُوب زور سے بجاؤ۔ اُدھر باجے بجنے لگے۔ اِدھر کہاروں نے ہری کا نام لینا شروع کر دیا۔ گاؤں کے لوگ چُپ چاپ کھڑے تھے۔ اور تماشہ دیکھتے تھے۔ اتنے میں زمیندار کے منشی صاحب نے آ کر کہا "یہ تم لوگوں نے کیا تماشا بنا رکھا ہے؟ ایک طرف کیوں نہیں ہو جاتے؟ زمیندار کا غصّہ جانتے ہو یا نہیں۔ چلو ہٹو ایک طرف۔ برات گزُر جانے دو"۔

بھیکھا نے انگارے کی طرح لال لال آنکھیں دکھا کر جواب دیا۔ "برات ہمیں کیوں نہ گذر جانے دے؟ وہ کھوسی میں ہیں۔ گم کھا جائیں۔ ہمارا آدمی مر گیا ہے۔ اور صرف اِن لوگوں کی خاطر۔ کٹے پر نمک چھڑکتے ہیں"۔

منشی۔ (نرمی سے) "دبنا تو تمہیں ہی پڑے گا۔ امیر غریب کا مقابلہ کیا"۔

بھیکھا "ایسا مقابلہ ہو گا کہ یہ بھی یاد رکھیں گے"۔

منشی "ارے یار جانے بھی دو۔ لو ایک طرف ہو جاؤ دو منٹ میں گزُر جائیں گے"۔

بھیکھا "منشی جی! یہ باتیں رہنے دو۔ اِن باتوں میں ہم نہ آئیں گے"۔

تیز مزاج براتی نے گرج کر دُوسرے براتیوں سے کہا "تم نے دیکھا یہ کس قدر کمینے آدمی ہیں؟ ہم طرح دے رہے ہیں۔ یہ سر پر چڑھے جاتے ہیں۔ آؤ بڑھو آگے۔ لاش کو روندتے ہوئے نکل جائیں گے"۔

لفظ کیا تھے۔ جلتی ہوئی دیا سلائیاں تھیں۔ تھا بیر کے غصّہ کی

آگ پہلے سلگتی تھی۔ اب اس کے شعلے بھڑکنے لگے۔ پینترا بدل کر آگے بڑھا۔ اور للکار کر بولا "کون مائی کا لال ہے جو ارتھی کو پاؤں تلے روندیگا؟ ایک ایک کا خون نہ پی جاؤں۔ تو جھابر نام نہیں۔ یہاں لہو کی ندی بہہ جائیگی۔ سادی کرنے آئے ہو۔ سر پیٹتے ہوئے جاؤ گے تم نے گریبوں کی کھوساند دیکھی ہے۔ ان کا گسہ نہیں دیکھا"

چھیدا اب تک چپ تھا۔ وہ سب کہاروں میں جوان تھا بانکا بدن۔ عضو عضو میں جوش۔ بائیس تیئس سال کی عمر۔ جھابر کی باتیں سن کر اس کا بھی خون کھولنے لگا۔ دانت پیس کر بولا "تم امیر ہو گے تو اپنے گھر ہو گے۔ یہاں کسی کی ہیکڑی نہ چلے گی۔ خیر چاہو تو چپ چاپ ایک طرف ہو جاؤ۔ ورنہ یہاں کھون ہو جائیں گے یہ کہے دیتا ہوں"۔

براتیوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ ان کو یہ امید نہ تھی۔ کہ کہار اس طرح اڑ جائیں گے۔ وہ سمجھتے تھے پنچ لوگ ہیں۔ ذرا سی دھمکی میں پیچھے ہٹ جائینگے ہم جوتے ماریں۔ تب بھی منہ نہ اٹھائینگے۔ لیکن معاملہ بے ڈھب بیٹھا۔ کہار مرنے مارنے پر آمادہ تھے۔ براتیوں میں یہ ہمت نہ تھی انھوں نے چند منٹ آپس میں مشورہ کیا۔ اور اس کے بعد رستہ چھوڑ کر بازار کے دونوں طرف ہو گئے۔ جیسے ہارے ہوئے سپاہی جیتے ہوئے جرنیلوں کو رستہ دیتے ہیں۔ گاؤں کے لوگ یہ دیکھتے تھے اور مسکراتے تھے۔

کہار ارتھی لے کر آگے بڑھے۔ اور فاتحانہ انداز سے گذر گئے۔ تھوڑی دیر بعد لاش جل رہی تھی۔ اور کہار دھیرے دھیرے باتیں کر رہے تھے۔

ایک بولا کیا بڑھ بڑھ کر باتیں بناتے تھے ایک ہی للکار میں دھوتیاں ڈھیلی

ہو گئیں۔ بھیکھا نے کہا "سمجھتے تھے۔ کہار ہیں۔ یہ پتہ نہ تھا۔ کھون پی جائینگے"۔
چھیدا۔ "یہ سب مہابیر کے گنے کا پرتاپ ہے۔ تم نے دیکھا نہیں؟ اس کی آنکھوں سے آگ برس رہی تھی۔ مجھ کو تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے سنگھ دھاڑ رہا ہے"۔
مہابیر۔ "اس جیت کا سہرا بھیکھا کے سر ہے۔ وہ نہ ہوتے۔ تو ہم چپ چاپ ایک طرف ہو جاتے۔ ایک دھپا بھی انکار نہ کرتے"۔
بھیکھا۔ "نہیں بھیا! جھوٹی پرسنا نہ کرو۔ یہ جیت ہماری نہیں۔ گنگا کی ہے۔ وہ دیوی تھی۔ اس کی پرالبدھ میں ہار نہ لکھی تھی۔ جب تک جیتی رہی۔ اس کی کسی نے بے عجتی نہیں کی۔ یہاں تک کہ مرنے کے بعد اس کی لاش کی بے عجتی نہیں ہوئی۔ وہ استری نہ تھی۔ دیوی تھی"۔

مہابیر چپ چاپ ہوا میں دیکھ رہا تھا۔ اس کو ایسا معلوم ہوا جیسے گنگا سامنے کھڑی مسکرا رہی ہے۔ اور اس کی طرف محبت آگیں نگاہوں سے تاک رہی ہے۔

ادھر گاؤں میں برات کے لوگ دہی بڑے کھاتے تھے۔ اور خوش ہوتے تھے۔ لیکن وہ دہی بڑے ایک غریب کہاری کے لہو میں تلے ہوئے ہیں۔ یہ کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔

راجپوت کی شکست

مختصر ڈراما

تعارف

مہامایا .... مہارانا جسونت سنگھ کی رانی

کلینا .... مہارانا جسونت سنگھ کی ماں

جسونت سنگھ .... جودھپور کے راناصاحب

اچل سنگھ .... محافظ قلعہ

پہلا منظر

جودھپور کے قلعہ میں ایک کمرہ

وقت صبح

(مہامایا اور کلینا باتیں کر رہی ہیں)

مہامایا۔ نہیں، ماں! نہیں، میرا دل ابھی تک مطمئن نہیں ہوا۔ میں کچھ نہیں کر سکتی۔

کلینا۔ آٹھ دن گزر گئے ہیں، لیکن تیرا دل ابھی تک مطمئن نہیں ہوا! یہ تیرا

پاگل پن ہے۔

پھاما یا۔ ٹھیک ہے! میں ہی پاگل ہوں۔ وہ تمہارا لڑکا ہے تم اس کی ماں ہو۔ تم اس سے کیا کہہ سکتی ہو! اور میں پرائے گھر کی بیٹی دبے بسی سے) ہاں ہاں میں ہی پاگل ہوں!

کلینا۔ (محبت سے) میری بیٹی! جو کچھ بھی ہو، وہ تیرا شوہر ہے۔

پھاما یا۔ لیکن وہ بزدل ہے، اس نے دشمن کو پیٹھ دکھائی ہے۔ وہ جان بچانے کیلئے میدان جنگ سے بھاگا ہے۔ ماں! ذرا سوچو۔ لوگ اپنے گھر میں ہمارے متعلق کیا باتیں کر رہے ہونگے۔ میری راج سکھیاں جو میری خوش قسمتی پر میرا بھاگ سراہتی تھیں۔ آج میری بدنصیبی پر افسوس کر رہی ہوں گی۔

کلینا۔ پھاما یا! میری بچی!

پھاما یا۔ دبھرائی ہوئی آواز میں) اگر وہ راجپوت تھا، اگر اس نے راجپوتنی کا دودھ پیا تھا، اگر وہ راجپوت ماں کی گود میں پل کر جوان ہوا تھا۔ تو اسے واجب تھا، کہ میدان جنگ میں ڈٹ جاتا۔ موت کے خوف کو پاؤں تلے مسل ڈالتا، اور دنیا کو دکھا دیتا کہ راجپوت کا بچہ موت اور زندگی دونوں کو یکساں سمجھتا ہے۔ ماں! میں سمجھتی تھی میرا شوہر سورما ہے۔ میں سمجھتی تھی، وہ عزت کی زندگی اور عزت کی موت کی قیمت جانتا ہے۔ لیکن (آہ سرد بھر کر) افسوس میرا خیال غلط نکلا —— وہ کائر ہے وہ شکست کھا کر بھی اپنی اور دوسروں کی نگاہوں میں ذلیل ہو کر بھی زندہ رہنا چاہتا ہے۔

کلینا۔ میری بچی! جوش میں نہ آ۔ اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ حکم دے

قلعہ کا دروازہ کھول دیا جائے آٹھ دن دروازے پر پڑا رہنا کم سزا نہیں ہے۔
پھاما بائی۔ کم سزا نہیں ہے۔ ماں! راجپوت کے بیٹے کے لئے شکست کھا کر بھاگ آنا
ایسا جرم ہے، جس کی کوئی سزا نہیں، ایسا گناہ ہے، جس کا کوئی کفارہ نہیں۔
کاش میری آنکھیں یہ دن دیکھنے سے پیشتر سدا کے لئے بند ہو جاتیں، تو میں
اسے اپنی خوش نصیبی تصور کرتی۔

کلینا۔ صبر کر میری بچی! صبر کر تیری زبان سے ایسے الفاظ سن کر میرا دل
ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا ہے۔

پھاما بائی۔ اور اپنے بیٹے کی بہادری کا واقعہ سن کر تو تمہارا سینہ خوشی سے
پھول اٹھا ہوگا! کیوں؟

کلینا۔ (آہ سرد بھر کر) یہ تو کہتی ہے۔ اے میری بچی تو، جو مجھے اچھی
طرح سے جانتی ہے۔ آج تو مجھے یہ طعنہ دیتی ہے۔

پھاما بائی۔ (کلینا کے کندھے پر سر رکھ کر) ماں! کیا تجھے میری بدنصیبی پر
رحم نہیں آتا؟ راجپوت ماں کی کوکھ سے جنم لیا۔ راجپوت گھر میں بیاہی
گئی۔ اور میرا شوہر بزدل، کمینہ، زندگی کا لوبھی ہے۔ جہاں
راجپوتوں کا دل خوشی سے دیوانہ ہو جاتا ہے جہاں بہادر
جانبازوں کو مرنے جینے کا خیال نہیں رہتا۔ اس نے وہاں
بھی اپنی زندگی کو پیارا سمجھا۔ اور بھاگ کر گھر میں پناہ لینے
کے لئے آیا ہے۔ ماں! کیا وہ سچ سچ تیرا بیٹا ہے۔ نہیں، معلوم
ہوتا ہے وہ تیرا بیٹا نہیں ہے۔ تو نے کسی کا بیٹا لے کر پال لیا ہوگا۔ تو

بہادر ہے۔ تو سچی راجپوتنی ہے، تیرے خون میں یہ بے غیرتی نہیں ہو سکتی۔ وہ تیرا بیٹا ہے ——— وہ تیرا بیٹا نہیں ہو سکتا۔

کلینا۔ میری بچی! چاند اور سورج گرہن کے موقعہ پر سیاہ ہو جاتے ہیں۔

ہیمانایا۔ (یکایک چونک کر) ماں مجھے ایک اور خیال آیا ہے (سوچتی ہے)

کلینا۔ کیا؟

ہیمانایا۔ (رک رک کر) ممکن ہے یہ رانا نہ ہوں کوئی دوسرا مکار، جعلساز ان کی شکل میں ہمیں دھوکا دینے آگیا ہو . . . . . .
وہ تو ایسے بے غیرت نہ تھے، ان کی رگوں میں نہ ہارنے والی شجاعت، ان کے خون میں نہ بجھنے والی حرارت، انکے بازوؤں میں نہ جھکنے والی طاقت تھی۔ میں نے ان کو بہت قریب سے دیکھا ہے، میں نے ان کا دل پڑھا ہے . . . . . . وہ جانباز تھے ان کو عزت پیاری تھی۔ ان کو جان پیاری نہ تھی۔

کلینا۔ میرا بھی یہی خیال تھا۔ میری بچی۔

ہیمانایا۔ ایک دن کہتے تھے۔ راجپوت کی کسوٹی موت ہے۔ میں نے ہنس کر پوچھا، اگر آپ کبھی میدان جنگ سے شکست کھا کر بھاگ آئیں تو مجھے کیا کرنا چاہئے؟ ماں! جانتی ہو۔ انھوں نے میرے اس گستاخانہ سوال کا کیا جواب دیا؟ ماں! اگر تم اس وقت پاس

ہوتیں۔ تو اپنے بیٹے کو سینہ سے لگا کر رونے لگتیں۔ انہوں نے کہا مایا! اگر میری زندگی میں کبھی ایسا وقت آجائے۔ تو اپنی کٹار، میرے سینہ میں گھونپ دینا۔ یہ مجھ پر سب سے بڑا احسان ہوگا۔

کلینا۔ اس وقت وہ سچے راجپوت کی طرح بول رہا تھا۔

چھامایا۔ ایک دن کہتے تھے۔ میدان جنگ میں شکست کھانا ذلت نہیں۔ ذلت یہ ہے کہ انسان شکست کھا کر بھی زندہ رہے۔ سچا راجپوت شکست کھا سکتا ہے، شکست کھانے کے بعد زندہ نہیں رہ سکتا —— وہ اپنی ماں، اپنی بہن، اپنی بیوی کی آنکھوں کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتا۔ اس کے لئے شکست اور موت ایک ہی چیز کے دو مختلف نام ہیں۔

کلینا۔ میرا بچہ سچ مچ بڑا بہادر تھا۔ پتہ نہیں۔ آج اُسے کیا ہوگیا۔

چھامایا۔ (پاگلوں کے انداز سے) کچھ نہیں ہوا ماں! وہ آج بھی اسی طرح بہادر ہیں۔ وہ لڑتے لڑتے مارے گئے ہیں۔ اور یہ کمینہ یہ ذلیل شخص جو ہمارے دروازے پر پڑا ہے۔ ان کا لباس چرا کر چوروں اور ڈاکوؤں کو ساتھ لے کر ہمیں دھوکا دینے آیا ہے۔

کلینا۔ کاش تمہارا خیال درست ہوتا۔

چھامایا۔ درست ہوتا؟ کیا تمہیں بھی شبہ ہے؟ تم جو ان کی ماں ہو۔ کیا تم بھی ان کو اس قدر بزدل سمجھتی ہو؟ نہیں ماں! نہیں۔ یہ

وہ نہیں ہیں۔ وہ ضرور جنگ میں مر چکے ہیں، میں اب بیوہ ہو چکی ہوں
نوکروں سے کہو۔ چتا چُن دیں۔ میں ابھی ستی ہو جاؤں گی۔

کلپنا۔ مہامایا کو گلے سے لپٹا کر روتے ہوئے) میری بچی! یہ تجھے
کیا ہو گیا ہے۔

مہامایا۔ (ضبطی ان سنی کر کے) وہ سورگ میں میرا انتظار کر رہے ہوں گے
جھک جھک کر نیچے کی طرف دیکھتے ہوں گے، میرے بغیر
گھبرا رہے ہوں گے۔ اجازت دو ماں! (ہاتھ باندھ کر) وہ بہادری
کا فرض پورا کر چکے، اب میری، محبت کا فرض پورا کرنے کی باری
ہے۔ (بلند آواز سے) مالتی! ودیا!! اشنکتی!!!

(تینوں سہیلیوں کا سر جھکائے ہوئے داخلہ)

مہامایا۔ (بغیر ان کی طرف دیکھنے کے آہستہ آہستہ) چندن کی لکڑیاں
منگوا کر چتا چن دو۔ میرے سارے بڑھیا کپڑے، سارے زیور
نکال لاؤ۔ میں آج ان سے ملنے جا رہی ہوں۔ میں آج آگ
کے اڑن کھٹولے پر سوار ہوں گی۔

(پہلے سہیلیاں پریشانی سے ایک دوسری کی طرف دیکھتی ہیں
اس کے بعد کلپنا کی طرف دیکھتی ہیں)

کلپنا۔ معلوم ہوتا ہے پاگل ہو گئی ہے۔

مہامایا۔ (چونک کر) کون پاگل ہے (پھر خود ہی جواب دیتی ہے)
وہی جو میرے شوہر کے لباس میں مجھے دھوکا دینے آیا ہے (کچھ دیر

چپ رہنے کے بعد) سچ سچ وہ پاگل ہے جو سمجھتا ہے کہ میں لباس اور شکل و صورت سے دھوکا کھا جاؤں گی۔ یہ اس کی غلطی ہے۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ کوئی دوسرا شخص ہے۔ یہ راناجی نہیں ہیں (جھومتے ہوئے) یہ راناجی نہیں ہیں۔ کسی سے پوچھ لو یہ راناجی نہیں ہیں۔

کلپنا۔ میری بیٹی! میری پیاری بیٹی!

مہامایا۔ (کٹار نکال کر) اچھا پہلے چل کر اسے کسوٹی پر پرکھ لوں۔ مالتی! ویرا!! شکتی!!! جاؤ جا کر قلعہ کے محافظ سے کہو۔ دروازہ کھول دے۔ میں یہ کٹار اس کے سینہ میں گھونپ دوں گی۔ اگر راناجی ہوں گے۔ میرے اس فعل پر مسکرائیں گے۔ اگر کوئی بزدل کمینہ جعلساز ہوگا۔ کٹار دیکھ کر چلّاتا ہوا بھاگ جائے گا۔ مالتی! ویرا!! شکتی!!!

شکتی۔ مہارانی کیا حکم ہے؟

مہامایا۔ چتا تیار ہوگئی یا نہیں؟ راج پروہت آیا یا نہیں؟ میرے زیور کہاں ہیں؟ تم دیر کر رہی ہو۔ راناجی خفا ہو رہے ہوں گے۔

شکتی (کلپنا سے) راج ماتا! آپ نے دیکھا ان کو کیا ہوگیا ہے۔

کلپنا۔ ان کو پکڑ کر خواب گاہ میں لے چلو۔ اور راج وید سے کہو۔ فوراً آکر دوا دیں۔ میں ابھی آتی ہوں۔

(سہیلیوں کا مہامایا کو سہارا دے کر لے جانا۔ محافظ قلعہ اچل سنگھ کا داخلہ)

کلینا۔ اچل سنگھ! کیا خبر ہے؟

اچل سنگھ۔ رات چار زخمی سپاہی اور مر گئے ہیں۔ مہارانا کے زخم بھی ابھی تک نہیں بھر سکے۔

کلینا۔ (آہ سرد بھر کر) مہارانا مہامایا سے بہت ناراض ہیں گیا!

اچل سنگھ۔ مہارانا ناراض نہیں ہیں، اُداس ہیں۔ ان کو اپنے اوپر غصہ ہے۔ رات کو کئی گھنٹے روتے رہے ہیں۔ ان کو رات بھر نیند نہیں آئی۔ اگر حکم ہو دروازہ کھول دیا جائے۔ آخر کب تک دروازے پر پڑے رہیں گے؟

کلینا۔ میں کیا کر سکتی ہوں؟ مہامایا نہیں مانتی۔

اچل سنگھ۔ آپ بھی حکم دے سکتی ہیں۔ قلعہ میں کون ہے جو آپ کا حکم ٹال جائے۔

کلینا۔ مہارانی مہامایا ہے۔ میں کچھ نہیں کر سکتی۔

اچل سنگھ۔ آپ راج ماتا ہیں۔

کلینا۔ راج ماتا کل کی رانی ہے۔ آج کی رانی مہامایا ہے اس کے سامنے میں بھی سر نہیں اٹھا سکتی۔

اچل سنگھ۔ مگر انہوں نے آپ کی کسی بات کی کبھی مخالفت نہیں کی۔

کلینا۔ یہ ان کی مہربانی ہے۔

اچل سنگھ۔ وزیروں کی رائے ہے۔ آپ ان کو مجبور کر کے

قلعہ کا دروازہ کھلوا سکتی ہیں۔

کلینا۔ یہ میری غلطی ہو گی۔

اچل سنگھ۔ تو پھر آپ کا کیا حکم ہے؟

کلینا۔ مہامایا کو ہوش میں آلینے دو۔ میں ان سے پوچھوں گی۔ اسوقت تم جاؤ۔ دو تین گھنٹے کے بعد آنا۔

دوسرا منظر

(اسی قلعہ کا ایک دوسرا کمرہ)

وقت دوپہر

مہامایا ایک پلنگ پر لیٹی ہے۔ پاس سہیلیاں دیرا، شکتی، مالتی بیٹھی ہیں۔ سرہانے کی طرف دواؤں کی شیشیاں رکھی ہیں مہامایا چپ چاپ چھت کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی ہے۔ اس کے گالوں پر آنسو بہہ رہے ہیں۔ سہیلیاں رومال سے آنسو پونچھ رہی ہیں۔

شکتی۔ مہارانی! رونے سے کیا ہو جائے گا؟ اپنے دل کو بس میں کیجئے۔ یہ معمولی بات ہے۔

مہامایا۔ (آہ سرد بھر کر) شکتی! یہ معمولی بات نہیں ہے۔ مجھ سے میرا فخر چھن گیا۔ ان کے لئے میرے دل میں جو عزت تھی، وہ جاتی رہی۔ میں اپنی نگاہوں میں آپ ذلیل ہو گئی۔ یہ معمولی بات نہیں ہے۔

شکتی۔ لیکن مہارانی! لڑائی میں ہار جیت دونوں کا امکان ہے۔ آخر کسی نہ کسی کو ہارنا پڑے گا۔ دونوں نہیں جیت سکتے۔

مہامایا۔ ہار کا امکان ہے۔ مگر ہار کر ماں کی گود میں پناہ لینے کے لئے بھاگ آنے کا امکان نہیں ہے۔ اور پھر ایک راجپوت کے لئے اوہ شکتی! تم نہیں جانتی۔ میرا خون کھول رہا ہے۔ جی چاہتا ہے قلعہ کی سب عورتیں چلیں اور فصیل پر سے تیر برسا برسا کر ان بھگوڑوں کو ہلاک کر دیں۔ ان کو معلوم ہو جائے۔ کہ جب راجپوت شکست کھا کر گھر لوٹتے ہیں۔ تو ان کی بیویاں، ان کی بہنیں، ان کی مائیں ان کا کس انداز سے خیر مقدم کرتی ہیں! جی چاہتا ہے ہم ان کو بتا دیں۔ کہ اے کمبخت، ذلیل، نامردو! تم اپنا فرض بھول گئے ہو۔ مگر تمہاری عورتوں میں فرض شناسی کا یہ مادہ ابھی تک زندہ ہے دجوش سے اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے) جی چاہتا ہے ہم ان کو بتا دیں، کہ جو راجپوت میدانِ جنگ میں شکست کھا کر

بھاگے گا۔ اس کے گھر کی عورتیں اس کی گردن کاٹنے کے لئے اس کے گھر کے دروازے پر ننگی تلوار لے کر کھڑی ہو جائیں گی۔

شکتی۔ (لٹاتے ہوئے نہایت نرمی سے) لیٹ جائیے! یہ جوش آپ کے لئے مضر ہے۔

مہامایا۔ (سنی ان سنی کر کے) مگر اس کا ٹھہر بزدل کے لئے مضر نہیں ہے۔ (تھوڑی دیر کے بعد) ویرا کیا محافظ قلعہ نے دروازہ کھولدیا۔

ویرا۔ آپ کا حکم کون ٹال سکتا ہے۔

مہامایا۔ یہ میرا حکم نہ تھا، ماں جی کا اصرار تھا۔ ورنہ میں ان کو دروازہ کھول دیتی؟ (یکایک جوش سے) ویرا، شکتی!! مالتی! اٹھو۔ دوڑ کر جاؤ۔ محافظ قلعہ سے کہو۔ دروازہ نہ کھولا جائے میں نے اپنا ارادہ تبدیل کر لیا ہے۔

مالتی۔ دروازہ کھل چکا۔ وہ کبھی کے اندر آ چکے!

مہامایا۔ اب بھی جاؤ۔ میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو (منت سے) اب بھی جاؤ۔ اور ان سارے بھگوڑوں کو دھکے مار مار کر قلعہ سے باہر نکال دو۔ ورنہ اس مقدّس قلعہ کا مقدّس فرش ناپاک ہو جائیگا۔

(یکایک کلینا کا داخلہ)

کلینا۔ نہیں میری بہادر بچی! اس تیرے قلعہ کے اندر داخل ہو کر ان کی سوئی ہوئی روح پھر سے بیدار ہو جائے گی۔

مہامایا۔ ماں تو نے کیا کہا (اٹھ کر کلینا کے گلے سے لپٹ جاتی ہے)

پھر کہو۔ ہاں! پھر کہو۔ ان کی سوئی ہوئی روح بیدار ہو جائے گی۔ میں اس ایک لمحہ کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوں۔ میں اپنا راج دے سکتی ہوں۔ میں اپنی زندگی دے سکتی ہوں۔ میں اپنی زندگی کو زندگی کی مسرتوں اور بہاروں سے خالی کر سکتی ہوں۔ لیکن ان کی روح بیدار ہو جائے۔ وہ پھر وہی، ویسے ہی بہادر سرفروش بن جائیں میں اور کچھ نہیں چاہتی۔

کلپنا۔ تم مجھ پر اعتبار کرو۔ میں اس کی آنکھیں کھول دوں گی۔ چپ چاپ دیکھتی چلو۔

مہاماپا۔ میں آپ کے حکم پر مرنے مارنے کو بھی تیار ہوں۔

کلپنا۔ (یکایک گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے) تم نے دوا کی تیسری خوراک پی۔

مہاماپا۔ (سر جھکا کر) ابھی نہیں۔

کلپنا۔ مالتی! دوا دو۔ یہ بیوقوف اپنے آپ کو ہلاک کرنے پر تلی ہوئی ہے۔

(دوا پلا دیتی ہے)

اب جسونت سنگھ آ رہا ہے۔ اس سے گستاخی نہ کرنا۔ زخمی ہے۔ تھکا ہوا ہے، کئی راتوں کا جاگا ہوا ہے۔ شکست کھا کر آیا ہے۔ غصہ میں ہوگا دروازہ پر پڑا رہا ہے، نادم ہوگا! تمہاری سخت کلامی سے اور بھی بگڑ جائے گا۔ تمہاری زبان کے دو میٹھے لفظوں سے اس کی ساری تکلیف رفع ہو جائے گی۔

مہاماپا۔ (بے بسی سے) ہاں! مجھے ذبح کر دو۔ لیکن یہ نہ کہو۔ مجھ سے

یہ نہ ہوگا۔ میرے سینہ میں نفرت کی آگ جل رہی ہے۔

کلینا۔ آج شام کو وہ لڑنے کے لئے پھر چلا جائے گا۔ (مہامایا کے سر پہ ہاتھ پھیر کر شفقت سے) وہ بہادر ہے۔ یہ غفلت کا جذبہ اس پر زیادہ دیر طاری نہیں رہ سکتا۔

مہامایا۔ (پُر امید لہجہ میں) آج شام کو پھر لڑنے کیلئے چلے جائیں گے یہ کون کہتا ہے؟

کلینا۔ میں!

مہامایا۔ ماں! تم ان لفظوں کے معنی جانتی ہو؟

کلینا۔ میں نے آج تک کبھی جھوٹ نہیں بولا۔

مہامایا۔ (ہاتھ باندھ کر) میری تقصیر معاف ہو! میرا یہ مطلب کبھی نہ تھا۔

کلینا۔ چلو لڑکیو! یہ کمرہ خالی کر دو (سہیلیوں کا چلے جانا) بیٹی! وہ آرہا ہے۔ اس سے عزت کے ساتھ پیش آنا۔ اور کہنا۔ میرے رسوئی گھر میں چلئے۔ میرا جی چاہتا ہے۔ میں آپ کے لئے اپنے ہاتھ سے حلوا بناؤں اور اپنے سامنے بٹھا کر کھلاؤں۔

مہامایا۔ میں حلوا بنا کر کھلاؤں گی! نہیں مجھ سے یہ نہ ہوگا۔ ماں!

کلینا۔ یہ اس کی پست ہمتی کا بہترین علاج ہے۔

مہامایا۔ حلوا؟

کلینا۔ یہ حلوا اس کے حلق سے نیچے اترے گا۔ وہ صرف اسے دیکھے گا۔ اور گھوڑے پر چڑھ کر قلعہ سے باہر نکل جائے گا۔ میں اس گمراہ بچے کو پھر سے سچا راجپوت بنانا چاہتی ہوں۔

مہامایا۔ پھر اس حلوے کا کیا بنے گا؟

کلپنا۔ سوئے ہوئے شیر کے جاگنے کی خوشی میں قلعہ کی عورتوں میں بانٹا جائیگا۔

(ہنس کر چلی جاتی ہے)

کلپنا۔ بھگوان! ان کی بزدلی دُور کر دے، ورنہ میرا زندہ رہنا ناممکن ہو جائے گا۔

(مہارانہ جسونت سنگھ آہستہ آہستہ داخل ہوتے ہیں۔ ان کے سر اور بازوؤں پر پٹیاں بندھی ہیں۔ چہرے کا رنگ زرد ہے۔ آنکھوں میں ندامت ہے، مہارانا اور مہامایا دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ اور کچھ دیر چپ چاپ کھڑے رہتے ہیں۔ اس کے بعد مہارانا چارپائی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ مہامایا دھیرے دھیرے پاس آجاتی ہے)

جسونت سنگھ۔ (بھرائی آواز میں، مہامایا! یہ شکست ساری عمر نہ بھولے گی۔

مہامایا۔ (طنزیہ لہجہ میں) خیر! کوئی مضائقہ نہیں۔ جان بچ گئی، یہی غنیمت ہے۔ اپنی جان کو بچا کر رکھنا راجپوت کا پہلا دھرم ہے۔

جسونت سنگھ۔ (سر جھکا کر) میں نے اپنی طرف سے پوری پوری کوشش کی، لیکن افسوس! میری کوئی پیش نہ گئی۔

مہامایا۔ ٹھیک، بے بس آدمی کیا کر سکتا ہے؟

جسونت سنگھ۔ (مہامایا کی بات کو نہ سمجھ کر، قدرے جرأت سے) آدمی قسمت کے ہاتھ کا کھلونا ہے۔ وہ اسے جس طرف چاہتی ہے اٹھا کر پھینک دیتی ہے۔

مہامایا۔ آدمی کی اس سے اچھی تعریف میں نے آج تک نہیں سُنی۔ کہئے! اب زخموں کا کیا حال ہے +

جسونت سنگھ۔ اِس سے تمہیں کیا۔ تم نے تو اپنی طرف سے میری توہین کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی +

مہامایا۔ آپ نے غلطی کی۔ آپ کو آگے نہ بڑھنا چاہیئے تھا لڑنے کے لئے فوج ہوتی ہے۔ مہارانا کو سب سے پیچھے رہنا چاہیئے۔ اُس کا جان جوکھوں میں پڑنا انتہا درجہ کی حماقت ہے۔ جان ہے تو جہان ہے +

جسونت سنگھ۔ (مہامایا کی طرف چُبھتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ کر) معلوم ہوتا ہے، تم میرا مذاق اُڑا رہی ہو +

مہامایا۔ رام رام! مجھ میں یہ جُرأت کہاں؟ کہ آپ جیسے بہادر کا مذاق اُڑا سکوں!

جسونت سنگھ۔ (غصہ سے) تمہیں معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ مَیں تمہارا شوہر ہوں۔ اور مہارانا ہُوں +

مہامایا۔ (تلملا کر) اور آپ کو بھی معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ مَیں راجپوت باپ کی بیٹی ہوں۔ اور مجھے ذلّت کی زندگی سے نفرت ہے +

جسونت سنگھ۔ تو کیا تم چاہتی ہو کہ مَیں وہاں مر جاتا؟

مہامایا۔ یہ میرے لئے اور میرے خاندان کے لئے فخر کی بات ہوتی!

جسونت سنگھ۔ مجھے یہ خیال نہ تھا، تمہیں فتح اتنی پیاری ہے +
مہامایا۔ فتح نہیں آن پیاری ہے۔ میں آن کے سامنے دُنیا بھر کی حقیقت نہیں سمجھتی +
جسونت سنگھ۔ گھر میں بیٹھی باتیں کر رہی ہو۔ جنگ میں ایک مرتبہ چلی جاؤ تو ہوش و حواس درست ہو جائیں +
مہامایا۔ پہلے مرد چوڑیاں پہن لیں، پھر عورتیں اگر گھروں میں رہ جائیں تو ناک کٹوا دوں

(یکایک کلینا کا داخلہ)

کلینا۔ (مہامایا کو آنکھ سے اشارہ کر کے) کیوں بیٹی! آتے ہی لڑائی شروع کر دی۔ تمہیں ابھی تک عقل نہیں آئی۔ اُٹھ! رسوئی گھر میں چل کر اپنے ہاتھ سے حلوا بنا۔ میرا بیٹا جنگ سے صحیح سلامت لوٹا ہے۔ آج میں بہت خوش ہوں +
جسونت سنگھ۔ ماں! تم نے سُنا، یہ عورت ابھی ابھی کیا کہہ رہی تھی؛ جی چاہتا ہے ———
کلینا۔ بیٹا! غصہ تھوک دے، یہ تو پگلی ہے۔ چل۔ چل کر رسوئی گھر میں بیٹھ!
جسونت سنگھ۔ نہیں ماں! میں وہاں اس کے ساتھ کبھی نہ جاؤں گا۔ اُف! کس قدر سنگ دل عورت ہے۔ کہتی ہے ———
مہامایا۔ (تڑپ کر) کیا کہتی ہوں؟

کلبنا۔ (قطع کلام کرکے) چُپ میری بیٹی! مَیں آج کے دن تمہاری یہ لڑائی نہیں دیکھ سکتی۔ اُٹھو! چلو۔ چل کر رسوئی گھر میں بیٹھو۔ لیکن خبردار کوئی لڑائی جھگڑے کی بات نہ کرے۔ آج کا دن خوشی کا دن ہے ؎

تیسرا منظر

اُسی محل میں باورچی خانہ

وقت دوپہر

مہامایا اپنے ہاتھ سے حلوا بنا رہی ہے۔ مہاراجہ جسونت سنگھ سامنے بیٹھے کسی گہرے خیال میں غرق ہیں۔ مہامایا اُن کی طرف دیکھتی ہے اور اُس کی آنکھوں سے شرارے نکلتے نظر آتے ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے دل میں ہلچل مچی ہوئی ہے ؎

مہاراجہ۔ زخمیوں کی مرہم پٹی ہو رہی ہے؟

مہامایا۔ (رُکھائی سے) ہو رہی ہوگی۔ مَیں نے حکم دیدیا ہے ؎

مہاراجہ۔ (تھوڑی دیر چُپ رہنے کے بعد) دیکھتا ہوں۔ تمہارا غصہ ابھی تک نہیں اُترا ؎

مہامایا۔ (گُندھے ہوئے آٹے میں چینی ڈالتے ہوئے) اُترے یا نہ اُترے، اِس کی آپ کو کیا پروا ہے؟

مہارانا۔ (ہنس کر) تمہارے غصّہ کی مجھے پروا نہیں تو اور کسے پرواہ ہے؟ میں نے اپنی غیر حاضری میں قلعہ کا تمام بندوبست تمہارے سپرد کیا تھا۔ تم نے حکم دیا۔ ہم پر دروازے بند کر دیئے گئے۔ یہ میری انتہا درجہ کی توہین ہے۔ لیکن مَیں نے تم سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ کیونکہ میں تمہاری نیک نیّتی کا قائل ہوں۔ کیا تم پھر بھی کہہ سکتی ہو کہ مجھے تمہاری پروا نہیں (پھر ہنس کر) چلو اب جانے دو۔ جو کچھ ہو گیا، ہو گیا۔ اور یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کے لئے......

مہامایا۔ (کڑھائی پر کڑچھا مارتے ہوئے) آپ کے خیال میں یہ معمولی بات ہو گی۔ میرے خیال میں اِس سے بُرا دن میری ساری زندگی میں نہ ہو گا۔

مہارانا۔ (قدرے تیز ہو کر) تو آخر تُم کیا چاہتی تھیں؟ مَیں مر جاتا تو تُم خوش ہو جاتیں۔

مہامایا۔ (تُرکی بہ تُرکی جواب دیتے ہوئے) بُزدلوں کے لئے مرنا سب سے مشکل کام ہے۔ وہ مَوت کو دیکھ کر دُور ہی سے بھاگ نکلتے ہیں۔

(چُولہے میں لکڑی جھونکتی ہے)

مہارانا۔ مہامایا! تُمہارا ایک ایک لفظ زہر میں بُجھا ہُوا تیر ہے۔

مہامایا۔ شکست کھا کر بھاگ آئے ہوئے لوگوں کو میٹھے الفاظ سُننے کا کوئی حق حاصل نہیں۔

(پھر حلوا بنانے میں مصروف ہو جاتی ہے)

مہارانا۔ مہامایا! مہامایا!!

مہامایا۔ (تولیہ سے کڑاہی کے دونوں سرے پکڑ کر) میٹھے لفظ نہیں ہیں، تو کیا ہُوا۔ میٹھا حلوا تو ہے۔ یہ آپ کی شکست کا انعام ہے پیٹ بھر کر کھائیے (کڑاہی نیچے اُتار لیتی ہے اور شوہر کے مُنہ کی طرف دیکھتی ہے) ایک وہ دن تھا۔ جب میدانِ جنگ سے بھاگا ہُوا راجپوت کسی کو مُنہ نہ دکھا سکتا تھا۔ آج زمانہ کس قدر تبدیل ہو گیا ہے۔ ماں خوش ہوتی ہے۔ بیوی حلوا بناتی ہے۔ اور بھاگا ہُوا شوہر رسوئی میں بیٹھ کر بیوی سے محبّت کی میٹھی میٹھی باتیں سُننا چاہتا ہے۔ وہ یہ بات بھی بھُول گیا ہے کہ جنگ کے موقعہ پر محبّت کی باتیں کرنا قوم وُ ملک کا سب سے بڑا گُناہ ہے ÷

(کڑچھا لینے کے لئے اِدھر اُدھر دیکھتی ہے)

مہارانا۔ مَیں چاہتا ہوں تم مرد ہوتیں ÷

مہامایا۔ مَیں چاہتی ہوں، آپ عورت ہوتے ÷

(کڑاہے میں زور زور سے کڑچھا مارتی ہے۔ اس سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ یہ آواز سُن کر کلینا گھبرائے ہوئے داخل ہوئی ہے)

کلینا۔ (گھبراہٹ سے) مہامایا! یہ کاہے کی آواز ہے۔ یہ تم کیا کر رہی ہو؟

مہامایا۔ (حیرت سے) کڑاہے میں کڑچھا پھیر رہی ہوں ÷

کلپنا۔ اری بیٹی! کڑچھا باہر نکال لے۔ ورنہ غضب ہو جائے گا +
مہا مایا۔ (اور بھی حیران ہو کر) ماں! اس سے کیا غضب ہو جائیگا۔ میں تجھ نہیں سمجھتی +

(تھال میں حلوا ڈالتی ہے)

کلپنا۔ (طنز سے) کاہے کو سمجھو گی؟ جیسے تم ابھی بالکل بچی ہو؟ جیسے کچھ جانتی ہی نہیں؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ لوہے سے لوہا بجتا دیکھ کر میرا بیٹا میری گود میں چھپنے کے لئے یہاں بھاگ کر آیا ہے۔ کیا تم اُسے یہاں سے بھی بھگانا چاہتی ہو؟ بیٹی! اب وہ کہاں جائیگا؟ یہاں سے بھاگ کر اُسے پناہ کی جگہ کہاں ملے گی؟ ——
پرماتما کے لئے یہ لوہے کا کڑچھا باہر پھینک دو۔ کہیں ایسا نہ ہو۔ وہ پھر لوہے کی کڑاہی سے ٹکرا جائے اور میرا بیٹا ڈر کر یہاں سے بھی بھاگ نکلے۔ پھر میں کیا کروں گی؟

(مہا مایا کا چہرہ چمکنے لگتا ہے۔ لیکن وہ ضبط کرتی ہے اور حلوے کا تھال مہارانا کے سامنے رکھ دیتی ہے۔ مہارانا کچھ دیر چُپ رہتے ہیں۔ اس کے بعد تھال کو پرے سرکا دیتے ہیں اور جوش سے تن کر کھڑے ہو جاتے ہیں) +

مہارانا۔ بس کر ماں! بس کر! تُو نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ تُو نے مجھے جگا دیا ہے، تُو نے مجھے تاریکی سے نکال کر روشنی اور عزّت کے رستہ سے نکال کر زندگی کی شاہراہ پر ڈال دیا ہے۔

کتنے شرم اور افسوس کی بات ہے، کہ راجپوت کا بچہ شکست کھاکر بھاگ آئے۔ پرماتما جانے مجھے کیا ہو گیا تھا؟ مجھے وہیں کٹ جانا چاہیئے تھا۔ لیکن ———

(مہامایا مسرت آمیز استعجاب سے شوہر کی طرف دیکھتی ہے)

شکر ہے، تمہارا کہا سنا ضائع نہیں گیا۔ میں تم سے اپنی بزدلی کے لئے معافی مانگتا ہوں۔

کلینا۔ بیٹا! اب تو پھر وہی بہادر، سورما، بے خوف جسونت سنگھ ہے، جس نے میرا دودھ پیا ہے۔ جس نے میرے خاندان کا نام روشن کرنے کا عہد کیا ہے۔ جس کے چہرے کی طرف دیکھ کر میری سوکھی ہوئی امیدیں ہری ہو جاتی ہیں۔ مہامایا! خوش ہو، تیرا سوامی اپنی بزدلی کے دھبے کو دھونے کے لئے کھڑا ہو گیا ہے۔

مہامایا۔ (شکرگزار نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر) یہ سب آپ ہی کی مہربانی ہے۔

مہارانا۔ ماں! مجھے تم پر بھی فخر ہے۔ مجھے اس پر بھی فخر ہے۔ تم دونوں نے مل کر میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ ہماری آنے والی نسلیں یہ سن کر خوشی سے پاگل ہو جائیں گی، کہ ایک راجپوت شکست کھا کر گھر آیا، تو اس کی بیوی نے اس پر اپنے قلعے کے دروازے بند کر دیئے۔ بہادری اور غیرت کی ایسی نادر اور روشن خیال چشم فلک نے کم دیکھی ہو گی۔ اس سے ہندوستان کو اپنا سر اونچا کرنے کا

موقعہ ملے گا۔ یہ میری خوش قسمتی ہے، کہ مجھے ایسی باغیرت بیوی ملی۔ جس کو میری عزّت میری محبّت سے بھی پیاری ہے ؞

مہامایا۔ (آہستہ سے سر جُھکا کر) ماں! ان سے کہو۔ میری سخت کلامی کے لئے مجھے معاف کر دیں۔ مجھ سے یہ بڑا قصور ہُوا ہے ؞

مہارانا۔ نہیں، یہ تیرا قصور ہمارے خاندان کا سب سے بڑا خزانہ ہے۔ (ماں سے متوجّہ ہو کر) لیکن ماں! مَیں راجپوت ہوں۔ اور راجپوت کا بیٹا اِس قدر بے غیرت کبھی نہیں ہُوا۔ مجھے بتا! میری اِس بُزدلی کا سبب کیا ہے؟

کلینا۔ یہ تیرا نہیں میرا قصور ہے (دونوں چونک پڑتے ہیں) کلینا آہستہ آہستہ کہتی ہے۔ جیسے کوئی بھُولا ہُوا واقعہ یاد کر رہی ہے) یہ اُس زمانہ کا ذکر ہے جب تیری عُمر صرف دو سال کی تھی۔ ایک دن مَیں اپنے ہاتھ سے کھانا تیار کر رہی تھی۔ اور تیرے پتا جی اسی رسوئی گھر میں اسی جگہ بیٹھے کھا رہے تھے۔ یکایک تُو رو رو کر دودھ کے لئے مچلنے لگا۔ میں نے سوچا۔ اِس وقت میرا جسم گرم ہے۔ اگر تُو نے دُودھ پیا، تو بیمار ہو جائے گا۔ اِس لئے میں نے داسی سے کہا۔ اسے باہر لے جا، اور چُپ کرا۔ لیکن تُو اِسی طرح روتا رہا ؞

(مہامایا شوہر کی طرف دیکھ کر پُرمعنی انداز سے مُسکراتی ہے)

مہارانا۔ پھر؟

کلینا۔ داسی نے تجھے اپنا دُودھ پلا دیا تو تُو چُپ ہو گیا۔ آدھ گھنٹے بعد یہ

بات مجھے معلوم ہوئی۔ تو مَیں نے تیرے حلق میں اُنگلی ڈال کر تجھے قے کرا دی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ دُودھ کی ایک دو بُوندیں پھر بھی تیرے پیٹ میں رہ گئیں۔ غلام عورت کے دُودھ کی وہ بُوندیں آج اِس بُزدلی کی شکل میں ظاہر ہوئی ہیں۔ یہ تیرا قصور نہیں، اسی دُودھ کا فتور ہے"

مہارانا۔ خیر! جو کچھ بھی ہو۔ مَیں اپنی بُزدلی کے داغ کو اپنے خُون سے بھی دھونے کو تیار ہوں۔ اب تم کو یہ شکایت نہ رہے گی۔ کوئی ہے۔ میری تلوار اور زرہ بکتر لاؤ۔ اور سپاہیوں سے کہو۔ تیار ہو جاؤ"

کلینا۔ پرماتما کرے! میرا بیٹا فتح کے ڈنکے بجاتا ہُوا واپس آئے

(روانگی)

مہامایا آہستہ آہستہ آ کر مہارانا کے پاس کھڑی ہو جاتی ہے۔ پھر سر اُٹھا کر ان کی طرف دیکھتی ہے، پھر مُسکراتی ہے اور پھر اپنی باہیں ان کے گلے میں ڈال دیتی ہے؛

مہامایا۔ آپ نے میرا قصور معاف کیا؟

مہارانا۔ (مہامایا کو گلے سے لپٹا کر) تیرا قصور میری زندگی کا سب سے دلخوش کُن واقعہ ہے

مہامایا۔ اب آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں؟

مہارانا۔ تجھ سے ناراض ہو کر مَیں ثابت کر دوں گا۔ کہ مجھ سے بڑا احمق میری ریاست میں کوئی نہیں، ہے تو عورت نہیں، ہیرا ہے۔ میری

نگاہوں میں تو اِس قدر بلند، پاکیزہ، پہلے کبھی نہ تھی (تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد) اچھّا اب اجازت دو۔ سپاہی تیار ہو رہے ہوں گے۔

مہامایا۔ اتنی جلدی؟ کیا آپ کل نہیں جا سکتے۔ ایک دن آرام کر لیجئے (مہارانا کی طرف محبت سے دیکھتی ہے اور اپنا سر اُن کے کندھے پر رکھ دیتی ہے)

مہارانا۔ (مُسکرا کر) جنگ کے موقعہ پر محبّت کی باتیں کرنا قوم و مُلک کا سب سے بڑا گُناہ ہے۔

مہامایا۔ (اپنے الفاظ سُن کر چونک اُٹھتی ہے) خیر! لیکن یہ حلوا تو کھا لیجئے (شرما کر) آپ کی پیاری مہامایا نے آپ کے لئے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔

مہارانا۔ (پھر مہامایا کے الفاظ دوہراتے ہیں) کیا یہ میری شکست کا انعام ہے (مُسکراتے ہیں) مَیں کیسا خوش نصیب ہوں کہ شکست کھا کر بھی ایسی میٹھی چیزیں میسر ہیں (یکایک گفتگو کا رُخ بدل کر) مہامایا! تم نے میری آنکھیں کھولی ہیں۔ تم نے مجھے سیدھا رستہ دکھایا ہے۔ تم نے مجھے بھُولا ہُوا فرض یاد دلایا ہے اب میرے سامنے اپنی محبّت اور دلفریب مُسکراہٹ لے کر کیوں کھڑی ہو گئی ہو؟ اگر اب مجھ میں پھر کمزوری آئی۔ تو یہ میرا نہیں تمہارا یا اُس دائی کے دودھ کا قصور ہو گا۔ تو اجازت ہے؟

مہامایا۔ ہاں پران ناتھ! جائیے۔ اور فتح کے ڈنکے بجاتے ہوئے

آئیے۔ وہاں موت کے میدان میں میری محبت آپ کی حفاظت کرے گی۔

مہارانا۔ پرماتما کرے میں اپنے آپ کو تمہارے جیسی بیوی کے قابل بنا سکوں۔ (تیزی سے روانگی)

مہامایا۔ (پُرامید ہوکر) چلے گئے! میں نے کچھ کے دے دے کر اُن کو پھر بھیج دیا۔ (آسمان کی طرف آنکھیں اُٹھا کر) پرماتما! اُن کی حفاظت کر۔ جس طرح خوش خوش گئے ہیں۔ اُسی طرح خوش خوش واپس آئیں

کلینا۔ (داخل ہو کر) مہامایا! کیا کر رہی ہے؟ (دیکھ کر) پگلی اب اُداس ہو گئی۔ نہیں یہ اُداسی تجھے زیب نہیں دیتی بیٹی! تیرا سوامی سچا راجپوت ہے۔ چل یہ حلوا سپاہیوں کے گھروں میں بانٹ آئیں۔ آج میرا سویا ہوا بیٹا جاگا ہے۔

زہریلا آبحیات

بلاشبہ اچھوتی شے ہے۔ پلاٹ تواریخی، خیالات شاعرانہ، عبارت سادہ۔ ملکی عظمت کا سکہ بٹھانے کے لئے یہ ایک بے نظیر کتاب ہے۔ جب تک یہ ناول رہے گا۔ تب تک بنکم بابو کا نام ہی نہیں۔ بلکہ بنگال کی عظمت لوگوں کے دلوں میں رہے گی۔ اور مجھے شک ہوتا ہے کہ جس قوم میں ایسے ناول لکھے جا سکتے ہیں۔ وہ کبھی صفحہ ہستی سے ہٹ بھی سکتی ہے؟ یہ ناول محض ناول ہی نہیں ہے۔ بلکہ اخلاقی، قومی اور ملکی اسباق کی ایک بیش قیمت چیز ہے۔ جس کا ایک ایک موتی اس قابل ہے۔ کہ اسے دل و جان فروخت کر کے بھی حاصل کیا جائے۔ مجلد مزین ڈسٹ کور قیمت دو روپے۔

اہل قلم بابو رمیش چندر وت

اس مصنف کی دیگر تصانیف :-

راج سنگھ دو روپے — خوش انجام آٹھ آنے

قدرت کے کھیل ڈیڑھ روپیہ — پارس ایک روپیہ چار آنے

لاجپت رائے اینڈ سنز پبلشرز۔ تاجران کتب

اردو بازار دہلی

(مطبوعہ فاروقی پریس دہلی)